مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے

(تاریخِ عالم کے درخشاں ترین باب سے چند حوالے)

Plz call me.

[redacted]

why are you
night footer

تالیف : مولوی نور احمد

ترجمہ و تحشیہ : رحمان مذنب

رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ، لاہور



کتاب : مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے

تالیف : مولوی نور احمد

ترجمہ وتحشیہ : رحمان مذنب

زیر اہتمام : رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ

۱۸۔غزالی سٹریٹ، مجاہد روڈ، اتحاد کالونی،

علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔۱۸ (پاکستان)

فون: ۷۵۷۰۹۷۲

ای میل۔rehmantrust@hotmail.com

سرورق : مقبول الحق

ترتیب وتزئین : میاں محمد عظیم

کمپوزنگ : رانا محمد ادریس

مطبع : نقوش پریس اردو بازار لاہور

باردوم : ۲۰۰۲ء

تعداد : گیارہ سو

قیمت : ۱۶۰ روپے

واحد تقسیم کار : نگارشات، میاں چیمبرز

۳۔ٹمپل روڈ لاہور

فون: 042-6305241.6362412 فیکس 042-6312968

ای میل۔nigarshat@yahoo.com

رحمان مذنب کے ان تمام قاریوں کے نام

جنہوں نے ان کو پڑھا

پڑھ رہے ہیں

اور

پڑھیں گے

مندرجات

حصہ اول ۔ اسلام اور سائنس

حصہ دوم ۔ اسلام اور مذہبی رواداری

حصہ سوم ۔ احیاء

ایک ایمان افروز تالیف



یہ نہایت دقیع، نہایت قابلِ قدر اور نہایت خیال انگیز کتاب بلاشبہ کئی سال کے وسیع دینی وتاریخی مطالعے اور طویل سوچ کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں بڑی جامعیت ہے۔ ابواب کی ترتیب وترکیب، مواد کی پیشکش اور تفصیل بے حد اثر انگیز ہے۔ مسلمانوں نے قرآنِ حکیم کی لاثانی تعلیمات، رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو مشعلِ راہ بنا کر اپنے عہدِ زرّیں میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے اور چند صدیوں میں دنیا کو تہذیب وتمدن کے جن چراغوں سے روشن کیا ان کی عکاسی بڑے صاف، سادہ اور غیر مبہم انداز سے کی گئی ہے۔ اس بات کی صراحت بہ طریقِ احسن موجود ہے کہ اسلام فی نفسہٖ ایسا جوہر رکھتا ہے جس کی خاصیت بڑھنا، پھیلنا اور اُبھرنا ہے۔ اسلام اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ جو لوگ اسے اپنائیں گے وہ بے پناہ ہو جائیں گے اور ہر بلندی، ہر وسعت اور ہر عظمت ان کی دسترس میں آئے گی۔ اسلام کا یہ معجزہ ہے اور اس بدترین عہدِ انتشار وافتراق میں بھی یہ معجزہ دکھایا اور دہرایا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے مسلمان اور صاحبِ ایمان ہونا شرط ہے۔ اسلام عالمگیر جذبۂ اخوت سے سرشار اور رنگ ونسل کے امتیاز سے بے نیاز کرتا، معاشرتی عدل کو شعور اور ہمہ گیر مساوات کی قدروں سے لیس کر کے طبقاتی تمیز اور اقتصادی ناہمواریاں مٹاتا، حقوق اللہ اور حقوق العباد سے آگاہ کر کے راستی کی سمت لے جاتا، فقر کی عادت پیدا کر کے نمائشی زندگی، دنیوی جاہ وحشمت اور شاہانہ شان وشوکت سے متنفر اور اسی کے ساتھ اسے بے باک اور نڈر کر دیتا ہے ——— پھر بے مثال کامیابیاں اس کا مقسوم بن جاتی ہیں۔ انھی اوصاف کی بدولت مسلمان آندھی بن کر تمام دنیا کو

بڑی بے تکلفی سے روند گئے اور انھی کو ترک کر کے دنیا کے ہاتھوں بڑی آسانی سے روندے گئے۔ اپنی ہی خوبیاں اور اپنی ہی خرابیاں ان کی قسمتیں ادلتی بدلتی رہیں۔ اسلام کے سوا کوئی مذہب روح وجاں، قلب ونظر اور ہر پہلو زندگی کی کامل تسکین کا سامان نہیں رکھتا۔ اسلام روشن خیالوں کا مذہب ہے، روحانی اور مادی تقاضے بیک وقت پورا کرنے والا مذہب ہے، رفیع الشان تہذیبی قدر ہے۔ یہ بلند پایہ کتاب ان تمام امور کو نہایت عمدگی سے عیاں کرتی ہے۔ وہ لوگ جو اسلام کو قدامت پرستوں کی میراث سمجھتے ہیں اس کتاب کو پڑھ کر اپنے خیالات میں ترمیم واصلاح کریں گے۔

فاضل مُصنِّف نے اپنی اس تصنیف میں تہذیبی اور مُعاشرتی جہت سے اِسلام کے اس تاریخی کردار کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جس سے عرب کے پراگندہ قبائل بے نظیر قیادت میسّر آنے پر دیکھتے دیکھتے کُرہ ارض کی سب سے بڑی طاقت بن گئے اور ان کی عقل ودانش تمام دُنیا کی تہذیب وتزئین اور فلاح وبہبود پر مامور ہوئی۔ اس سے تنہا عربوں اور اُن کے مملوکہ خطوں ہی کو فائدہ نہیں پہنچا بلکہ یورپ میں صدیوں کے تاریک گوشے بھی مُنور ہوئے۔

آج یورپ نے عِلمی وفنی میدان میں جو ترقی کی ہے وہ اُندلس کی اِسلامی درسگاہوں کا فیض ہے۔ جب یورپ میں اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا تب اسی یورپ کے ایک گوشے اُندلس میں مُسلمانوں نے علم وفن کے آفتاب روشن کر رکھے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ اہلِ مغرب نے بالعموم (بہ استثنائے چند) ہمارے جید علماء، بے مثال سائنسدانوں اور مفکروں کے عہد آفریں کارناموں پر پردے ڈالے، انھی کی بلا تامل خوشہ چینی کی کہ اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا لیکن پھر انھی کی ایجادات، اختراعات اور فتوحات پر اپنے نام کی چھاپ لگا دی۔ آج عام طور پر یہی سمجھا اور مانا جاتا ہے کہ ہر سوچ کا سرچشمہ یورپ ہے، ہر نئے خیال کا خالق مغرب کا سفید انسان ہے، ترقی وخوشحالی صرف مغرب کے لیے مُقدّر ہوئی ہے ــــــ مسلمانوں کا کہیں ذکر ہی نہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان موجدین ومفکرین کو گمنام کرنے کی مسلسل کوششوں اور منصوبہ بندیوں کے باوجود علوم وفنون کی کئی شاخوں کے عربی نام اور کئی سائنسی اسلامی اصطلاحات پھر بھی باقی رہ گئیں۔ ''الگورزم'' دراصل الخوارزمی کی عطاء کی ہوئی حساب کی ایک نئی شاخ ہے۔ اکائی سے دہائی یعنی دائیں سے بائیں ہندسے لکھنے کا عربی

طریقہ من وعن انگریزی میں بھی رائج ہے۔[1] ''الجبرا'' کا لفظ اپنے عربی الاصل ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ ابھی دو تین صدی پہلے بو علی سینا کی طبی انجیل (القانون) اور دوسرے مسلمان علماء کی کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں میں نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی تھیں اور پھر اہل مغرب کے سیاح جس بے قراری اور جذبۂ شوق سے قرطبہ، غرناطہ اور طلیطلہ جاتے ہیں وہاں اندلسی مسلمانوں کے تاریخی آثار کے سوا اور رکھا کیا ہے؟ یہیں کی بے نظیر درسگاہوں اور کئی کئی لاکھ نسخوں سے لبریز کتب خانوں سے انھوں نے فیض پایا اور اپنی برگشتہ تقدیر بدلی۔

شکر ہے کہ گنتی کے چند کم متعصب اور غیر متعصب مستشرقین کی کاوشوں کے طفیل مسلمان علماء و حکماء کے تالیفی دفینوں، تخلیقی کارناموں اور گم شدہ خزانوں کا سراغ ملا اور اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا کہ یورپ کی تحریک احیائے علوم و فنون اور مغرب کی تمام ترقی مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے۔ مسلمانوں ہی نے تہذیبی سلسلہ ارتقاء میں نہایت اہم کڑیاں جوڑیں، انھی کی علمی و فنی فتوحات نے تاریخ کے دھارے موڑے، انھی نے مردہ پرستوں، قدامت پسندوں، اوہام زدوں اور خوف کے ماروں کو صدیوں کے گھمبیر اندھیروں سے نکالا، اندھی راہیں روشن کیں اور جب اوٹ میں ہوئے تو اپنے چراغ اہل یورپ کو تھما گئے ——— یہ ایک درخشاں تاریخی حقیقت ہے اور کسی کو انکار کی مجال نہیں۔

یہ کتاب ایمان افروز ہے اور اس قابل ہے کہ علمائے کرام، مبلّغین اسلام اور خطیبانِ عظام اسے اپنے نجی کتب خانے میں جگہ دیں اور شرفِ مطالعہ بخشیں۔ اس میں جگہ جگہ غیر مسلم مؤرخوں، محققوں اور اسکالروں کے خیالات نقل کیے گئے ہیں۔ یہ سب فاضل حضرات اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ اسلام سب سے زیادہ جامع قابلِ عمل اور موثر مسلکِ زندگی ہے۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہی اسلام جسے ہم بے جان اور ناکارہ سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں کس قدر جاندار، عظیم اور مرعوب کن ہے اور دنیائے مغرب اس کے امکانی اثرات اور مضمرات سے کس قدر خوف زدہ ہے۔ وہ سیاسی، اقتصادی اور سائنسی حربوں سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے

---

[1] اگرچہ انگریزی رسم الخط بائیں سے دائیں طرف چلتا ہے لیکن ہندسوں کے معاملے میں اسے اپنی روش بدلنی پڑی۔ عربی ہندسے اس ترتیب سے لکھے جاتے ہیں کہ نقطۂ آغاز دائیں طرف رہتا ہے۔ پہلے صفر یا اکائی لکھتے ہیں، پھر دہائی، سینکڑہ، ہزار، دس ہزار، لاکھ وغیرہ لکھتے ہیں۔

لیے اپنی تمام توجہ، تمام قوت اور تمام صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ایک بار بھی اگر مسلمان اسلام کے نام پر ایک ہوئے، اسلامی برادری میں عالمگیر اتحاد و رابطہ پیدا ہوا، مسلمانوں نے اسلامی اخوت اور مساوات کے نام پر اپنے سارے تفرقے مٹا دیے تو یہ پھر ماضی کی طرح بے پناہ ہو جائیں گے اور مستقبل کی قیادت سنبھال لیں گے جو اس وقت سخت پراگندگی، اخلاقی انتشار، جنسی بے راہروی اور ایٹمی ہلاکت سے دوچار ہے۔ اہل مغرب ایشیا اور افریقہ کے رنگدار انسانوں کو راحت اور سکون نہیں دے سکے۔ یہی نہیں بلکہ انھیں خود بھی چین نصیب نہیں۔

اسلام نام ہے اتحاد اور عالمگیر اخوت کا۔[1] مسلمان کہیں بھی ہوں۔ سائبیریا کے بعید ترین علاقے میں بستے ہوں، افریقہ کے قلب میں، انڈونیشیا میں یا پھر امریکہ اور یورپ میں چھوٹے چھوٹے الگ تھلگ گروہوں کی صورت میں آباد ہوں، ایک بے مثال برادری کے یکساں طور پر مساوی حیثیت کے ارکان ہیں۔ درمیان میں جغرافیائی تقسیم حائل ہے نہ فاصلہ۔ ذات پات اور رنگ بھی حائل نہیں۔ اسلام ان تمام قومی، جغرافیائی، نسلی اور معاشرتی امتیازات سے بالاتر ہے جو آج بھی دنیا کے دوسرے بڑے بڑے مذہبی نظاموں کی شکل وصورت مسخ کر رہے ہیں۔ اسلام تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ملانے کی سعی کرتا ہے۔

قرآنِ مقدس اور عربی زبان کے مطالعے کے ساتھ ساتھ دینِ متین اسلامی اتحاد کا بڑا سرچشمہ ہے۔ تیرہ سو سال تک قرآن مقدس کے مطالعے نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو انکے مذہبی اعتقاد سے مربوط و متحد کر رکھا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک بار ارشاد فرمایا تھا ــــــ "پوری دنیا ایک مسجد ہے۔"

بہر حال اسلام صرف مذہبی اتحاد کا تصور ہی پیش نہیں کرتا۔ مذہبی ضابطے کے علاوہ اسلام تمام مسلمانوں کو خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں ایک معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی ضابطہ بھی دیتا ہے۔ یہ دینِ کامل ہے جو نہ صرف مومنین کے روحانی رویے میں نظم وضبط قائم کرتا ہے بلکہ روزمرہ کی عملی زندگی پر ہر پہلو حاوی ہے۔ زندگی کے ان تمام عملی اور اخلاقی کوائف پر توجہ دینے سے مذہبی

---

[1] اسلام کے معنی اطاعت اور تسلیم ورضا ہے۔ اس کا مادہ مسلم ہے جس کا مطلب امن وسلامتی ہے۔ اسلام احکام الٰہی کی تعلیم دیتا، ان پر اور رسالت مآبؐ کی سنت پر چلنے کی ہدایت کرتا ہے۔ نام سے اسکی ہمہ گیر اور ازلی وابدی حیثیت ظاہر ہوتی ہے۔ بدھ مت، ہندو دھرم، زرتشتی مذہب یا عیسائیت کی طرح یہ نام، کسی شخص کے نام پر نہیں رکھا گیا۔

عقیدے کے تراشے ہوئے رشتوں کو بڑی تقویت ملتی ہے۔ جرمن فلسفی آنجہانی کیسرلنگ نے اپنی تالیف TRAVEL DIARY OF A PHILOSOPHER (مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء) میں جو سوال اٹھایا ہے اس کا یہ جواب ہے۔ وہ لکھتا ہے ——

''میں نے جس مسلمان سے پوچھا کہ وہ کون ہے، اس نے یہی جواب دیا کہ وہ مسلمان ہے۔ کیا بات ہے کہ تمام مذاہب میں سے تنہا اس مذہب (اسلام) نے یہ جانا کہ ایک وسیع تر چیز کو قومی احساس کی جگہ دی جائے —— ایک ایسی چیز کو جو قوی تر بھی ہے اور زیادہ معنی خیز بھی۔ ایسا کیونکر ہے کہ اسلام کسی اہم آہنگ اعتقاد کے بغیر اخوت کی مثالی قدریں پالیتا ہے لیکن عیسائیت اپنے مثالی معتقدات کے باوصف ناکام رہتی ہے؟''

کاؤنٹ کیسرلنگ وہیں اپنا جواب پاتا ہے جہاں اسلام کے تمام مغربی محققین پاتے ہیں۔ اسلام ایسا طریق کار پیش کرتا ہے جو فطرتِ انسانی کے عملی اور روحانی پہلوؤں کو مربوط کر دیتا ہے۔ کاؤنٹ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے، ''اس کا سبب ضرور وہ گہرے تعلقات ہیں جو آدمی کے خاص عقیدے اور اس کی فطرتِ اُولیٰ میں پائے جاتے ہیں۔''

مسلمان جو کچھ کرتا ہے اس کا تعلق براہِ راست اسلام سے ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ یہ کہ مسلمانوں نے ماضی میں جو کچھ حاصل کیا ہے اور مستقبل میں جو کچھ حاصل کریں گے وہ اسلام سے متعلق ہے۔ اس تالیف کا مقصد یہ ہے کہ اعتقاد، مقصد اور کامیابی میں جو باہم ربط پایا جاتا ہے اسے عیاں کیا جائے۔

قارئین کی سہولت کے پیشِ نظر فاضل مصنف نے اس تالیف کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پھر ہر حصے کو مزید کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ کسی اسلامی کارنامے کو بہ حیثیتِ مجموعی اسلامی کارنامے سے علاحدہ نہ سمجھنا چاہیے۔

پہلے حصے کے صفحات میں قارئین دیکھیں گے کہ عالمی شہرت کے مسلمان سائنسدانوں نیز غیر معروف مسلمان جلاہوں اور دھات کا کام کرنے والوں کی مہارت اور ہنرمندی کو خراج پیش کیا گیا ہے۔ پھر قارئین مسلمان بحری جہازرانوں کی دلیری اور فاتح مسلمان مجاہدوں کی بردباری کا حال پڑھیں گے۔ مسلمان ماہرین تعلیم کی عقل و دانش بتھر کران کے سامنے آئے گی۔

انھیں مسلمانوں کے اس مخیرانہ جذبے پر مسرت ہوگی جس کی بدولت چند ایسی عظیم ترین درسگاہیں معرضِ قیام میں آئیں دنیا کو جن کا علم ہے۔

دوسرے حصے میں عدل، اعلیٰ نظم و نسق، جمہوریت، بین الاقوامیت کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکلوں اور کل حقوقِ انسانی میں اسلامی رواداری کے جذبے نے جو کام کیا ہے قاری اس کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

ان حوالوں کا مطالعہ فی نفسہٖ دلچسپ ہے لیکن کتاب کی غایت تب پوری ہوگی جب اسلامی میراث کو از سرِ نو دریافت کر کے قاری اپنے تئیں ایک سوال کرے ——— "ان تمام شاندار فتوحات کو آج مجھ سے کیا سروکار ہے؟"

میں یقین رکھتا ہے کہ یہ کتاب اس سوال کا جواب پیش کرے گی۔ لاریب جو اصحاب پہلے دو حصے پڑھیں گے ان کے دل میں ایک ولولہ پیدا ہوگا، اسلام کے ایسے مستقبل کا حصہ بننے کی آرزو ہوگی جو اسلام کے ماضی سے کم شاندار نہ ہو۔ تیسرا حصہ مستقبل کے ان امکانات ہی سے واسطہ رکھتا ہے۔ اس حصے میں دیے ہوئے حوالے یہ عیاں کرتے ہیں کہ کس طور اسلام میں نئے سرے سے جنم پانے کی صلاحیت کارفرما رہتی ہے اور اسلامی برادری کے ایک ایک رکن میں دوبارہ ابھرنے کی قوت پائی جاتی ہے۔

نامور عالم پروفیسر بوس ورتھ اسمتھ کے الفاظ میں ——— "اسلام فی نفسہٖ لافانی قوت ہے۔" اور فلسفی ڈبلیو۔ ای۔ ہوکنگ کا کہنا ہے ——— "میں اس دعوے میں حق بجانب ہوں کہ اسلام اپنی ہیئت میں نشو و نما کے ضروری اصول رکھتا ہے۔"

پس اب اقوامِ اسلام کی پسماندگی کے بارے میں مزید گفتگو نہ ہونی چاہیے۔ اس کی بجائے ہم ایسے مستقبل کی سمت دیکھیں جس میں اسلام ایک بار پھر عظیم اور فعال عالمی قوت ہو۔

غیر مسلم علماء اور مورخین کے خیالات پڑھ کر اسلام کی حقانیت اور عظمت کے بارے میں ہمارے اعتقاد اور اعتماد کو بڑی تقویت ملتی ہے اور اس طرح ہم جو مغرب کی مصنوعی اور سکون شکن چمک دمک پر سو جان سے فریفتہ ہیں اپنے گھر کے چراغ کی تابنا کی کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں۔ اس تالیف کا مقصد مسلمانوں بالخصوص مغرب زدہ مسلمانوں کے دلوں کو جھنجوڑنا

اوران میں نئی تڑپ پیدا کرنا ہے۔ نوراحمد صاحب نے یہ کام بڑی ہنرمندی سے کیا ہے۔ انھوں نے نئی پود کی نبض پہچانی ہے جو اہلِ مشرق کی باتیں اہل مغرب کے حوالے سے تسلیم کرتے ہیں اور مسلمانوں کی دانش کو غیر مسلموں کی گواہی پر تسلیم کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمیں اپنے بزرگ دانشوروں تک براہِ راست رسائی نہیں۔ اس کے لیے ہم یورپ سے سیڑھی لگاتے ہیں۔

یہ ایک سادہ حقیقت ہے۔ اس سے انکار میں ہمارے سوا کسی کا نقصان نہیں۔ عملی زندگی کے حوالے سے بات کریں تو بلاشبہ معلوم ہوگا کہ آج بھی واقعی اسلام مکمل ترین مذہب ہے۔ اب تک انسان کو اس سے بہتر ضابطۂ حیات نہیں ملا۔ ہر دور میں معاشرے کے کام آنے والا اس سے بہتر ضابطۂ حیات کبھی مرتب ہوا نہ ایسا لاثانی شاہکار بروئے کار لانے کی کسی کو توفیق ارزاں ہوئی۔ ایسا مربوط و منظم اور جامع لائحہ عمل ناپید ہے۔ دنیا اپنے تمام تہذیبی کارناموں اور تجربے کے باوصف بالآخر اسی کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوگی۔

مولوی نوُراحمد نے بڑی ذمہ داری سے غیر مُسلم مُورخین کی تحریروں کے حوالوں سے دُنیائے اِسلام اور یورپ کا موازنہ کیا اور یہ ثابت کردیا کہ اِسلام فی نفسہٖ ایک ترقی پسند مذہب ہے۔ اِس میں فطری طور پر یہ صلاحیت موجود ہے کہ زوال کے بعد اپنے پیروکاروں کو اُبھرنے پر اکساتا ہے۔ اس کے دامن میں وہ چنگاری پنہاں ہے جو کبھی نہیں بجھتی اور جب بھی مُسلمان آمادۂ عمل ہوتے ہیں تو یہ چنگاری بھڑک کر سیلِ نوُر بن جاتی ہے۔

نوراحمد صاحب نے کارِخیر اور وقت کا تقاضا پورا کیا ہے۔ ان کی لاجواب کتاب کو اُردو میں منتقل کرکے میں بھی اس کارِخیر میں شریک ہوگیا ہوں۔

رحمان مذنب

جنوری ۱۹۷۱

پیش لفظ

اس تالیف کے دو مقاصد ہیں ——— اوّل اس بات کی سعی کی گئی ہے کہ آج کے مسلمانوں خصوصاً ان نوجوانوں کو ان کے عظیم اور شاندار تہذیبی ترکے کی یاد دلائی جائے جو عوام کی رہنمائی کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اسلام نے اب تک عالمی تہذیب، تعلیم، ثقافت اور سائنس کو جو دیا، نیز ان کی ترقی کے لیے جو کیا اس کا یہاں مختصر سا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں اپنے ترکے کی نسبت فخر کا نیا جذبہ بیدار ہو گا لیکن یہ جذبہ مجہول کیفیت یا اطمینان سے بیٹھ رہنے کا نہ ہو گا کیونکہ کوئی قوم اپنے ماضی میں زندگی نہیں گزار سکتی۔ زندہ رہنے کے لیے تو فعال عزم کے ساتھ نئی عظمت کی سمت پرواز کرنی پڑتی ہے۔ بدیں سبب اس تالیف کا دوسرا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اسلام نے ماضی میں جو کچھ کیا ہے دوبارہ کر سکتا ہے اور اسلام کے مستقبل میں قدم قدم پر ماضی کی شان و شوکت مخفی ہے۔

آج بہتیرے مسلمان حوصلہ ہارے ہوئے ہیں کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں برادرانِ اسلام کی اکثریت کا معیارِ زندگی بے حد پست ہے، ترقی کے مواقع بڑے محدود ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مغربی ملکوں کے مقابل اسلامی ملک ٹیکنالوجی میں کس قدر پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان مشاہدات سے ایک ہی جست میں وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلام بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتا، اپنے دامن میں نیا علم سمو نہیں سکتا اور اسی لیے اسلامی ملک پسماندہ ہیں۔ وہ تو یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ درحقیقت اسلام ترقی اور سائنس کی ترویج کا دشمن ہے۔

درآنحالیکہ یہ حقیقت سے بعید ہے اور کتاب میں دیے ہوئے حوالوں کو پڑھ کر ہر کوئی فوراً اس کا اندازہ کر لے گا۔ یہ حوالے جنھیں جمع کرنے میں راقم الحروف کو کئی سال لگے ہیں ان مصنفوں کی کتابوں سے لیے گئے ہیں جو مسلمان ہیں نہ اسلام کے حق میں کوئی جذبہ رکھتے ہیں لیکن جن کے فیصلوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ فیصلے عالمانہ ہیں اور حقیقت افروز بھی۔ یہ غیر مسلم اپنی تحریروں میں اس امر کا انکشاف کرتے ہیں کہ وہ ماضی کے شاندار اسلامی کارناموں سے بہ شدت آگاہ ہیں۔ اس سے بھی زیادہ انہیں اس بات پر یقین ہے کہ اسلامی ملک مستقبل میں اہم تر کردار ادا کرسکتے ہیں۔

یہاں جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ کئی سو کتابوں سے انتخاب کرنے کے بعد اکٹھا کیا گیا ہے اور موضوع کے اعتبار سے بڑا تنوع رکھتا ہے۔ کچھ مواد اعلیٰ پایے کے علمی جریدوں سے لیا گیا ہے، کچھ تاریخ کی کتابوں سے اور کچھ نفسیات کی تالیفات سے۔ ان عارضی مطبوعات سے بھی مواد اخذ کیا گیا ہے جن میں میگزین، رسالے اور اچھی معلومات کے روزنامے شامل ہیں۔ اس تمام متنوع مواد سے ایک حقیقت عیاں ہوتی ہے ـــــــ اسلام نے مسلمانوں کو زوال تک نہیں پہنچایا بلکہ خود مسلمانوں نے اسلام کے اصول نظر انداز کر کے زوال مول لیا۔ ان حوالوں سے بار بار یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کے عظیم مذاہب میں اسلام ہی سب سے بڑھ کر ترقی پسند ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں۔ یہ بات زیادہ تر مغربی مصنف ہی کہتے ملیں گے۔ اسلام لازماً ایک فعال مذہب ہے، اس کے رگ و پے میں قوت موجود ہے ـــــــ اس کا دائرہ فکر و عمل وسیع ترین ہے۔ تمام مذاہب سے بڑھ کر جاذب اور سمو لینے والا ہے۔ یہ لافانی ہے اور اپنے اندر نیا جنم لینے کی بے نظیر قوت رکھتا ہے۔

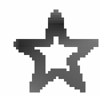
دنیا کے نامور شاعر علامہ اقبال نے کہا ہے، ”مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے یہ سبق لیا ہے کہ اسلام ہی انہیں بچا سکتا ہے، تاریخ کے نازک مرحلوں پر ہمیشہ اسلام ہی نے انہیں بچایا“ حقیقت خلافِ ازیں نہیں۔ اگر آج آپ اپنی نظر اسلام پر مرکوز کرلیں اور اس میں دائماً قوت بخشنے والے جو افکار سموئے ہوئے ہیں ان سے تحریک پائیں تو آپ اپنی پراگندہ قوتیں یکجا کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور یوں اپنی گمشدہ یک جہتی بحال کرنے کے بعد پیش آنے والی تباہی سے

اپنے تئیں محفوظ کر لیں گے۔

اگر یہ تالیف کسی طور اس مقصد کے حصول میں مدد دے سکے جو اوپر دیے ہوئے حوالے میں اس پروقار انداز سے بیان کیا گیا ہے تو مصنف سمجھے گا کہ اسے اپنی محنت کا معقول صلہ مل گیا ہے۔ امید ہے کہ درسگاہوں میں تعلیم پانے والوں، ان کے معلموں اور پروفیسروں، مقننہ کے رکنوں، تمام سرکاری اہلکاروں اور رہنماؤں کے لیے میری محنت کارآمد محرک ثابت ہوگی۔ یہ بھی امید ہے کہ اس سے ان چند گمراہ مسلم نوجوانوں کو اس غلط فہمی سے نجات ملے گی کہ اسلام ترقی کی راہ میں حائل ہے۔

راقم الحروف ان تمام مصنفین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے جو مختلف ملکوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اسلام کی فتوحات نیز بنیادی اسلامی تعلیمات پر جن کی آراء پیش کی گئی ہیں۔

مولوی نور احمد



مولوی نور احمد ۲۵ دسمبر ۱۸۹۰ء کو چٹاگانگ میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے اور بی ایل کی ڈگریاں لیں۔ اس کے بعد چٹاگانگ بار میں شامل ہو گئے۔ ۳۳ سال تک چٹاگانگ میونسپلٹی کے چیئرمین رہے۔ برصغیر میں سب سے پہلے آپ نے چٹاگانگ میں مفت اور لازمی پرائمری تعلیم رائج کی۔ دس سال تک بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے اور تقسیم کے بعد پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

سائنس کے فروغ میں مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا

زیرِ نظر کتاب اسلام کا ایک تہذیبی طاقت کے طور پر مطالعہ پیش کرتی ہے۔ اس بارے میں کہ اسلام کا رویہ سائنس اور فنونِ لطیفہ کے بارے میں کیا ہے، بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، طہارت پسند مسلمانوں کے حلقہ میں بھی اور بیرونی حلقوں میں بھی مگر یہاں مصنف کے پیشِ نظر طہارت پسند مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ بیرونی حلقے ہیں جو مسلمانوں کو سائنس دشمن اور آرٹ دشمن سمجھتے ہیں۔ مصنف نے مغربی مورخین ہی کے حوالوں سے اس تصور کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ علم و فن کو کس طرح سے مسلمانوں کے تخلیقی جذبے نے فروغ بخشا اور یہ کہ انسانی تاریخ میں اس قوم نے کیا کردار ادا کیا۔ چونکہ اس کتاب کے مخاطب اولاً مغرب کے لوگ ہیں اس لئے اس کا انگریزی میں لکھا جانا سمجھ میں آتا ہے۔ انگریزی میں یہ کتاب GLORIES OF ISLAM کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اب رحمان مذنب نے اسے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ سلیس و رواں ہے۔ رحمان مذنب صاحب نے ان دقتوں پر جو ایسی کتاب کے ترجمہ میں پیش آتی ہیں خوش اسلوبی سے قابو پایا ہے۔ ساتھ میں انہوں نے حاشیے بھی دیئے ہیں جو ایک عام قاری کے لئے اس کتاب کو مزید قابلِ فہم اور مفید بناتے ہیں۔

انتظار حسین

تبصرہ روزنامہ "مشرق" ۱۰،۱۰ اکتوبر ۱۹۷۱

اسلام اور سائنس

حصہ اول

جدید اور اسلامی تہذیب کا تقابلی
جائزہ

اسلام اور سائنس

جو لوگ اسلامی اصولوں سے ناواقف ہیں عام طور پر اسلام پر سب سے زیادہ نکتہ چینی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سائنس کے مطالعے اور اس کی ترقی کے خلاف ہے لیکن تاریخ ایک مختلف کہانی بیان کرتی ہے۔ مغربی علوم پر مسلمان سائنسدانوں کا جو احسانِ عظیم ہے، مغرب کے متعدد علماء نے کاملاً اس کا اعتراف کیا ہے۔

موسیو بریفالت نے اپنی کتاب THE MEANING OF HUMANITY میں لکھا ہے ــــــ

''اگرچہ یورپ کی ترقی کا ایک بھی ایسا پہلو نہیں جس سے قطعی طور پر اسلامی ثقافت کے نقوش کا پتا نہ ملتا ہو لیکن اس قوت کی پیدائش پر اس کے اثرات جس قدر واضح اور اہم ہیں کہیں دوسری جگہ نہیں ــــــ یہی تو نئی دنیا کی مستقل دائمی قوت اور کامیابی کا عظیم سرچشمہ ہے ــــــ یہی طبعی سائنس اور سائنسی اسپرٹ ہے۔''

جرمن عالم ہمبولٹ کی رائے میں علمائے عرب کو اس معنی میں طبعی سائنس کے موزوں موسس سمجھنا چاہیے جس معنی میں ہم اس اصطلاح کو استعمال کرنے کے عادی ہیں۔

سائنسی مورخ جارج سارٹن مسلمان علماء کو یوں شاندار خراج پیش کرتا ہے ــــــ

''سب سے زیادہ گراں قدر، سب سے زیادہ اوریجنل اور سب سے بڑھ کر پُرمغز کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں آٹھویں صدی کے نصف آخر سے گیارھویں صدی کے اختتام تک عربی ہی بنی نوع آدم کی سائنسی اور ترقی پسندانہ زبان تھی۔ اس دور میں اگر کوئی شخص خوب باخبر ہونا اور تازہ ترین معلومات حاصل کرنا چاہتا تو اسے عربی پڑھنی پڑتی۔ یہاں چندان درخشندہ ہستیوں کے نام لے دینا کافی ہے مغرب میں جن کے پائے کے معاصر نہیں ملتے ــــــ

جابر بن حیان، الکندی، الخوارزمی، الفرغانی، الرازی، ثابت بن قرا، البطانی، حنین ابنِ اسحاق، الفارابی، ابراہیم ابنِ صنعان، المسعودی، الطبری، ابولوفا، علی ابنِ عباس، ابوالقاسم، ابن الجذار، البیرونی، بوعلی سینا، ابنِ یونس، الکرخی، ابن الہیثم، علی ابنِ عیسیٰ، الغزالی، الزرقلی، عمر خیام۔

ناموں کی اس شاندار صف میں اضافہ محال نہیں۔ اگر تمھیں کوئی کہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں قحط الرجال تھا تو یہ نام لے دو۔ یہ تمام علماء ۷۵۰ شمسی سے ۱۱۰۰ شمسی تک کے نسبتاً مختصر عہد میں ہوگزرے ہیں۔"

فلپ حتّی[1] اپنی تالیف HISTORY OF THE ARABS میں کہتا ہے

"مسلمانوں کے دور کے ہسپانیہ میں ازمنہ وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ علم و دانش کے درخشاں ترین ابواب رقم ہوئے (آٹھویں صدی اور تیرھویں صدی کے آغاز تک عربی بولنے والے دنیا بھر میں تہذیب و ثقافت کے عظیم مشعل بردار تھے) مزید برآں انھی کے توسط سے قدیم علم اور فلسفہ دریافت ہوا، اس میں اضافہ ہوا اور اس انداز سے پھیلا کہ مغربی یورپ میں تحریک احیائے علوم ممکن ہوئی[2]۔"

ازمنہ وسطیٰ کے اسلام کی یہ ابدی عظمت توجہ طلب ہے کہ اسے انسانی فکر کی تاریخ میں پہلی بار ایک بات میں کامیابی نصیب ہوئی۔ اس نے قدیم سامانی دنیا کے سب سے بڑے کارنامے یعنی وحدانیت کے فلسفے کو قدیم انڈو یوروپین دنیا کے سب سے بڑے کارنامے یعنی فلسفے سے ہم آہنگ کیا اور اس سے سمجھوتہ کیا۔ اس طرح مسیحی یورپ کو جدید نقطہ کی جانب لے گیا۔

حتّی یوں نشان دہی کرتا ہے

"قرونِ وسطیٰ میں بغداد اور اندلس کے مسلمان مفکرین ہی کو یہ لازوال عظمت حاصل تھی کہ انہوں نے خیال کی دولہروں میں تال میل قائم کیا اور ہم آہنگی میں یورپ تک پہنچایا۔ سائنسی اور فلسفیانہ فکر نیز آنے والے عہد کی دینی حکمت پر اس کا جو اثر پڑا اس کے پیشِ نظر مسلمان مفکرین کا یہ کارنامہ اولین عظمت کا مستحق ہے۔

۱۔ عہد حاضر کا نامور مستشرق۔ اس کی دوسری کتابیں HISTORY OF SYRIA ا۔ ۲۔ ترجمہ فتوح البلدان مولفہ بیناوی

۲۔ صفحہ ۵۵۵۔ عیسائی علماء نے اسلامی درسگاہوں سے روشنی پائی اسے یورپ کے اندھیروں میں بکھیرا۔ یہی وہ تحریک ہے جس کی بدولت یورپ کی جہالت اور پسماندگی دور ہوئی اور وہ اسلامی مملکتوں کے نقش قدم پر چلا اور ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا۔

یورپ میں نئے خیالات کی آمد سے عہد جاہلیت کے خاتمے اور علم ودانش کے دور کے آغاز کی نشان دہی ہوتی ہے۔ عربوں کے فکر کے لمس سے روشن ہوکر اور قدیم یونانی حکمت کی تازہ آگاہی سے تیز فہم ہوکر اہل یورپ میں علم اور فلسفے کا جو ذوق پیدا ہوا، اس نے انہیں بہ سُرعت آزاد اور عالمانہ زندگی پروان چڑھانے میں رہنمائی کی۔ اب تک ہم اس کا پھل کھا رہے ہیں۔"

اسی طرح پروفیسر ہولم یارڈ نے اپنے سائنسی رسالے ENDEAVOUR میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے ——

"ایک ہزار سال ہوئے کہ اسلام اور صرف اسلام میں سائنس کا شعلہ چمکا۔"

ایچ۔ جی۔ ویلز کہتا ہے ——

"نئے زاویے اور تازہ توانائی سے علمائے عرب نے اس مثبت علم کی ترقی کا کام سنبھالا جسے یونانیوں نے شروع کر کے چھوڑ دیا تھا۔"

ڈاکٹر لوسین لیک لرک اپنی تالیف THE HISTORY OF ARAB MEDICINE (صفحات ۹۱، ۹۲) میں یوں رقمطراز ہے ——

"دنیا پھر کبھی وہ اعجاز آفریں منظر نہ دیکھے گی جو نویں صدی میں عربوں نے پیش کیا۔ یونانیوں کے تمام علوم عربوں کی گرفت میں تھے۔ انہوں نے اپنی صف میں اوّل درجے کے طلباء پیدا کیے جنھوں نے اسی وقت علمِ حقیقی کے صحیح مذاق کا اظہار کیا۔"

ECCLESIASTICAL HISTORY کا مصنف موشین کہتا ہے ——

"اس امر کا اعتراف کرنا چاہیے کہ طبیعیات ہو، نجومیات ہو یا فلسفہ، ریاضیات ہو یا کیمیا —— وہ تمام علم جو دسویں صدی سے یورپ میں پھیلا اصل میں عرب علماء سے حاصل کیا گیا تھا۔"

ایک تجربہ کار اسکالر، برلن یونیورسٹی جولین۔ سکس لکھتا ہے ——

"عربوں کے علم الکیمیا نے یونانیوں کے طریقے سے ماوراء اس انداز سے ترقی کی اور یہ مغرب کے علم الکیمیا پر تنہا اس حد تک اثر انداز ہوا کہ آج قرونِ وسطیٰ کے علوم کے طلبہ اس راستے کا کھوج لگانے ہی میں سب سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں جو کچھ مدت پہلے تک گمشدہ تھا اور جو کبھی ترقی کی سمت لے گیا تھا۔"

جان ڈبلیو کیمبل جونیئر نے اسلامک ریویو کے مارچ ۱۹۵۵ء کے شمارے میں لکھا ہے ——

''اسلام نے وہ کچھ حاصل کیا کہ دوسری کسی قوم نے اس کے حصول کی کوشش تک نہیں کی۔ اسلام نے سائنس ایجاد کی۔ یہ کام روما اور یونان نہ کر سکا۔ ان میں سے ہر ایک نے دو میں سے صرف ایک جز پیدا کیا جو سائنسی فکر کی عادت کے لیے ضروری تھا۔ درحقیقت ان سے پہلے کی قوموں نے بھی یہی کچھ کیا، ان کے بعد وہ آزادانہ طور پر یہی کچھ کر پائے لیکن دونوں باتوں میں کوئی کامیاب نہ ہوا۔ فلسفہ خوب ہے لیکن یہ تنہا قائم نہیں رہ سکتا۔ ایتھنز [1] اپنے دلفریب فلسفے پر منہ کے بل گرا کیونکہ یہاں نکاس کے لیے بدروتھی نہ آبی گزرگاہ۔ روما کے پاس صفائی ستھرائی کا شاندار نظام تھا لیکن حکیمانہ فکر کا نظام نہ تھا۔ روما کے دل میں ایتھنز کے نفیس فلسفے کا احترام تھا نہ یونان کے دل میں روما کی درشت مادہ پرستی کا۔ ہم نے سائنسی میراث روما سے لی ہے نہ یونان سے بلکہ اسلام سے لی ہے۔''

مسٹر کیمبل کے خیال میں معاشرے میں اسلامی کارناموں سے اکثریت کی لاعلمی کا ایک سبب یہ ہے کہ جس وقت یورپ عہدِ جاہلیت سے نکلا اس وقت روما اور یونان جو کبھی مسیحیت کے دشمن تھے اسکی دشمنی ترک کر چکے تھے لیکن ۱۴۰۰ شمسی تک اسلام اس کا دشمن ہو چکا تھا۔ احیائے علوم وفنون کے بعد یورپ اسی میں زیادہ لُطف محسوس کرتا تھا کہ یونان اور روما کے قدیم فلسفے پر غور وفکر کرے بہ نسبت اس کے کہ اعتراف کرے اور بیشتر سائنسی ترقی کا خراج اپنے دشمن یعنی اسلام کو پیش کرے۔

ڈریپر HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE میں مسٹر کیمبل کے بیان کی تائید ان الفاظ میں کرتا ہے، ''عرب فاتحین ایک بار پھر مصر کو اقوامِ عالم میں ذی وقار بنانے کے قابل ہوئے —— عیسائی حکومت نے اسے جس بھیانک مذہبی جنون، جہالت اور درندگی کے گڑھے میں دھکیلا تھا اسلام نے اس میں سے نکالا۔ انہوں نے نہ صرف قدیم یونانی حکماء کی تالیفات جمع اور محفوظ کیں بلکہ ان پر بالوضاحت تبصرہ کیا اور ان کی اصلاح کی۔ جدید

---

[1] ایتھنز جس نے پانسو سال قبل مسیح شہرت پائی، ''شہری ریاست'' اٹیکا کا صدر مقام اور یونانی تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا۔ یہیں ناٹک کی روایت پروان چڑھی اور نقطۂ عروج پر پہنچی۔ گڑھی کے نیچے دایونائی سس دیوتا کا وہ تاریخی منڈوا تھا جسے یونانی معبد کا درجہ دیتے اور جس کے آرکیسٹرا (دائرۂ رقص) پر بہترین کھیل کھیلے گئے۔ یوری پیڈیز، ایسکی لس، سوفوکلیز اور اریسطوف آنیز نے یہیں لافانی نام پایا۔ اسی تہذیب وتمدن کی درخشاں بستی کے قرب میں حکیم افلاطون نے اپنی اکیڈمی (درسگاہ) قائم کی جس نے ارسطو جیسا نامور عالم پیدا کیا۔ ایتھنز کے فرماں روا، مورخ، عالم، فلسفی اور ڈرامہ نگار اپنی فکری وتہذیبی کاوشوں اور علوم وفنون سے عشق رکھنے کے باعث آج بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، دراصل انہی لوگوں کی بدولت ایتھنز کو تاریخ میں قابلِ قدر مقام ملا۔ (مترجم)

یورپ کے بانیوں کو اول اول افلاطون، ۱؎ ارسطو، ۲؎ اقلیدس، ۳؎ اپولونیس، ۴؎ بطلیموس، ۵؎ بقراط ۶؎ اور جالینوس ۷؎ کے کلیات مع فاضلانہ حواشی عربی زبان ہی میں ملے۔ جدید یورپ نے عربوں

۱؎ یونان کا نامور فلسفی جس نے فلسفے میں مثالیت کو رواج دیا۔ ۴۲۷ ق م میں ایتھنز میں پیدا ہوا۔ اولاً شاعری کرتا رہا لیکن پھر سقراط کی توجہ سے حکمت و فلسفہ کی جانب مائل ہوا۔ بہترین نثر نگار ہے۔ مکالمات میں نثر کے روپ میں شاعری کی ہے۔ "ری پبلک" اسکی معروف ترین اور حسین ترین تالیف ہے۔ "اپالوجی" میں اس نے سقراط کی وہ تقریر پیش کی ہے جو اس نے اپنے دفاع میں عدالت کے روبرو کی تھی۔

۲؎ ارسطو (۳۸۴ تا ۳۲۲ ق م) شاہ مقدونیہ کے درباری طبیب کا بیٹا تھا۔ نثر نگار بھی تھا اور شاعر بھی۔ اس نے یونانی ناٹک کے زوال کا زمانہ دیکھا اور یونانی ڈرامے پر لافانی کتاب (بوطیقا) لکھی۔ اپنے استاد کی وفات کے بعد اکیڈمی کی طرز پر درسگاہ کھولی، اسے چلتے پھرتے کی درسگاہ کہتے۔ اس میں جمنیزیم بھی تھا کیونکہ یونانیوں کے یہاں جسمانی ریاضت کو عبادت کا درجہ حاصل تھا۔ اس نے کتب خانہ اور عجائب خانہ قائم کیا۔ افلاطون کے مقابل زیادہ حقیقت پسند اور عملی آدمی تھا۔ سکندر اعظم نے اس کے علمی کاموں میں جی کھول کر مدد دی۔ سیاسات پر اس کی کتاب بڑی وقیع ہے۔

۳؎ اقلیدس کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش معلوم نہیں ۳۰۰ ق م کے لگ بھگ اسکندریہ میں اس نے نام پیدا کیا۔ ریاضی دان اور علم الاشکال کا عالم تھا۔ اس کی کتاب "ستوئے کیا" (مبادیات) علم الہندسہ اور علم الاشکال سے متعلق ہے۔ اس نے فیثاغورث اور تھیلیز کی معلومات بھی اسی تالیف میں سمیٹی ہیں۔ انیسویں صدی تک مقبول رہا۔ موسیقی پر بھی رسالہ لکھا۔

۴؎ اپولونیس دوسری صدی عیسوی کا غریب عالم تھا۔ اس نے گریمر پر کتابیں لکھیں۔ بیشتر کتابیں اب ناپید ہیں۔ اسکندریہ میں مقیم رہا۔

۵؎ اسکندر کے بعد مصر پر بطلیموسوں کا خاندان مسلط رہا جس میں بڑے بڑے علم دوست اور عالم فرماں روا پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ دوسری صدی میں بطلیموس نامی اسکندریہ کا ہیئت دان بھی ہو گزرا ہے اور یہاں اسی کا ذکر ہے۔ اس نے "نظام ریاضی" پر جو کتاب لکھی اس کا عربی ترجمہ "المجسطی" کے نام سے معروف ہے۔ اس میں نجوم سے متعلق اپنے عہد کی تمام معلومات موجود ہیں۔ اس میں زمین کو ساکن قرار دیا ہے اور اس کے گرد سورج، چاند اور دوسرے سیاروں کی گردش کا ذکر کیا ہے۔ کلیسا نے اس نظریے کو جزو ایمان بنا لیا چنانچہ اسکی تردید کرنے والا کلیسائی عدالت کے حکم سے ہلاک کر دیا جاتا۔ کوپرنیکس اور گلیلیو کو بطلیموس کے نظریے کی مخالفت پر سخت عذاب جھیلنا پڑا۔ بطلیموس نے جغرافیائی حدود پر بھی کتاب لکھی۔ موسیقی اور بصریات پر بھی رسائل لکھے۔

۶؎ بقراط یونان کا نامور طبیب اور معلم ۴۶۰ ق م میں پیدا ہوا۔ افلاطون نے اس کی شہرت کا اعتراف کیا ہے۔ بقراط کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے طب کو سائنسی خطوط پر ترقی دی اور جہاں تک بن پڑا اسے توہمات، ساحری اور ٹونے ٹوٹکوں سے الگ کیا۔ اسکے نام سے بہتر (۷۲) کتابیں منسوب کی گئیں لیکن ان میں بہت سی اسکے شاگردوں نے لکھیں اور بعض اسکی پیدائش سے قبل لکھی گئیں۔ غالباً ڈیڑھ درجن کتابیں اسکی تصنیف ہیں۔ اس کے ہمعصر اس کی عظمت کے قائل تھے۔ وہ فاضل طبیب اور دیانتدار انسان تھا۔ علم و فضل میں یکتا تھا۔ اس کا یہ قول بہت مشہور ہے ——— "زندگی مختصر ہے لیکن فن کا سفر لمبا ہے۔ موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ تجربہ خطرناک ہوتا ہے اور فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے۔"

بقراط کا حلف نامہ بے نظیر ہے۔ اس میں تمام دیوتاؤں کو گواہ بنا کر، حلف اٹھا کر اقرار اور عہد و پیمان کرتا کہ استاد کو ماں باپ کا درجہ دے گا اور اسے اپنی کمائی میں شریک کرے گا، استاد کے اہل خانہ کو اپنا بھائی سمجھے گا اور انہیں فن طبابت سکھائے گا۔ بیمار کا بخلوص نیت علاج کرے گا۔ کسی کو زہر کھلائے گا نہ زہر کھلانے کا مشورہ دے گا۔ اسقاط حمل نہیں کرے گا۔ کسی بیمار مرد یا عورت کے جسم کی بے حرمتی نہیں کرے گا۔ کسی کا راز فاش نہیں کرے گا۔

۷؎ بقراط کے بعد جالینوس کا نام لیا جاتا ہے جو ۱۲۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۹ء میں مرا۔ اس نے اپنے پیشروؤں کے علم و تجربہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور علم و فضل میں بڑا کمال حاصل کیا۔ یہ بے مثال طبیب کئی سال تک روما میں رہا۔ اس نے طب کے ہر شعبے پر کتابیں لکھیں۔ اگرچہ ادبی لحاظ سے یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتیں لیکن علمی زاویے سے بڑی وقیع ہیں۔ طبی لٹریچر کے علاوہ اس نے فلسفہ، گرامر، ادب اور قدیم مزاحیہ ناٹکوں پر بھی کتابیں لکھیں۔ اس کی ایک سو کے قریب کتابیں دنیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس نے افلاطون اور ارسطو پر بھی تنقیدیں لکھیں لیکن ان کے صرف اجزا ہی ملتے ہیں۔ انگلستان کے شاہ ہنری ہشتم کے طبیب نے اس کی چھ کتابوں کا ترجمہ کیا۔ (مترجم)

سے نہ صرف علم الادویہ اور علمِ ریاضی سیکھا بلکہ علم النجوم بھی سیکھا جس سے انسان کی نظر میں وسعت آتی ہے اور اس پر قدرت کے میکانکی قوانین کا انکشاف ہوتا ہے ــــــ عربوں نے بڑی لگن سے ان علوم کو پروان چڑھایا۔ عرب حکماء نے نئے مشاہداتی آلات کی مدد سے زمین کے محیط نیز سیاروں کی جگہوں اور تعداد کی نسبت صحیح معلومات حاصل کیں۔ علم الکیمیا کا آغاز اور مادی ترقی عربوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

مسٹر رابرٹ بریفالٹ جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے مسٹر کیمبل کی تائید کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ سائنس اپنے وجود کے لیے عربوں کی مرہونِ منت ہے۔

وہ کہتا ہے ــــــ

''سائنس صرف حیرت انگیز دریافتوں اور انقلاب آفرین نظریوں کی حد تک ہی نہیں بلکہ اس سے بہت زیادہ عربوں کی مرہونِ منت ہے۔ اس کا وجود ان کی بدولت تھا۔ ہم جسے سائنس کہتے ہیں وہ مغرب میں سائنسی تجسس کی نئی اسپرٹ، تحقیق و تجربہ کے نئے طریقوں اور مشاہدے کی ان نئی عادتوں کے نتیجے میں اُبھری جن سے یونانی ناواقف تھے۔ عربوں نے اہلِ یورپ کی سرزمین کو یہ اسپرٹ عطاء کی اور اسے ان طریقوں سے متعارف کروایا۔ سائنس اگرچہ جدید دنیا میں عربی تہذیب کا سب سے اہم کارنامہ تھی تاہم اس کا پھل دھیرے دھیرے پکتا تھا۔ جب مُوروں کی ثقافت تاریکی میں چلی گئی تب مدت کے بعد وہ جن جسے انھوں نے جنم دیا تھا قوت کے ساتھ ابھرا۔''

ایک دوسرے عالم نے مسلمانوں کے سائنسی کارناموں کا مقابلہ ہندوستانیوں کی اس پسماندگی سے کیا ہے جو سائنس کے مقابلے میں ان کے یہاں پائی جاتی تھی۔

اس نے کہا ہے ــــــ

''آج بھی صحیح علم کے حصول کا وہ اصول درست ہے جو مسلم سائنسدانوں (عالموں) نے ایک ہزار سال پہلے بیان کیا لیکن وہ سائنسی نقطۂ نظر جس

کی بدولت ایسا علم ممکن ہوا ہنوز ہندوستانیوں کے یہاں نایاب ہے۔ آج بیسویں صدی میں بھی یہ لوگ جادو کی شعبدہ بازیوں اور روحانی عطائیت کے بھوت کو اپنے اوپر سوار کئے ہوئے ہیں۔ پھر سائنسی علم کی صحت کے بارے میں انہیں سنجیدگی سے مقابلے کے لائق سمجھتے ہیں۔"

"ریڈرز ڈائجسٹ" کے ۱۹۵۵ء کے ایک شمارے میں ایک مضمون نگار نے ایسا واقعہ بیان کیا ہے جس سے عقلی، حقیقت افروز اور (بدیں سبب) صحیح معنی میں اس سائنسی نظریے کی وضاحت ہوتی ہے جسے ہمیشہ اسلام نے ذہنوں پر منقش کرنے کی سعی کی ——

"ہر معاملے میں محمدؐ سراپا عمل کے پیکر تھے۔ جب ان کے پیارے بیٹے ابراہیم کا انتقال ہوا تو سورج گرہن ہُوا۔ چپکے چپکے خدا کی ذاتی تعزیت کی افواہیں اڑیں جس پر محمدؐ نے ارشاد فرمایا —— سورج گرہن فطرت کا عمل ہے۔ کسی آدمی کی پیدائش یا موت کو اس سے منسوب کرنا حماقت ہے۔"

ایک اور یورپین اسلام کے ابتدائی ایام کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ——

"یہ اسلام کی عظمت ہے کہ اس نے سائنسی علوم کو مسجد میں وہی جگہ دی جو قرآن، حدیث اور فقہ کے مطالعے کو دی۔ یاد رہے کہ اپنے عہد عروج میں مسجد اسلام کی یونیورسٹی تھی۔ مسجد میں کیمیا، طبعیات، نباتات، علم الادویہ، فلکیات اور فلسفے وغیرہ پر لیکچر دیے جاتے۔"

ان حالات میں یہ جاننا شاید ہی تعجب خیز ہو کہ —— قرآن یا حدیث میں ایک فقرہ ایسا نہیں کہ جو کسی مسلمان کو مظاہر فطرت کی آزادانہ تحقیق سے باز رکھے۔"

سائنس کے متعدد شعبوں میں مسلمانوں کے کارناموں کی طویل فہرست اس بیان کا بلیغ ثبوت ہے۔ "جنرل ہسٹری آف یورپ" میں اس کے مؤلفین —— تھیچر اور شول ان کارناموں کا ایک مؤثر خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں ——

"ریاضیات میں مسلمانوں نے یونانیوں کی بنیادوں پر تعمیر کھڑی کی۔ عرب ریاضی دانوں نے صفر ایجاد کیا۔ سب سے پہلے محمد بن موسیٰ

نے اعشاری علامات استعمال کیں اور ہندسوں کی قدری درجہ بندی کی۔ عربوں نے علم المثلثات کو ترقی دی نیز جیب زاویہ، خط مماس اور مماس التمام ایجاد کیے۔ طبیعیات میں انہوں نے پنڈولم ایجاد کیا اور بصریات (OPTICS) پر کتابیں لکھیں۔ انہوں نے علم النجوم میں ترقی کی، متعدد رصدگاہیں بنائیں اور ستارہ شناسی کے لیے ایسے آلات تیار کیے جو آج بھی مستعمل ہیں۔ وہ مدار پر سورج اور زمین کے زاویے کا حساب اور دن رات برابر ہونے کی تاریخوں کا تعین کر سکتے تھے۔ لاریب فلکیات کے بارے میں ان کا علم خاصا تھا۔ علم الادویہ میں وہ یونانیوں کی کتابوں سے بہت آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے علم البدن اور حفظان صحت کا مطالعہ کیا۔ ان کی قرابادین عملاً ہماری آج کے زمانے کی میٹیریا میڈیکا سے ملتی جلتی ہے۔ ان کے علاج کے کتنے ہی طریقے آج بھی ہمارے یہاں رائج ہیں۔ ان کے سرجن بے ہوش کرنے والی ادویہ کے استعمال سے آگاہ تھے اور انھوں نے جراحی کے بڑے مشکل کارنامے سرانجام دیے۔ اس زمانے میں جبکہ مذہب کی رو سے یورپ میں دوا کا استعمال ممنوع تھا اور علاج کی توقع ان مذہبی ریتوں رسموں سے کی جاتی جنھیں پادری ادا کرتا، عرب حقیقی طور پر علم الادویہ رکھتے تھے۔''

اگرچہ سائنسی دریافتوں کے ابتدائی ایام میں علم کو فوری طور پر علاحدہ علاحدہ مستقل شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اگر چند کارناموں کو الگ الگ عنوان کے تحت درج کیا جائے تو قارئین کو مسلمانوں کی ریسرچ کی قدرومنزلت اور اس کے تنوع کا اندازہ لگانے میں سہولت رہے گی۔ عنوان یہ ہوں ——

''ریاضی (نظریاتی اور اطلاقی)، میکانیات، طبیعیات اور بصریات، فلکیات، کیمیا، جغرافیہ (نقشہ کشی اور علم جہاز رانی اس میں شامل ہیں) نباتیات، آخر میں وہ علم جن میں مسلمانوں کے کارناموں نے دوررس اثرات پیدا کیے —— یعنی علم الادویہ۔''

ریاضی ریاضی کی ابتدائی تاریخ میں غالباً الخوارزمی محمد ابن موسیٰ (۸۵۰-۷۸۰ شمسی) سب سے بڑی نامور ہستی ہے۔ الجبرا پر سب سے پہلے اسی نے کام کیا۔ اس کی تالیف "حساب الجبر والمقابلہ" میں تکمیل اور مساوات کی آٹھ سو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ بارھویں صدی میں اسے عربی سے لاطینی میں منتقل کیا گیا اور پھر اس کے بعد سولہویں صدی تک یہی کتاب اس موضوع پر اہم نصاب کے طور پر رائج رہی۔ اسی کی تالیف کی بدولت یورپ میں عربی ہندسے رواج پذیر ہوئے۔

دوسرا عظیم ریاضی دان عمر خیام تھا جس کی تالیف میں اقلیدس اور الجبرا کی دوسرے درجے کی مقادیر کے حل پیش کیے گئے ہیں۔ وہ اپنے کام کو نیا بتاتا اور اپنا دعویٰ ان الفاظ میں سپردِ قلم کرتا ہے ـــــــ

"ان مسائل کے بارے میں قدماء کی کوئی تحریر مجھ تک نہیں پہنچی۔"

نصیرالدین نے "چہار ضلعی اشکال" پر رسالہ تالیف کیا۔ علم المثلثات اور سادہ و کرہ نما اشکال پر بھی کتابیں لکھیں۔

کمال الدین نے بارش کے قطروں میں آفتابی شعاعوں کی خمیدگی کا معائنہ کیا اور ابتدائی اور ثانوی قوس وقزح کے معرضِ وجود میں آنے کی وضاحت کی۔

میکانیات حساب (نظریاتی اور اطلاقی) میں مسلمان سب پر سبقت لے گئے اور انہوں نے میکانیات میں غیر معمولی کام کیے۔ ڈاکٹر ایچ۔ جے۔ ونٹر جو ڈاکٹر آف سائنس اور انگلستان کے ایک یونیورسٹی کالج میں تعلیمات کے لیکچرار ہیں۔ "مسلمان میکانیات دان اور میکانکی آلات" کے عنوان سے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں ـــــــ

"خلیفہ ہارون الرشید نے شہنشاہ شارلیمان کو جو ساعتِ آبی پیش کی تھی اس کی کہانی معروفِ عام ہے۔ عرب اور ایرانی ایسے آلات بنانے میں جواب نہ رکھتے تھے۔ اسلام میں میکانیک کا علم یونانی فکر اور تجربے کی میراث ہی نہیں تھا بلکہ اس میں چند قابلِ توجہ اضافے بھی کیے گئے جو مسلمان دانشوروں کا کرشمہ تھے۔"

ہوم بولٹ وقت کی پیمائش کے لیے پنڈولم کے استعمال کو مسلمانوں سے منسوب کرتا ہے۔

خلیفہ مامون کے دوست موسیٰ ابنِ شاکر کے تین لڑکے "گورکھ دھندوں کی کتاب"

کے مشترکہ مصنف تھے۔ اس میں ایک سو میکانکی چیزوں کا بیان تھا۔ بیشتر ان کھلونوں کا ذکر تھا جو بڑی ہنرمندی سے بنائے گئے تھے۔

۹ شمسی کے بعد نظریاتی اور اطلاقی میکانیات میں خاصی ترقی کی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں پہیئے، دھرے، پھرکی، بیرم، دندانہ دار پہیئے اور پن چکی پر بہت زیادہ اور مفید کام ہوا۔

میکانیات پر غیر معمولی اہمیت کی دو کتابیں ہیں ـــــ "الکتاب فی معرفت الحیاء الھند سیہ" (اقلیدسی یا میکانکی طریقوں اور ہنر کی کتاب) جسے ابوالفیض اسماعیل ابنِ الرزاق الرزی بدیع الزمان نے لکھا اور "الکتاب میزان الحکمت" جسے مرو کے الخزینی نے لکھا۔ پہلی کتاب ۱۲۰۶ شمسی میں لکھی گئی۔ فارسی اور ترکی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس کی دلچسپی کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس میں پن گھڑیوں نیز آلاتِ آب رواں ـــــ چپو، دندانہ دار پہیہ اور گھماؤ لٹھ یا لٹو وغیرہ ایسے آلات کا ذکر تھا جن سے پانی اٹھاتے تھے۔ میکانیات کے موضوع پر جو بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں "میزان الحکمت" ان میں سے ایک نہایت مکمل تالیف ہے۔ اس میں صحیح وزن معلوم کرنے، کثافاتِ نوعی کے تعین، زمین پیمائی اور تیرنے کے اصول کا بیان تھا۔ اسی کے ساتھ کششِ ثقل کے بارے میں بھی کچھ بحث تھی۔

"میزان" پر ایک دوسری کتاب میں الخزینی، وزن کرتے وقت درجۂ حرارت کی کمی بیشی کے اثرات رفع کرنے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ دیگر امور کے مطالعے میں وہ خود کو گلیلیو کا پیش رو ثابت کرتا ہے۔

خزینی سے بھی قبل میزان پر عظیم ترین کام لاریب عمر خیام نے کیا تھا۔ نظریاتی شعبے میں بوعلی سینا اور درّے کے محمد ابنِ زکریا نے بہتیرا کام کیا تھا۔ عمر خیام کے بعد المظفر ابنِ اسماعیل الاسفرین نے کام کیا۔ حال ہی میں فلسفی ابونصر الفارابی کا ایک مخطوطہ ملا ہے جس سے طبعیات میں دلچسپی لینے کا سراغ ملتا ہے۔ اپنی اس تالیف میں فارابی خلاء سے انکار کرتا ہے۔ ہوا کی لچک کے موضوع پر اس کا مضمون نہایت دلفریب ہے اور طرزِ استدلال کا ایسا نیا شہ پارہ ہے جس پر یونانی اور لاطینی کا شمہ بھر اثر نہیں۔

بصریات میکس میئر ہقاف نے کہا ہے ـــــ

"مسلمانوں کی علمی شان بصریات کے شعبے میں نمایاں ہوتی ہے۔

ریاضی میں ابن الہیثم (ALHAZEN_۱۰۳۹_۹۶۵ء) اور کمال الدین

کی ذہنی صلاحیت اقلیدس اور بطلیموس کی صلاحیت کو ماند کر گئی۔ اس شعبے میں حقیقی اور مستقل علمی فتوحات انھی کا حصہ ہیں۔"

ایک اور المانوی مصنف ہیلمٹ جرشیم نے اطلاقی ریاضی میں مسلمانوں کے کارناموں کی ایک دلچسپ مثال دی ہے، اپنی تالیف "ہسٹری آف فوٹوگرافی" میں وہ لکھتا ہے ——

"عرب عالم ابن الہیثم ۱۰۳۸ء سے قبل تصویر کشی کے کیمرے CAMERA OBSCURA سے واقف تھا۔"

درحقیقت قرونِ اُولیٰ کے مفکرینِ اسلام نے ریاضی کی ہر شاخ پر کام کیا۔ اگلے پیرے میں فلپ ھٹی اجمالاً بتاتا ہے کہ عربوں کی تحقیقات سے یورپ میں ریاضی کی لغت کس قدر متاثر ہوئی ہے ——

یورپ میں ریاضی کی لغت پر ہمیں عربوں کے علمی اثرات کی ایک اور بلیغ شہادت ملتی ہے۔ الجبرا اور الگورزم [1] ایسے الفاظ لاطینی میں اپنا لیے گئے۔ یہی نہیں بلکہ بعض عربی اصطلاحات کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ الجبرا کی اصطلاح SURD (مقادیر اصم) جس کے معنی بہرے کے ہیں عربی ترکیب "جذر اصمہ" (بہری جڑ) کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح ٹریگنومیٹری میں CINE (جیب زاویہ) عربی لفظ جیب کا ترجمہ ہے۔ حساب کی کتاب کی سب سے دلچسپ اصطلاح جو اپنائی گئی ہے۔ سائفر CIPHER یا زیرو [2] ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ گنتی کے علم کی پُشت پر صفر اور عربی اعداد ہیں۔

ان کارناموں کی روشنی میں لاریب کوئی بھی اس بات پر اصرار نہیں کر سکتا کہ اسلام سائنسی تحقیق و تفتیش کے خلاف ہے جبکہ خاص طور پر سائنس کے بیشتر معلم بیک وقت علمائے دین بھی تھے۔ اس کی ایک مثال آٹھویں صدی کے قاضی حضرت ابوبکر ہیں جو مسجد میں دینیات پڑھاتے تھے اور مسجد اس وقت کی یونیورسٹی ہوتی تھی —— زمان و مکان کے بارے میں نظریۂ اضافیت مرتب کرنے کے لیے علمِ ریاضی کام میں لایا کرتے تھے۔ بعد ازاں پٹنہ کے ایک عظیم المرتبت مسلمان حضرت محب اللہ صاحب بہاری نے "جوہر الفرد" [3] کی چار جلدوں میں ان کے نتائج کی توثیق کی ہے۔

---

[1] نویں صدی کے ریاضی دان الخوارزمی کا طریقہ جس کی رو سے نو عددوں اور صفر کی مدد سے ہندسے اور بعض دوسری قدریں شمار کی جاتی ہیں۔

[2] عربی میں یہی صفر ہے

[3] ریاضی کی مساوات اور نجوم و طبعیات کے نظام کا جوہر۔

علم النجوم مطالعۂ ریاضی کے بالکل ساتھ ساتھ ابتدائی دور کے عرب منجمین کا کام ہے۔ جب نویں صدی کے شروع میں جنوب مغربی ایران میں پہلی رصدگاہ قائم کی گئی تو اسلام میں سائنسی خطوط پر علم النجوم کے مطالعے کا آغاز ہوا۔ ۸۲۹ء تک خلیفہ المامون نے اپنے بیت الحکمت (بغداد) سے ملحقہ ایک رصدگاہ بنالی تھی جو خوب ساز و سامان سے آراستہ تھی۔ یہاں اجرامِ فلکی کی حرکات کے مطالعے کے لیے جو آلات کام میں لائے جاتے تھے وہ کافی حد تک صحیح تھے۔ مامون کی پُرشکوہ خلافت سے قبل ابراہیم الفزری (۷۷۲ء) وہ پہلا شخص تھا جس نے اصطرلاب بنایا۔ خلیفہ المتوکل نے الفسطاط میں نائیلومیٹر [1] (نیل پیما) نصب کیا جس کی نگرانی پر معروف ترین ماہر نجوم ابوالعباس احمد الفرغانی مامور ہوا۔ اسی کی سب سے بڑی تالیف ''المدخل الیٰ علم الحیات الافلاک'' ۱۱۳۵ میں لاطینی زبان میں منتقل ہوئی۔

دسویں صدی کے آخر تک بغداد میں ماہرینِ نجوم کا ہجوم تھا جن میں علی ابنِ اماجر اور ابوالحسن علی بھی شامل تھے جو قمری حرکات کے بارے میں صحیح ترجمانی کے باعث آج بھی معروف ہیں۔ سلطان شرف الدولہ نے بغداد میں دوسری رصدگاہ قائم کی جسے عبدالرحمٰن الصوفی کام میں لاتے۔ ان کی تالیف ''الکواکب والثوابۃ۔'' [2] مشاہداتی فلکیات کا شاہکار ہے۔ علم طبعی کے میدان میں اسلام نے ابوالریحان محمد ابن احمد البیرونی ایسا جید ترین اور متجرِ عالم پیدا کیا۔ اس نے فلکیات پر متعدد کتابیں لکھیں جو بہت معروف ہیں۔ سلجوقی سلاطین میں سے جلال الدّین ملک شاہ فلکیات کے مطالعے کی سرپرستی کرتا اس نے رَے اور نیشاپور میں رصدگاہیں قائم کیں۔ یہیں تقویم (کیلنڈر) میں ایک اہم ترمیم کی گئی۔ یہ ترمیم اعتدالی سال کی صحیح مدت کے تعین کی بنیاد پر کی گئی۔ یوں قدیم ایرانی تقویم کی تجدید کی گئی۔ یہیں عظیم ہیئت دان عمر خیام نے تحقیق کا کام کیا اور اپنے ہمکاروں کے ساتھ مل کر وہ تقویم ایجاد کی جس کا نام الطوخ جلالی تھا۔

---

[1] نیل کا پانی خصوصاً سیلاب ماپنے کا آلہ

[2] سیارے اور ستارے

جان ولیم ڈریپر لکھتا ہے ــــــ

"مغربی یورپ میں فلکیات کا آغاز محمد فرغانی کی عربی تالیف کے لاطینی ترجمے سے ہوا۔ یورپ میں بھی سب سے پہلے عربوں ہی نے رصدگاہیں بنائیں۔ اشبیلیہ[1] میں جیرالدا مینار عرب ریاضی دانوں کی زیر ہدایت تعمیر کیا گیا۔

۱۹۳۵ء میں انٹرنیشنل اسٹرونومیکل یونین کا اجلاس ہوا تو فلکیات کے علم میں اسلام کے کام کا اعتراف کیا گیا۔ چاند کی تیرہ اشکال تیرہ مسلمان سائنسدانوں سے نامزد کی گئیں۔ ان علماء کے نام یہ ہیں ــــــ

(۱) ماشاءاللہ ــــــ مامون کے زمانے میں ہوگزرا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں اس کی کتابیں لاطینی میں منتقل کی گئیں اور نصاب کے طور پر مستعمل رہیں۔

(۲) المامون (ALMANON) عبداللہ المامون خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا تھا۔ اس نے ۸۲۹ء میں بغداد میں رصدگاہ قائم کی۔

---

[1] اشبیلیہ۔ موجودہ اندلس کا جنوب مغربی صوبہ جو قرطبہ کے مغرب میں واقع ہے۔ شاداب علاقہ ہے۔ دریائے وادی الکبیر شہر کے وسط میں سے گزرتا ہے۔ اسلامی عہد حکومت میں یہ سیر و سیاحت کا مقام تھا۔ دریا میں جہاز چلتے پھرتے نظر آتے۔ اس پر کشتیوں کا پل باندھا گیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق روما کے فرماں روا جولیس سیزر نے اشبیلیہ کا شہر آباد کیا۔ یہاں دیوی افرودائتی (حسن و محبت کی دیوی وینس) کا بت تھا۔ یہ بت اس قدر خوبصورت تھا کہ لوگ اس پر فریفتہ ہو جاتے۔ اپریل ۷۱۱ء میں جب طارق بن زیاد اندلس میں داخل ہوا تو اسی مہینے اگلے سال موسیٰ بن نصیر والی افریقہ اشبیلیہ فتح کرنے آیا۔ محاصرے کے بعد شہر فتح کر لیا گیا۔ ۷۴۳ء میں خلافت دمشق کی جانب سے لشکر حمص یہاں آیا اور آباد ہوا۔ اس رعایت سے اشبیلیہ کو حمص بھی کہتے ہیں۔ اموی سلطان قرطبہ (۸۲۲ء تا ۸۵۲ء) کے عہد میں اشبیلیہ میں عیسائیوں نے بہ تعداد کثیر اسلام قبول کیا۔ افریقہ کے مرابطین نے بھی یہاں حکومت کی۔ ان کے بعد موحدین حکمران ہوئے۔ پانسو سال تک مسلمان مسلط رہے۔ ابتدا میں مسلمانوں نے اسی کو دارالحکومت بنایا۔ عیسائی آئے تو انہوں نے یہاں کی شاندار مسجد شہید کی۔ البتہ قصر اشبیلیہ (ALCAZAR) کو اپنی شان و شوکت دوبالا کرنے کی غرض سے گزند نہ پہنچایا۔ اسلامی عہد میں یہ علوم و فنون کا گڑھ تھا۔ عبداللہ بن عمر بن خطاب اشبیلی یہاں کے نامور قاضی ہوگزرے ہیں۔ یہاں جہاز سازی کے فن کو بڑا فروغ ملا۔ یہاں کے صناع موسیقی کے نہایت نفیس آلات (خیال، عود، زلامی، اوطلہ) بناتے۔ یہاں کے معماروں نے مراکش کے محلات تعمیر کیے۔ پارچہ بافی، پچی کاری اور میناکاری کے ماہروں کی کمی نہ تھی۔ آج کل کے عیسائی کاریگر اشبیلیہ کے مسلمان کاریگروں کے نمونے سامنے رکھ کر کام کرتے ہیں۔ یہاں تیر کمان بنانے کے لیے بہترین لکڑی پیدا کی جاتی۔ ظروف سازی کے کام کو ترقی ملی۔ یہاں کے خشک میوے اور کھانے بڑی شہرت رکھتے (مترجم)

(ماخوذ از "اندلس کا تاریخی جغرافیہ۔" مؤلفہ محمد عنایت اللہ)

(۳) الفرغانی۔ ALFRAGANUS اس کا پورا نام ابوالعباس احمد ابن محمد ابن کاثر ہے۔ یہ فلکیات کا ریسرچ اسکالر تھا۔ اس کی کتابیں بڑی مقبول تھیں اور بارھویں صدی میں لاطینی میں منتقل کی گئیں۔ کتاب "فیہ حرکت السماویہ وجوانیو" اور "المدخل الیٰ علم حیات الافلاک" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۴) البطانی ALBATIGMUS اس کا پورا نام ابوعبداللہ محمد ابن جابر ابن سنن البطانی الہرانی الصابی ہے۔ ۸۵۸ء میں پیدا ہوا اور ۹۲۹ء میں اس نے وفات پائی۔ اس نے سورج پر چاند گرہن کا امکان ثابت کیا۔ فلکیات پر اس کا ایک رسالہ ہے جس میں گوشوارے ہیں۔ لاطینی میں اسکا نام یہ ہے ——

DE SCIENTIA STALLARUM DE NUMERIS STILLERRUNET MITTILBUS

کتاب کا تیسرا باب مثلثیات سے تعلق رکھتا ہے۔

(۵) ثابت۔ اس کا پورا نام ثابت ابن قراء ابن مروان الہرانی ہے، اس نے اور اسکے بیٹوں اور پوتوں نواسوں نے فلکیات اور اقلیدس میں بڑا کام کیا۔

(۶) الصوفی۔ ALZOPHI سلطان شرف الدولہ کے زمانے میں ہو گزرا ہے، اس کی شاہکار تصنیف "الصُوَرُ الکَوَاکب الثابت" کو بی فلکیات کے موضوع پر ہے۔

(۷) الحسن الہیثم۔ ALHAZEN اس کا پورا نام ابوعلی ابن الحسن الہیثم ہے ۹۸۷ء میں بمقام بصرہ پیدا ہوا۔ ۱۰۳۹ء میں وفات پائی۔ یہ دنیا بھر میں صفِ اول کے محققین بصریات میں سے تھا۔ اس کی شاہکار تصنیف "علم مناظر المرئیہ" ہے۔ یہ کتاب روجر بیکن، گیلر اور دوسرے انگریز سائنسدانوں کے لیے محرکِ خیال ثابت ہوئی۔

(۸) الزرقلی۔ ALZACHE اس کا پورا نام ابو اسحاق ابراہیم ابویحیٰ علی زرقلی ہے۔اس نے فلکیات کے ضمن میں لگاتار مشاہدے کیے۔وہ سائنسدان ہے جس نے ستاروں کے مقابل اوج الشمس کی حرکت کو حتمی طور پر ثابت کیا۔کوپرنیکس نے اپنی مشہور کتاب DE ROVLUTIONIBUS میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

(۹) جابر ابن الافلح۔ GEBER ۱۱۴۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔اس کی مشہور کتاب ''اصلاح المجسطی'' کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔سولھویں صدی میں یورپ کے ہیئت دان اس کی طلب رکھتے تھے۔یہ پہلا سائنسدان ہے جس نے اجرامِ فلکی کی حرکات کا اندازہ لگانے اور ان کی تشریح کے لیے چھوٹا سا آسمانی کرہ بنایا۔اس نے آسمانی مثلثیات کے چند اہم مسائل بھی حل کیے۔

(۱۰) ناصر الدین۔ فارس کے ایلخان اور ہلاکو خان کا وزیر تھا۔۱۲۰۱ء میں پیدا ہوا۔۱۲۷۳ء میں اس نے وفات پائی۔مرغاہ میں جو رصدگاہ قائم ہوئی تھی اس میں یہی مشاہدہ کرتا۔بہت بڑا اقلیدس دان تھا۔مشہور و معروف ایلخانی گوشوارے اسی نے تیار کیے تھے۔ثوابت کی فہرست بھی مرتب کی جو مدتوں یورپ اور چین میں مستعمل رہی۔

(۱۱) علی بطروجی۔اس کی تالیف ''کتاب الحیاۃ'' یورپ میں بڑی مقبول ہوئی۔

(۱۲) ابوالفدا (۱۲۷۳ء۔۱۳۳۱ء) اس کا پورا نام اسماعیل ابنِ الفدا ہے۔یہ براہِ راست سلطان صلاح الدین کے بھائی کی اولاد میں سے تھا اور سلطان الناصر کے تحت حماۃ کا عامل تھا۔اس نے بھی جغرافیے پر انسائیکلوپیڈیا قلمبند کی۔اس کی معروف ترین کتاب ''مختصر تاریخ البشر'' ہے۔

(۱۳) الوغ بیگ (۱۳۹۳ء-۱۴۴۹) یہ تیمور لنگ کا پوتا (یا نواسا) تھا۔اس نے سمرقند میں ایک شاندار رصد گاہ قائم کی جسے بہترین ساخت کے صحیح ترین فلکیاتی آلات سے لیس کیا۔اس نے سیاروں کی حرکات کے گوشوارے تیار کیے جو مقبول ہوئے اور ان کی خوب طلب رہی۔

حِطّی[1] اپنی تالیف ''عربوں کی تاریخ'' میں لکھتا ہے ——

''عرب ہیئت دانوں نے آسمان پر اپنے ہنر کے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔کوئی شخص بھی کرہ فلک کے ستاروں کا نام پڑھے گا تو جھٹ حقیقت جان لے گا۔یورپ کی زبانوں میں ستاروں کے اکثر نام عربی سے لیے گئے ہیں۔مثلاً عقرب (بچھو) الجیدی (الجدی۔لڑکا) الطائر (اُڑنے والا)، وینیب (ذنب، دم) فیر کیڈ (فرقد، بچھڑا)۔پھر مُتعدّد اصطلاحات بھی عربی الاصل ہیں۔ان میں ''ازیمتھ'' (السمت) نادر (نذیر)، زینتھ (السمت) عربی سے ماخوذ ہیں۔یہ اسلام کے اس ورثے کی شہادت دیتے ہیں جو مسیحی یورپ کو ملا۔''

جان ولیم ڈریپر ایک فقرے میں فلکیات کے شعبے میں عربوں کے کام کا یوں ذکر کرتا ہے، ''عربوں نے آسمان پر اپنی انگلیوں کا ایسا نشان چھوڑا ہے جسے ہر وہ شخص دیکھ سکتا ہے جو عام فلکی کرّے پر ستاروں کے نام پڑھے گا۔''

فرانسیسی سائنسدان سیدیلوت نے بتایا ہے کہ ابتدائی دَور کے عرب فلکیات دان کس قدر سچا سائنسی رجحان رکھتے تھے۔وہ کہتا ہے ——

''عرب معلوم سے نامعلوم کو رجوع کرتے ہوئے فلکی نظام عمل کا صحیح حال پیشِ نظر رکھتے، کسی ایسی بات کو سچ نہ مانتے جس کی توثیق ذاتی تجربے یا تجربہ گاہ سے نہ ہوتی —— سائنس کے مسلمان استادوں نے انھی اصول کی تعلیم دی اور انھی کا دعویٰ کیا۔''

مشاہدے کی یہ بات مَن وعَن وہی اسپرٹ رکھتی ہے جو قرآن کریم کی اس آیۂ کریمہ میں ہے۔

''بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق، رات اور دن کے فرق میں سمجھ داروں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

---

[1] فلپ حِطّی، عہد حاضرہ کا مستشرق جس کی دو کتابیں HISTORY OF THE ARABS اور HISTOR OF SYRIA نہایت وقیع ہیں۔اسی نے بیضاوی کی فتوح البلدان کا ترجمہ کیا۔ (مترجم)

کیمیا عظیم ترین مسلمان علمائے کیمیا میں سے ایک جابر بن حیان تھا جسے لاطینی میں GEBER کہتے۔ مغربی روایات کی رو سے اس نے کئی کیمیائی مرکبات دریافت کیے۔ اس کے پانچ رسالے لاطینی میں منتقل کیے گئے۔ یہ رسالے چودھویں سے اٹھارھویں صدی تک مغرب کی یونیورسٹیوں میں مستعمل رہے۔ اس کی تالیفات میں تکلیس[1] استحالہ[2] ایسے کیمیائی طریقوں کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں اصلاح شدہ عملِ تبخیر، قلم بنانے اور عملِ تصعید[3] کا بھی ذکر ہے۔ دھات کے اجزاء کے بارے میں اس نے ارسطو کے نظریے میں جو اصلاح کی اس کا اٹھارھویں صدی تک دَور دورہ رہا۔ اس کے علاوہ خالد ابنِ یزید اور امام جعفر الصادق ایسے مسلمان کیمیادان ہوگزرے ہیں جنہوں نے الکحل، پوٹاشیم نائٹریٹ (قلمی شورہ) نیز شورے اور گندھک کا تیزاب بنایا۔

"علم الکیمیا کی ابتداء اور اصلاح کا سہرا عرب مسلمانوں کے سر ہے۔"

یہ عظیم مورخ گبن کی رائے ہے جس کا اظہار اس نے اپنی تالیف "سلطنتِ روما کا زوال و انحطاط" کی پانچویں جلد میں کیا ہے۔ "یہ عرب ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے عملِ تقطیر کے لیے قرنبیق ایجاد کی۔ قدرت کی مملکت کی تین چیزوں کا تجزیہ کیا۔ الکلی اور تیزاب میں امتیاز کیا اور ان کا باہمی تعلق معلوم کیا۔ نیز سمیات (زہروں) کو ملائم اور صحت بخش ادویہ میں تبدیل کیا۔"

جغرافیہ جغرافیے کے علم میں مسلمان سائنسدانوں نے بڑا کام کیا ہے۔ جزوی طور پر اس علم میں اشتیاق کا سبب حج کا وہ دینی فرض تھا جس کی ادائی کے لیے اکثر مسلمان طویل، لازمی سفر اختیار کرتے جو ان کے گھر سے سینکڑوں میل دور کا تھا۔

1۔ ایسا عمل جس میں حرارت پہنچنے پر کوئی شے سفوف بن جائے۔ آکسیجن کے ملنے کا عمل۔
2۔ گیس کی شکل میں تبدیل ہونے کا عمل۔
3۔ آج بھی طبِ مشرقی میں بعض اہم مرکبات سم الفار (سنکھیا)، شنگرف، کچلہ، پارہ، نیلا تھوتھا وغیرہ ایسی زہریلی اور مہلک چیزوں سے تیار کیے جاتے ہیں۔ (مترجم)

فلپ ھٹی اپنی تالیف "عربوں کی تاریخ" میں کہتا ہے ـــــــ

"اسلام کے آغاز کے بعد حج بیت اللہ کا دستور، مساجد کو مکتبوں کا رنگ دینے کی جدت اور بوقتِ نماز کعبے کی سمت کے تعین سے مسلمانوں کے جغرافیائی مطالعے کو مذہباً تحریک ملی۔"

یوں گویا ایک اور شعبے کو وجود ملا جس میں چہ جائیکہ ذرا بھی قرآن روڑے اٹکاتا، سائنس کی ترقی کے لیے یقینی طور پر اس کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

مسلمانوں کے لیے جغرافیے میں خصوصی دلچسپی کا ایک اور سبب یہ تھا کہ اسلامی سلطنت کی بے پناہ توسیع سے تجارت کے لیے تحریک ہوئی۔ ساتویں صدی ہی میں مسلمان تاجر ہندوستان، چین اور مشرق میں پہنچ گئے۔ وہ سمندر اور خشکی دونوں پر سفر کرتے۔ جنوب میں وہ زنجبار اور برِ اعظم افریقہ کے انتہائی جنوب تک پہنچے۔ مغرب میں جزائر کینیری اور طینرف کی خبر رکھتے تھے۔ شمال میں روس، بحیرہ بالٹک کے ممالک بلکہ بہت دور آئس لینڈ تک چلے گئے تھے۔ شمال مشرقی سوویت روس میں پیکورا تک میں ساتویں سے گیارھویں صدی تک کے عربی سکے دریافت ہوئے ہیں۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں ناروے کے قدیم دارالحکومت میں خاص طور پر ان سکوں کا ایک انبار ملا۔ مسلمانوں کے تمدن کا اثر برطانوی جزیروں تک پہنچا۔ آٹھویں صدی میں مرسیا کے شاہ اوفا نے اپنا طلائی سکہ گھڑوایا جو عربی دینار سے ملتا جلتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اس کی عبارت بھی عربی عبارت کے مماثل تھی۔ آئرستان کے ایک دلدلی علاقے میں طلائی برنجی صلیب ملی ہے جسے روپے کے طور پر تو استعمال نہیں کرتے تھے تاہم اس سے مسلمانوں کے اثر کی غمازی ہوتی ہے۔ اس پر عربی رسم الخط میں بسم اللہ لکھی تھی۔

چین اور ہندوستان کے بارے میں سب سے پہلی عربی تحریر تاجر سلیمان التازی نے ۸۵۱ عیسوی میں لکھی۔ دوسری دلچسپ باتوں کے علاوہ سلیمان چینیوں کے یہاں دستخط کی بجائے انگوٹھا لگانے کا ذکر بھی کرتا ہے۔ مارکو پولو ـــــــ نامور سیاح چین میں مسلمان تاجر آباد کاروں کا ذکر کرتا ہے۔ سب سے پہلے روس کا حال احمد ابنِ فضلان حمید نے کیا جسے خلیفہ مقتدر نے ۹۲۱ عیسوی میں شاہ بلغاریہ کے پاس بھیجا تھا۔

۹۳۸ عیسوی میں البیرونی نے بتایا کہ ہند جزیرہ نما ہے۔

جے۔ایچ۔کریمر لکھتا ہے ———

"علمِ جغرافیہ، دریافت وانکشاف، بین الاقوامی تجارت، نئی جگہوں کے کھوج لگانے اور سیاحت کے میدان میں اہلِ یورپ مسلمانوں کو اپنا ثقافتی بزرگ جانیں۔"

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ دالیسپس سے ایک ہزار سال پہلے خلیفہ ہارون الرشید خاکنائے سویز سے نہر نکالنا چاہتا تھا۔

نئی نئی جگہوں کی دریافت مسلمانوں کے اس کام کا حصہ ہے جو انہوں نے علمِ جغرافیہ کے سلسلے میں کیا۔اس سے کہیں زیادہ دوررس اہمیت کا حامل یہ کام تھا جو مسلمان ریاضی دانوں نے طول البلد اور عرض البلد کا تعین کرنے نیز زمین کے گول یا چپٹا ہونے کے سلسلے میں کیا۔

خلیفہ مامون (۸۳۳-۸۱۳) کے شاندار عہد میں جب ابھی نویں صدی کی ابتداء تھی مسلمان سائنسدانوں نے اس حقیقت کو مسلم قرار دیا کہ زمین گول ہے۔

مامون نے ستر سائنسدانوں پر مشتمل ایک جماعت بنائی جس نے عظیم ہستی ——— ابن موسیٰ الخوارزمی کے زیرِ نگرانی (۸۳۰ میں) کرۂ ارض کا پہلا نقشہ تیار کیا۔

لاریب مسلمان سائنسدانوں ہی کی بدولت مغرب کو وہ حقائق ملے جن سے کرسٹوفر کولمبس کو سفر کی تحریک ہوئی کیونکہ ہسپانیہ اور پرتگال میں خاص طور پر مسلمانوں کا اثر بہت زیادہ تھا، یہیں کولمبس نے جہازرانی کے علم کے مطالعے میں دن گزارے۔ ملاحوں کا قطب نما جسے کولمبس نے استعمال کیا اصل میں عربوں کی ایجاد تھا۔

جہازرانی کا علم کئی یورپین ملاحوں کے قطب نما کو چینیوں کی ایجاد بتاتے ہیں لیکن جارج سارٹن، فلپ حتی اور سر آر۔ایف۔برٹن اسے عربوں کی ایجاد مانتے ہیں۔وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ دسویں اور گیارھویں صدی کے عظیم عرب ملاح کولمبس کے ہم پلہ قرار دیے جانے کے مستحق ہیں۔

سلیمان الماہری اور شہاب الدین ابنِ مجید نے بحرِ ہند، بحرِ اوقیانوس اور بحر الکاہل پامال کیے ——— جہاز کے ذریعے برِ اعظم افریقہ کے گرد چکر کاٹا۔دونوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔بحری جہازرانی پر

سب سے اہم کتاب ابنِ مجید کی ہے۔ اسی نے سب سے پہلے بحری گائیڈ تالیف کی۔

فنِ نقشہ کشی نقشہ کشی کے باب میں مسلمانوں نے یونانی نقشہ کش بطلیموس کا اثر قبول کیا لیکن انھوں نے اس کی اندھی تقلید نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے علم کو اس کے علم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ پایا۔ انھوں نے جو ارضی کرّے تیار کیے، نیز جو نقشے کھینچے اور ریاضی کے کام کیے وہ یورپ کی تمام درسگاہوں میں بہت معروف تھے۔

شاید سہل ترین طریقہ یہی ہے کہ مسلمان جغرافیہ دانوں نے جو کام کیا ہے ان میں سے چند درخشاں ہستیوں کے اسمائے گرامی یہاں دے دیے جائیں۔ الخوارزمی نے فلکیات اور نقشہ کشی کے شعبوں میں جو کام کیا ہے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد باعتبارِ عظمت یاقوت ابنِ عبداللہ الحموی کا نام آتا ہے جس کا عہد ۱۱۷۹ سے ۱۲۹۹ء تک ہے۔ اس کی کتاب مجمع البلدان ایک طرح سے دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے۔ اس میں اس کے وقت کا تمام علمِ جغرافیہ موجود ہے۔ یاقوت نے شہر نامہ بھی تیار کیا تھا۔ جس میں تمام شہروں کے نام اور حالات بطریقِ ابجد درج تھے۔

ایک اور نامی گرامی جغرافیہ دان ابو عبداللہ محمد ابنِ احمد المقدسی ہے۔ سپرینگر نے اسے "ہر دور کا عظیم ترین جغرافیہ دان" کہا ہے۔ "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" اس کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں نہایت دل فریب اور بہ کثرت نقشے دیے گئے ہیں جن سے سنہری ریت، نیلگوں سمندر، دریا، بھورے پہاڑ عیاں ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے تجارتی راستے سُرخ رنگ سے دکھائے گئے ہیں۔[1]

ابو زید احمد ابن صالح البلخی کے سر اس بات کا سہرا ہے کہ اس کا اٹلس نہ صرف ابتدائی دور کے بہترین اٹلسوں میں سے تھا بلکہ مسلمانوں کا بہترین اٹلس تھا۔ اس میں عرب، بحرِ ہند، مراکش، الجزائر، شام، مصر، بحیرہ روم کے نقشے شامل تھے۔ غالباً ۹۲۴ء میں اسی کو اسلامی سرکاری نقشہ سمجھا جاتا تھا۔

۱۔ یہ حقیقت ہے کہ جب اہلِ مغرب نئے فاتحین کی حیثیت سے کرۂ ارض پر نمودار ہوئے تو مسلمانوں کے کارناموں اور علمی و فنی فتوحات کے بے پایاں انبار ان کے سامنے آئے جن سے انھوں نے خوشہ چینی کی اور نئی راہوں کا سراغ پایا لیکن اپنی عصبیت، تنگ دلی اور اسلام دشمنی کے باعث انھوں نے مسلمانوں اور ان کے کاموں کا تذکرہ نہ کیا البتہ اپنے زعماء اور ان کے کارناموں کا ذکر خوب بڑھا چڑھا کر کیا۔ یہ سازش ایک طویل المیعاد منصوبے کے تحت کی گئی۔ آج یہ تاثر عام ہے کہ ہر ایجاد، ہر دریافت، ہر فن اور ہر علم کی ترقی کا سہرا اہلِ مغرب ہی کے سر ہے حالانکہ حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ (مترجم)

ایک اور قابلِ ذکر نام ابو قاسم عبید اللہ کا ہے جسے ۸۴۴ء میں صاحب البرید مقرر کیا گیا۔ اس نے تجارتی شاہراہوں کے باب میں مفید کام کیا۔ جزیرہ نمائے ہند کے سلسلے میں عظیم البیرونی (۹۲۷ء) کا پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔ اپنی تالیف "کتاب التفہیم" میں یہ بات واضح کر چکا ہے کہ وہ بڑے بڑے سمندروں کی جائے وقوع سے آگاہ تھا۔ اس نے دنیا کا ایک قابلِ قدر گول نقشہ بھی تیار کیا تھا۔

اہل یورپ جس مسلمان جغرافیہ داں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں وہ ابو عبداللہ الادریسی ہے۔ ادریسی ۱۱۳۰ء سے ۱۱۵۴ء تک قرطبہ [1] میں پڑھاتا رہا اور اس نے اپنی معروف کتاب بہ عنوان "نزہت المشاق فی افتراق الآفاق" شائع کی۔ اس کتاب کا مطلب یہ ہے ——— زمینوں کی سیاحت کا شوق رکھنے والے کے مزے۔" اس میں کئی دلچسپ نقشے ہیں۔

۱۔ قرطبہ عبرانی الفاظ سے مرکب ہے جس کے معنی قریہ طیب (اچھا گاؤں) ہے اندلس کے اس شہر کو عمالقہ (قرطاجنہ ——— کارتھیج کے فنیقیین) نے بسایا۔ مسلمانوں سے قبل روما اور بزنطیہ (بائی زنطیم) والے حکمران رہے۔ ۷۱۱ء میں طارق بن زیاد کے علم سے لشکر نے قرطبہ پر قبضہ کیا۔ ۷۱۹ء میں اشبیلیہ کی جگہ اسے دارالحکومت بنایا گیا۔ اس کے اکیس محلے تھے اور ہر محلہ اپنی ضروریات میں خود کفیل تھا۔ وادیٔ الکبیر اس میں سے بہتا تھا۔ شہر کے گرد فصیل تھی۔ خانہ جنگیوں کے دور میں ہر محلے کے گرد خندقیں کھودی گئیں۔ مسلمانوں نے یہاں کے قدیم قصر، قصر رزریق میں حسین اضافے کیے۔ جبال قرطبہ سے آب شیریں کی نہر کاٹ کر محل میں لائے۔ نہر کا پانی جستی نلوں کے ذریعے شہر بھر میں پہنچایا گیا۔ بے نظیر باغ لگائے گئے۔ سنگ مرمر کے فوارے بنوائے گئے۔ "الکارز" یہاں کا سب سے معروف قصر ہے۔ شہر میں حمام تھے، مساجد تھیں۔ امیر ہشام بن عبدالرحمٰن الداخل مسجد میں ہی بیٹھ کر رعایا کے مقدمات فیصل کیا کرتا۔ وادی الکبیر پر پتھر کا پل بنایا گیا جو اندلس کے عجائبات میں سے ہے۔ دریا یہاں اشبیلیہ کی طرح غارت گری نہیں کرتا۔ دسویں اور گیارھویں صدی میں یہاں رئیسوں، سرداروں اور لشکریوں کے مکانوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ لکڑی کے مکان، سرائیں، دکانیں اور حمام ان کے علاوہ تھے۔ چار ہزار سے زائد بازار تھے۔ آٹھ سو تک مسجدیں اور سات سو حمام تعمیر ہوئے۔

اس تاریخی شہر کی شہرت میں مسجد قرطبہ کا بھی حصہ ہے جو اپنی دلفریبی میں یکتائے روزگار ہے۔ آج یہ ویران ہے لیکن اس سے مسلمانوں کی شان عیاں ہے۔ اس کا نقشہ دمشق کے ایک ماہر تعمیر نے تیار کیا۔ مسجد کے گرد چار دیواری تھی۔ دیواروں پر کنگرے تھے جن کے باعث اسے قلعے کی شکل مل گئی۔ جن لوگوں نے یہ خوشنما مسجد دیکھی ہے ان کی یادیں تمام عمر اس کے تصور سے حسین اور مسلمانوں کی عظمت کے تخیل سے معمور رہتی ہیں۔ یہ مسجد جادوگری کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔

اس شہر میں ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم و تدریس جاری تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مسیحی یورپ میں بڑے بڑے پادریوں اور سرکاری عہدیداروں کے سوا سب لوگ ناخواندہ تھے ——— اور اسلامی اندلس کا بچہ بچہ پڑھا لکھا تھا۔ قرطبہ کے علماء، حکماء اور فقہاء نے دنیا بھر میں نام پایا۔ ابن رشد ایالاثانی فلسفی اسی شہر میں پیدا ہوا اور اس نے یہیں فقہ اور طب کی تعلیم پائی۔

۱ (مترجم نے یہ نوٹ محمد عنایت اللہ بی۔ اے کی گراں قدر تالیف "اندلس کا تاریخی جغرافیہ" مطبوعہ دارالطبع ثانیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۲۷ء سے تیار کیا)

کولمبس اپنے پایے کے جن جغرافیہ دانوں کا مرہونِ منت ہے ان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ جنوبی افریقہ کے ایک اسکالر نے بڑی سنجیدگی سے یہ دلچسپ تر نظریہ قائم کیا ہے کہ ہسپانیہ سے کولمبس کی روانگی سے کہیں پہلے عربوں نے امریکہ دریافت کر لیا تھا۔ ''دہلی ایکسپریس'' مورخہ ۱۱، اگست ۱۹۵۲ء میں ایک اخباری مضمون یوں رقم ہوا ہے ———

''جنوبی افریقہ کا ایک نامور بشریات دان کہتا ہے کہ عربوں نے امریکہ دریافت کیا نہ کہ کرسٹوفر کولمبس نے۔ واٹرسینڈ یونیورسٹی میں معاشرتی بشریات کے سینئیر لکچرار ڈاکٹر جیفریز کے انکشاف کی رُو سے عرب کولمبس سے پانچ سو سال پہلے بازی لے گئے۔ اٹھارہ ماہ ہوئے کہ ڈاکٹر موصوف نے دریائے ریوگرینڈ میں ایک حبشی کی کھوپڑی دریافت کی اور اس پر اپنے دعوے کی بُنیاد رکھی۔

ڈاکٹر جیفریز کا خیال ہے کہ ۱۰۰۰ء تک عرب بحیرۂ روم پر مسلط ہو چکے تھے۔ انہوں نے افریقہ کے مغربی ساحل پر ڈیرے جما لیے تھے اور امریکہ میں بھی آباد ہو گئے تھے۔ کولمبس نے خاکنائے دریاں میں حبشیوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں پائی تھیں۔ ڈاکٹر جیفریز کے خیال میں یہ حبشی عرب غلاموں کی نسل سے تھے۔ ڈاکٹر موصوف نے کہا ———

''جزیرۂ بہاما میں حبشیوں کی جو کھوپڑیاں ملی ہیں اور کیریبین میں جڑوں والی جو فصلیں اُگائی جاتی ہیں ان سے یہ نظریہ قابلِ قبول ہو جاتا ہے۔''

قاری ڈاکٹر جیفریز کا پوری طرح ساتھ دے نہ دے لیکن اتنا تو یقینی ہے جیسا کہ اسکالر جے۔ ایچ۔ کریمر کے ان الفاظ سے عیاں ہے ———

''نئی دنیا کی دریافت میں عرب اپنے حصے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔''

اسی کے پہلو بہ پہلو یہ بھی ایک قطعی حقیقت ہے کہ تجارت اور کاروبار پر اختیار رکھنے کے باعث عرب قدیم دُنیا کے جغرافیے کے بارے میں تمام دوسری قوموں سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ وہ مغربی یورپ سے اس علم کا آزادانہ تبادلہ کرتے۔

نباتیات اور تاریخ حیاتیات (نیچرل ہسٹری) تاریخ حیاتیات نیز علوم طبعی کے شعبوں میں مسلمانوں نے اپنی تحقیقات سے دنیا کو مالا مال کیا۔ شعبہ نباتیات میں انھوں نے کھجور اور سن ایسے پودوں میں جنسی اختلافات معلوم کیے۔ انھوں نے ان پودوں کی درجہ بندی بھی پیدا کی جو بیج سے پیدا ہوتے یا پھر خودرَو ہوتے ہیں۔ حج پر جاتے ہوئے یا سیاحت کے دوران میں انھوں نے پودوں کی کئی نئی قسمیں معلوم کیں۔ حیاتیات دانوں کی کئی دریافتوں سے ادویہ سازی میں کام لیا گیا۔ عظیم حیاتیات دان عبداللہ ابن احمد ابن البیطار نے اچھی طرح افریقہ اور ایشیا کو کھنگالا اور اپنی کتاب ''الجامع فی الادویۃ المفردہ'' میں اپنا علم جمع کر دیا۔ نباتیات کی یہ شاہکار کتاب ہے اور علم الادویہ میں جو جڑی بوٹیاں سب سے زیادہ مفید ہیں ان کی فہرست پیش کرتی ہے۔ اس میں کل ایک ہزار چار سو دواؤں کے فوائد دیے گئے ہیں۔

رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے ــــــــــ

''عربوں نے جو فارما کو پیا ایجاد کیا عملاً وہی ہے جسے آج کل کام میں لایا جا رہا ہے۔ بس نئے ترکیبی اور عضویاتی علاج کے مرکبات ان کے اپنے ہیں ورنہ نکس وومیکا، سناءِ مکی کا مرکب جدوار (میٹھا تیلیا)، پکھان بید، ببول کی چیز (مر)، رسکپور اور ہمارے نسخوں کا ڈھانچہ عربوں کی ایجاد ہے۔''

تاریخ حیاتیات (نیچرل ہسٹری) کے شعبے میں قرآن کا ایک حوالہ یہ ظاہر کر سکے گا کہ کیوں قرون اولیٰ کے مسلمان اسرار دنیا کے باب میں سوچ بچار پر آمادہ ہوئے ــــــــــ

''لاریب مویشیوں میں بھی تم ہدایت کی نشانی پاؤ گے، کیونکہ یہ اپنے بدن میں لہو اور بول و براز کے درمیان میں سے تمہارے پینے کو خالص دودھ پیدا کرتے ہیں، جو پینے والے ہیں ان کے لیے یہ قابلِ قبول ہوتا ہے۔''

''کھجور اور انگور میں سے تمہیں مکمل مشروب اور خوراک دستیاب ہوتی ہے۔ دیکھو! جو دانشمند ہیں ان کے لیے اس میں بھی نشانی پائی جاتی ہے۔''

''اور تمہارے خدا نے شہد کی مکھی کو پہاڑوں پر نیز پیڑوں اور لوگوں کے گھروں میں چھتہ بنانا سکھایا۔ یہ تمام پھل کھاتی اور تمہارے رب کی راہ پر

چلتی ہیں جوان کے لیے ہموار کر دیا گیا ہے۔ ان کے شکموں میں سے کئی کئی
رنگ کا مشروب برآمد ہوتا ہے جس میں انسانوں کے لیے شفاء ہے اور دیکھو،
اہلِ فکر کے لیے نشانی ہے۔" (سورۃ النحل (۱۶)، آیات کریمہ ۶۶ تا ۶۹)

علمُ الادویہ قبل ازیں حوالے دے کر یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ کیمیا دانوں اور نباتیات دانوں دونوں نے علمِ طب کی ترقی میں حصہ لیا۔ فلپ ہٹی "ہسٹری آف دی عربز" میں لکھتا ہے ـــــــ

"عربوں نے ادویہ کے استعمال میں جو تخلیقی کام کیا اس کے سلسلے میں انھوں نے پیش قدمی کے بعض نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔ سب سے پہلے انہی نے عطار خانہ کھولا۔ دواسازی کی پہلی درس گاہ قائم کی اور پہلا فارما کوپیا مرتب کیا۔"

مسلمان سائنسدانوں نے دواسازی کے کئی قرابادین تیار کیے۔ ۷۷۸ء میں جابر بن حیان نے ان کی ابتدا کی۔ جابر بن حیان کو بالعموم عربی کیمیا کا باپ کہتے ہیں۔

خلیفہ مامون کے عہد تک نیز المعتصم کے زمانے میں فارغ التحصیل ہونے کے لیے امتحانوں کا طریقہ رائج ہو چکا تھا۔ ان امتحانوں نیز بدعنوانی کے مشکوک معاملوں کی نسبت قانونی تفتیش کی بدولت بغداد کو نیم حکیموں سے نجات مل گئی۔ مؤرخ گبن بتاتا ہے کہ آٹھ سو سے زائد اطباء نے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ بغداد میں ۸۶۰ طبیبوں کو اس منافع بخش پیشے کے لیے اجازت نامہ ملا تھا۔

شفاخانے اس زمانے میں بغداد میں شفاخانوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ علامہ مقریزی کے بیان کی رُو سے المتوکل کی خلافت کے دوران میں قاہرہ میں شفاخانہ قائم کیا گیا۔ عہدِ ایوبی میں مصر میں متعدد شفاخانے کھولے گئے۔ قاہرہ کے عامل ابن طولون نے ۸۷۲ء میں ایک شفاخانے کے لیے تین لاکھ روپے کی آمدنی کا عطیہ دیا۔ اس شفاخانے میں ہر مرض کے علاج کے لیے علاحدہ علاحدہ وارڈ تھے اور مریضوں کو علاج کے ساتھ ساتھ مفت خوراک اور رہنے کی جگہ دی جاتی۔ بیرونی مریضوں کے لیے الگ شعبہ قائم تھا۔ جراحی کے لیے خاص وارڈ تھے۔ پھر پاگلوں کے علاج کے لیے بھی علاحدہ شعبہ قائم تھا۔

بغداد ہی نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں پاگلوں کے لیے شفاخانے کھولے گئے۔ دماغی امراض کے شفاخانوں میں پاگلوں کا علاج انسانی ہمدردی اور زیادہ تندہی سے کیا جاتا جبکہ مغربی

ملکوں میں صدیوں بعد بھی انھیں مجرم ہی سمجھا جاتا...... یہ امر واقع ہے کہ ۱۴۱۰ء میں ویلنیشیا کی مذہبی تنظیم نے ہسپانیہ میں دماغی امراض کا جو پہلا یورپی شفاخانہ قائم کیا وہ ایک مشہور اسلامی شفاخانے کی طرز پر تھا۔

قاہرہ کے شفاخانے کے بارے میں ۱۲۸۴ء میں المقریزی نے جو تفصیل پیش کی ہے اس میں یہ ذکر موجود ہے کہ جو مریض رُو بہ صحت ہوتے ان کی فوری اور کامل صحت یابی کے لیے یہاں گویّے رکھے گئے تھے۔

جب ۸۵--۱۱۸۳ء اور پھر ۹۱--۱۱۸۹ء میں علامہ ابنِ زبیر نے مکۂ معظمہ کا سفر کیا تو انھوں نے بغداد، موصل، حلب اور دمشق میں اعلیٰ درجے کے شفاخانوں کا جال بچھا دیکھا۔ دمشق میں نورالدین نے اعلیٰ درجے کی ڈسپنسری قائم کی اور سلطان صلاح الدین نے ایک بڑے فاطمی محل کو شفاخانے میں تبدیل کیا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ زنانہ وارڈ الگ تھے اور یہاں طبیب عورتیں بھی موجود تھیں۔ اپنے پیش رو حکمرانوں سے متاثر ہو کر دوسرے سلاطین نے بھی مخیرانہ مدد دی۔

بغداد کا سب سے بڑا شفاخانہ عضدالدولہ کا تھا۔ اس کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ عصرِ حاضر کے اکثر شفاخانوں کے پائے کا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ اس کی عمارت کشادہ تھی اور یہ جدید ترین آلات سے لیس تھا بلکہ اس کا عملہ ایسی امتیازی شان کا تھا کہ اس سے بہتر عملہ کبھی کسی دوسرے شفاخانے میں نہ ہوا ہوگا۔ درحقیقت یہ محض شفاخانہ نہ تھا، اس سے سوا تھا۔ یہ طبّی یونیورسٹی تھا جہاں ابونصر ایسی عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں۔ یہ نامور طبیب امراضِ چشم کا ماہر تھا۔ یہیں سرجن ابوالخیر، ابوصولت مریضوں کا علاج کرتے اور طالب علموں کو لیکچر دیتے۔ یہاں اسّی یا اس سے زائد اطبا کام کرتے تھے ان میں ابنِ بلخ، ابویعقوب اور ابوعیسٰی شامل تھے۔

ایک یورپی مصنف کہتا ہے ———

"بغداد میں جو شفاخانہ قائم کیا گیا تھا وہ باقی تمام شفاخانوں پر چھایا ہوا تھا۔ پورے ساز و سامان سے لیس تھا، معدّ داوقاف سے روپیہ فراہم ہوتا اور اس میں ایسا دواخانہ تھا جہاں دنیا بھر سے دوائیں جمع کی جاتیں۔

شفاخانے میں جو دوائیں اور غذائیں مروّج تھیں ان کی فہرست لندن کے برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ شفاخانوں کی فہرست غیر مختتم لگتی ہے۔

طلیطلہ [1] کے ایک یہودی سیاح بن یامین نے صرف بغداد میں ساٹھ شفاخانے دیکھے۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ تمام مریضوں کے علاج اور غذا کا بندوبست سرکاری خرچ پر ہوتا ہے۔ عضد الدولہ نے شیراج میں طبی یونیورسٹی سے ایک شفاخانہ ملحق کیا۔ ابوسید کوکوبوری نے اربیلا میں اندھوں کے لیے چار شفاخانے بنائے اور پرانی بیماریوں کے لیے کئی شفاخانے قائم کیے۔ تمام دنیائے اسلام میں سب سے عمدہ شفاخانہ مراکش میں تھا جسے ابوالوحید مراکشی نے ۱۲۰۰ء میں قائم کیا۔ یہاں نہ صرف غریبوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا بلکہ انھیں فارغ کرنے کے بعد اتنی رقم دی جاتی تھی کہ جب تک انھیں کام نہ ملتا وہ اپنا گزارہ کر سکتے۔ سولھویں صدی تک مسلمانوں کے شفاخانوں کو امداد دی جاتی رہی۔ ایک نہایت نفیس شفاخانہ دہلی میں قائم کیا گیا۔

---

[1] طلیطلہ یا طلاطلہ اندلس کے ایک صوبے کا دارالحکومت جبلِ طلیطلہ کے مغربی و شمالی جانب واقع ہے۔ ایک روایت کے مطابق اسے طوبال پسرِ نوح نے بسایا جب بخت نصر نے یہودیوں کو فرات و دجلہ کی وادی میں سے نکالا تو اندلس چلے آئے اور انھوں نے تولیدث نام کا شہر بسایا۔ قیصرِ روما نے اسے "ژلیطلہ" کہا۔ شہر سنگِ خارا کی پہاڑی پر واقع ہے۔ تین طرف سے دریائے تاجہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ دریا پر ایک محرابی پل تھا۔ چرخ کے ذریعے دریا کا پانی پل پر چڑھایا اور نلوں کے ذریعے شہر میں پہنچایا گیا۔ یہاں ایک جادو محل تھا جسے قبلِ اسلام کھولنے سے منع کیا گیا۔ اسے روڈرک نے کھولا جس کے بعد اس پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔ طارق کو یہاں سابق حکمرانوں کے ایک سو ستر تاج ملے۔ ہر تاج پر بادشاہ اور اسکی اولاد کا نام درج تھا۔

یہاں سے جو قیمتی اشیا ملیں وہ مجریط MADRID اور کلونی کے عجائب خانوں میں رکھی ہیں۔

مسلمانوں کی عمارات مسیحی فرماں رواؤں کے ہاتھوں کھنڈر ہوئیں۔ یہاں کی شاندار مساجد پر گرجے تعمیر کیے گئے۔ آبی رسد کا نظام بھی قائم نہ رکھا جا سکا اور برباد ہوا۔

یہیں یحییٰ بن ذی النون (المامون) نے قصر بنایا جس میں ایک بحیرہ (پختہ تالاب) تھا۔ بیچوں بیچ گنبد تھا جس کی چوٹی سے اس کے چاروں طرف پانی کی چادر گرتی۔ المامون اندر گنبد میں بیٹھتا اور اس پر پانی کا ذرا سا چھینٹا نہ پڑتا۔

یہاں ستر ستر سال تک کھیتوں میں غلہ پڑا رہتا اور خراب نہ ہوتا۔ اعلیٰ درجہ کی زعفران پیدا ہوتی اور نفیس قسم کی تلواریں بنتیں۔ طارق بن زیاد نے ۱۱ے ش میں اسے فتح کیا۔ ۳۹ے ش میں افریقہ کی اقوامِ بربر نے خلیفہ دمشق ہشام بن عبدالملک کے خلاف بغاوت کی تو اندلس میں رہنے والے بربر بھی بگڑ گئے اور انھوں نے طلیطلہ کو گھیرے میں لے لیا۔ والئ اندلس نے بغاوت فرو کی۔ شمر ذی الجوشن کا پوتا (صمیل) بھی یہاں کا حاکم ہو گزرا ہے۔ اس کی فیاضی مشہور تھی۔ یہاں بار بار بغاوت ہوئی۔ بغاوتوں میں بیشتر وہ مسلمان حصہ لیتے جو پہلے عیسائی تھے۔

مسلمانوں نے اس شہر کو تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنایا۔ یہاں بڑے بڑے محدث، فقیہہ، ادیب، علمائے فلکیات اور مہندس پیدا ہوئے۔ ۳۸۶ برس تک مسلمان ان پر مسلط رہے۔ غرناطہ کی تباہی کے بعد طلیطلہ بھی اسلامی تسلط سے محروم کیا گیا۔ اب تک مسلمان اور عیسائی بلا امتیاز عربی بولتے رہے۔ عیسائی حکومت نے عربی بولنے کی ممانعت کی البتہ گرجاؤں میں مدتوں عربی مستعمل رہی کیونکہ لوگوں کو عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں عبادت کرنی نہ آتی۔ لاطینی زبان کسی کو یاد نہ رہی تھی حالانکہ مسلمان علماء اس زبان سے کما حقہٗ آگاہ تھے۔ (مترجم نے "اندلس کا تاریخی جغرافیہ" سے نوٹ مرتب کیا)

مسلماوں پر خیرات فرض کی گئی ہے۔ان کا مخیرانہ وصف جس قدر بڑے بڑے شفاخانوں کے قیام اوران کی نگہداشت سے عیاں ہے اور کہیں اس قدر عیاں نہیں۔ان کی رحم لی اور سائنسی معلومات جس طور مشترکہ قوت بنیں پہلے کبھی نہیں بنیں۔

جہاں تک طبیبوں کا تعلق ہے تاریخ میں ان کا نام درخشاں ترین مقام رکھتا ہے۔آج بھی پیرس یونیورسٹی کی دیواروں پر دو مسلمان طبیبوں کی تصویروں کو امتیازی مقام دیا گیا ہے۔ایک رازی ہے جسے لاطینی میں RHAZES کہتے ہیں اور دوسرا بو علی سینا ہے جسے لاطینی میں AVICENNA کہتے ہیں۔

رازی (۸۶۵-۹۲۵ء) نے طب پر ایک سو تیس بڑی اور اٹھائیس چھوٹی کتابیں لکھیں۔مغربی یورپ کے تمام میڈیکل اسکولوں میں پڑھانے کے لیے انہیں لاطینی میں منتقل کیا گیا۔ان دنوں لاطینی علمی مطالعے کی زبان تھی۔رازی بے پناہ نئی سوچ رکھتا اور یہ پہلا طبیب تھا جس نے طبِ اطفال پر کتاب لکھی۔وہ سورج کی روشنی اور تازہ ہوا کے طبّی خواص پر یقین رکھتا تھا۔اس نے ثابت کیا کہ مردار جانور چشمے کا پانی گندا کرتے ہیں۔زنانہ بیماریوں میں مریض عورتوں کا معائنہ کرنے کے لیے وہ آرسی استعمال کرنے کو کہتا ہے۔وہ تو بلکہ نفسیاتی علاج بھی کرتا۔طبّی تاریخ کا ایک نامور مصنّف میکس نیوبرجر رازی کے بارے میں یوں رقمطراز ہے ـــــــ

"رازی نادر و نایاب صلاحیتوں کا مالک تھا،ان تھک مصنّف تھا، اس کی تالیفات بہ کثرت تھیں اور بار بار شائع کی گئیں۔وہ باکمال شخص اور فکر انگیز معلم تھا۔وہ ایک دم چھا جاتا لیکن اس سے بھی بڑا وصف یہ تھا کہ اس میں طبیبانہ بصیرت تھی۔مریض کے بستر پر جا کر اسے نیا پن محسوس ہوتا۔وہ ہر مریض کے معاملے میں اس کی انفرادیت کے بموجب سوجھ بوجھ رکھتا اور علاج معالجہ کرتا۔"

ڈاکٹر کارل سُوڈوف کی رائے میں رازی ہر دور کا عظیم ترین طبیب ہے اور فرینڈ کہتا ہے ـــــــ

"اس نے خون کے خمیر میں چیچک کا سبب دریافت کیا اور البرٹ سے
صدیوں پہلے کئی بیماریوں کے سلسلے میں جراثیم کی پیدائش کا خدشہ ظاہر کیا۔"

بوعلی سینا جو ۹۸۰ء میں بمقام بخارا پیدا ہوا۔ رئیس الحکماء کے نام سے معروف تھا۔ اس کی متعدد دانسائیکلو پیڈیائی تالیفات سے پتا چلتا ہے کہ وہ جملہ علوم متداولہ میں مہارت کاملہ رکھتا تھا لیکن اس نے سب سے زیادہ شعبہ طب میں مغربی فکر پر اثر ڈالا۔ اس نے کئی رسالے لکھے، ایک طبی انسائیکلو پیڈیا لکھی۔ یہ سب کتابیں لاطینی میں منتقل کی گئیں اور مغربی یورپ کی یونیورسٹیوں میں نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہیں۔ ان دنوں پورے یورپ میں لاطینی ہی طبی علوم کا ذریعہ تعلیم تھی۔

شیخ الرئیس بوعلی سینا کے دائرۃ المعارف کا نام "القانون فی الطب" تھا۔ لاطینی میں اس کا نام CANON پڑ گیا۔ درحقیقت یہ ایک یادگار شاہکار تھا۔ اسکے بارے میں فلپ حِطّی لکھتا ہے ———

"القانون اپنے انسائیکلو پیڈیائی مندرجات، مربوط ترتیب اور فلسفیانہ پلان کے باعث اس عہد کے لٹریچر میں جلد ہی ممتاز مقام پا گیا۔ اس نے جالینوس، رازی اور المجوسی کی تالیفات کی جگہ سنبھال لی۔ یہ یورپ کے مدرسوں میں طبی تعلیم کا نصاب بن گیا۔ مغرب میں یہ دائرۃ المعارف بارھویں سے سترھویں صدی تک علم طب میں عظیم گائیڈ کا کام دیتا رہا۔ مشرق وسطی میں اب بھی کہیں کہیں یہ رائج ہے۔"

ڈاکٹر اوسلر کے الفاظ میں یہ ہر دوسری تالیف سے زیادہ مدت تک طب کی انجیل کے طور پر مروج رہی۔ اس عظیم شاہکار کی مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ پندرھویں صدی کے پہلے تیس برس میں یہ سولہ بار چھپی اور سولھویں صدی میں بیس بار۔ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ پہلی بار کریمونہ کے جیرر ڈ نے بارھویں صدی ہی میں القانون کو لاطینی میں منتقل کر لیا تھا تو اس بات کا پتا چل جاتا ہے کہ کیوں سکنڈے نیویا کا ڈاکٹر اوسلر اسے طب کی انجیل کہتا ہے جو طبی لٹریچروں کی ہر کتاب سے زیادہ مدت تک مروج رہی۔ یہ حقیقت ہے کہ بوعلی سینا پانسو سال تک مغرب کے شعبہ طب پر مسلط رہا اور اسکے انکشافات کی قدر و منزلت آج بھی گھٹائی نہیں گئی۔
اس کا عظیم نظریہ اخلاطِ بدنی سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے طبی نقطہ نظر سے اپنے نظریے کی

وضاحت کی۔اسی نے سب سے پہلے تپ دق میں چھوت کی خاصیت معلوم کی، وہ پہلا شخص ہے جس نے طبِ اطفال اور عوارضِ اطفال پر تخصیصی کتاب لکھی۔

وہ تازہ ہوا اور سورج کی روشنی کی معالجاتی خاصیت تسلیم کرتا تھا۔اسی نے ایسے کنویں کے پانی کے خطرات سے متنبہ کیا جو مردار جانوروں کے باعث گندا ہو گیا ہو۔

ابن النفیس ایک اور عظیم مسلمان طبیب تھا جس نے ۱۲۸۸ء میں وفات پائی۔اس نے طبیعیات میں خصوصی مہارت پیدا کی۔دورانِ خون کے بارے ہاروے نے جو نظریہ پیش کیا وہ اس سے صدیوں پہلے ابن النفیس نے صحیح طور پر بیان کیا۔علی ابن العباس ابتدائی دور کا ایک طبیب ہو گزرا ہے جس نے ۹۹۴ء میں وفات پائی۔مغرب میں اسے ہیلی عباس کہتے ہیں۔اس کی عظیم ترین تالیف کتاب المالکی تھی۔اس کے دو حصے تھے۔ایک نظریاتی اور دوسرا عملی۔ ہر حصہ دس دس جلدوں پر مشتمل تھا۔دونوں حصے مل کر شعبہ طب کو پوری طرح محیط کر لیتے۔علی ابن العباس سب سے پہلا غذائیات دان تھا۔اس کی تالیف سے پتا چلتا ہے کہ اس نے بڑی احتیاط سے رُت، موسم، مختلف عمروں، زندگی کی عادتوں اور بیماریوں کے مطابق غذائیں مرتب کی تھیں۔اور بھی کئی ہستیوں کے نام لیے بغیر آگے نہ گزرنا چاہیے خصوصاً ابنِ سلیمان، ابن غزولہ، ابنِ ابی الاعلیٰ (ابنِ ظہر) جسے مغرب میں ایون زور کہتے ہیں۔ابنِ رشد جسے مغرب والے ایوی روز کہتے ہیں، ابن عباس الزہراوی جسے مغرب میں ابوالکیسز کہتے ہیں اور ابن خطیب قابلِ ذکر ہیں۔

ان میں دو ہستیاں تو سرجری (جراحیات) کی دنیا میں نامور ہیں۔ابن عباس الزہراوی دنیائے اسلام کا سب سے بڑا سرجن تھا۔امتیازی خصوصیت کا دعویٰ اس کی کتاب "التعریف لمن اعجازعن التعالیف" پر منحصر ہے جس میں اس نے اپنے دور میں جراحی سے متعلق تمام معلومات کوزے میں بند کر دی ہیں۔یہ بیاض جس میں پتے میں سے پتھری خارج کرنے یا اسے ریزہ ریزہ کر دینے اور عملِ جراحی کے طریقے بیان کیے گئے ہیں لاطینی میں منتقل کی گئی اور صدیوں اسے امتیازی مقام حاصل رہا۔آخری بار آکسفورڈ نے ۱۷۷۸ء میں اسے شائع کیا۔اس میں آلاتِ جراحی کی تصویریں بھی دی گئی تھیں۔درحقیقت اسی نے سرجری کی بنیاد رکھی۔

ایون زور (ابنِ ظہر) ایک اور سرجن ہے جس کی تالیف نے یورپ کی طبّی

درسگاہوں پر بڑا اثر ڈالا۔ علم امراضِ چشم کے شعبے میں چند اور عظیم مسلمانوں کے نام آتے ہیں۔ خلیفہ ابنِ اَبی محسن (۱۲۵۶ء) نے عینیات پر مشہور رسالہ لکھا۔ اس کے معاصر صلاح الدین ابنِ یوسف نے بھی کتاب لکھی۔

فرانسیسی مورخ لیکلیپیر کے بقول مسلمان آنکھ کی ایک سو سے زائد بیماریوں سے آگاہ تھے اور آنکھ پر پہلا کتابچہ یوح النبی موسیٰ ویف نے (۷۷۷۔۷۵۷ شمسی) لکھا۔ وائی۔ سی۔ ینگ اپنی تالیف ''مسلم ورلڈ'' میں کہتا ہے ——

''مسلمانوں نے سب سے زیادہ ترقی بصریات اور علم العین کے شعبے میں کی۔''

عربوں کا علم الادویہ زیادہ تر ہسپانیہ سے یورپ پہنچا اور لطف کی بات یہ ہے کہ چودھویں صدی میں جب یورپ میں طاعون تباہی پھیلا رہی تھی۔ اس وقت غرناطہ کے مسلمان طبیب نے مرض کی وبائی اور چھوت کی کیفیت معلوم کی تھی۔ اس نے بتایا کہ تجربے، تحقیق اور حواس کے شواہد نیز معتبر روئیدادوں سے مرض کی وبائی اور چھوت کی کیفیت مسلم ہے۔ جب صاحبِ تحقیق دیکھتا ہے کہ کس طرح وہ شخص جو مریض سے رابطہ قائم کرے مرض میں گرفتار ہو جاتا ہے تو اس پر مرض کی وبائی اور چھوت کی کیفیت عیاں ہو جاتی ہے۔ جو شخص رابطہ قائم نہیں کرتا محفوظ رہتا ہے اور پھر یہ بھی معلوم کر لیتا ہے کہ کس طور کپڑوں، برتنوں اور کھانوں کے ذریعے مرض پھیلتا ہے۔ مسیحی طبیب اس وقت وباء کو امرِ ربّی سمجھتے تھے اور اس کے آگے بے بس تھے۔

ڈکٹر رابنسن نے اپنی تالیف ''دواء کی کہانی'' میں مسلمانوں کے علم اور مغرب کی جہالت میں اور بھی زیادہ وضاحت سے تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ صفحہ ۱۶۴ پر وہ یہ ریمارک دیتا ہے ——

''غروبِ آفتاب پر یورپ تاریکیوں میں ڈوب گیا، قرطبہ میں چراغ جل اُٹھے۔ یورپ غلیظ تھا، قرطبہ میں ایک ہزار حمام قائم ہوئے۔ یورپ کیڑوں مکوڑوں اور مکھیوں سے بھرا پڑا تھا۔ قرطبہ ہر روز زیر جامہ تبدیل کرتا، یورپ کیچڑ سے لت پت تھا۔ قرطبہ کی گلیاں پختہ تھیں۔ یورپ کے امراء نام تک نہ لکھ سکتے، قرطبہ کے بچے بھی مدرسے جاتے۔ یورپ کے درویش بپتسمہ کے وقت جو دعائیں مانگتے لکھی ہوئی صورت

میں انہیں پڑھ نہ سکتے ۔قرطبہ کے معلموں نے اسکندریہ کے طول وعرض کا
کتب خانہ کھڑا کر دیا۔"

اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ یہ پیارا شہر علم کا گڑھ تھا۔ نامور مورخ لین پول اپنی مشہور کتاب "دی مورز آف سپین" میں جب قرطبہ کی یونیورسٹی کا حال بیان کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے غزل لکھ رہا ہو۔

"قرطبہ کے مقامات اور باغات تو حسین ہیں لیکن اس کا مرکزِ علم ہونا اسے اور تعریف وتوصیف کے قابل بنا دیتا ہے۔ دماغ بھی اتنا ہی خوبصورت ہے جتنا جسم خوبصورت ہے۔ اس کے پروفیسروں اور استادوں نے اسے یورپی ثقافت کا مرکز بنا دیا۔ یورپ کے تمام حصوں سے طالب علم آتے اور اس کے نامور اطبا سے تعلیم پاتے۔ یہاں علم کی ہر شاخ کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جاتا۔ پھر جالینوس کے زمانے کے بعد جو صدیاں بیت گئیں اور ان میں جو کچھ علمی طور پر اضافہ ہوا اندلس کے مسلمان اطبا نے اس سے کہیں زیادہ اضافہ کیا اور ایجادات واختراعات کا انبار لگا یا چنانچہ علم الادویہ کو کہیں زیادہ علمی سرمایہ ملا۔"

اس عہد میں قرطبہ میں پچاس شفاخانے اور نو سو حمام تھے۔ لاریب عوامی علم الصحت کے باب میں مسلمانوں نے خوب کام کیا۔ اس سے بھی ہمیں یہ مثال ملتی ہے کہ قرآن پاک کی تعلیمات سے ترقی کا راستہ تو کیا رُکتا دراصل اس نے علم کے فروغ میں بڑا حصہ لیا ہے۔ قرآنِ پاک میں حفظانِ صحت کا ایسا ضابطہ محفوظ ہے جسے آج کے طبیب من وعن قبول کرتے ہیں۔ کھانے پینے سے متعلق جو اصول ہیں وہ بھی کم پائیدار نہیں۔ یہ جاننا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ سب سے پہلے مسلمانوں نے غذا میں ملاوٹ کرنے کے خلاف احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ خوراک کی فروخت میں جو بدعنوانیاں کی جاتی تھیں ان کا سراغ لگانے کے لیے پولیس کو خاص ہدایات دی گئی تھیں۔ یہ ایسا کام تھا جو آج مغرب میں صحتِ عامہ کے حکام کے فرائض میں بطور معمول شامل ہے۔

فوج کے ہمراہ باقاعدہ طبی عملہ جاتا۔ اس عملے کے قیام میں مسلمان اپنے ہمعصر

عیسائیوں سے پیش پیش تھے۔ موجودہ صلیب احمر کی تنظیم کے مانند اس طبی عملے سے توقع رکھی جاتی کہ اپنے لوگوں کے پہلو بہ پہلو دشمن کے زخمیوں کو بھی مدد دے گا۔ یہ کام قرآنی احکام کی پیروی میں کیا جاتا۔ ''اور خیرات اور پرہیزگاری کے معاملے میں تعاون کرو!'' پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں ایمبولنس سروس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ تاریخ میں ابتدائی غزوات تک میں فوجی نرسوں، جنگی شفاخانوں اور زخمیوں کو لے جانے والی خاص گاڑیوں کی تفصیل کا ریکارڈ ملتا ہے۔

علم الطب کی ہر شاخ میں نیا پن دکھایا اور عملی ثبوت مہیا کیا۔ یہ درست ہے کہ یونانیوں نے طب کی ابتداء کی، رازی اور بوعلی سینا کے کام کا بہت بڑا حصہ یونانی طبیب ـــــ جالینوس کے علم کا مرہونِ منت ہے۔ اگر وہ کوئی ایسی بات مسترد کرتے جس کی بابت جانتے تھے کہ درست ہے تو یہ ان کی حماقت ہوتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عربوں نے تحقیق و تخلیق نہیں کی اور یہ انھی خطوط پر چلتے رہے جو یونانیوں نے کھینچے تھے جیسا کہ ماسبق سے واضح ہوتا ہے انہوں نے علم کی کئی شاخوں میں سب سے پہلے کام کیا۔ علم الطب کے کئی شعبے ان میں شامل ہیں۔

فرانسیسی اسکالر الفریڈ گوئلام کہتا ہے ـــــ

''ہمیں جاننا چاہیے کہ جو مسلمان حکماء پر اور تخیلیٹی کے فقدان اور ذہانت کی پامالی کا الزام دھرتے ہیں انھوں نے کبھی ابنِ رُشد کو پڑھا نہ کبھی الغزالی کو۔ انہوں نے صرف دوم درجے کے فیصلے کی اتباع کی ہے۔ مغربی مسیحیت کے گڑھ میں تعلیمات کا وجود ـــــ خصوصاً ایکوی ناس کی سُما میں ان کا پایا جانا بڑی حد تک اس الزام کی تردید کر دیتا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں نیا پن نہیں تھا، جمود تھا۔''

قرآن اور سائنس علمی دنیا میں مسلمانوں کی فتوحات کا باب تمام کرنے سے پہلے طلبا جو اب تک ابتدائی دور کے مسلمان حکماء کی حقیقی ترقی کے قائل ہو چکے ہوں گے اس امر کو مفید پائیں گے کہ ان کی توجہ قرآن پاک کی دو مشہور آیات کی جانب منعطف کروائی جائے ـــــ

''لاریب زمین اور آسمانوں کی تخلیق، رات اور دن کے ادل بدل اور سمندر میں جو جہاز چلتے ہیں اور جن میں بنی نوع آدم کا بھلا

ہے، اللہ تعالیٰ آسمان سے جو مینہ بھیجتا ہے، ہر نوع کے جاندار جنھیں وہ زمین پر پھیلا دیتا ہے، ہواؤں کا بدلنا اور بادل جو ارض وسماء کے درمیان ان کے غلاموں کی طرح پھرتے ہیں۔ ان سب میں داناؤں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

اور پھر ''کیا وہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ یہ کیسے بنائے گئے؟ اور آسمان کو کہ یہ کس طور اونچا کیا گیا؟ اور پہاڑوں کو یہ کس طرح گاڑ دیے گئے اور زمین کو کہ یہ کیسے بچھائی گئی؟''

''یہ نشانیاں ہیں ان کے لیے جو دانا ہیں۔''

یہ کلیدی لفظ ہیں، اسلام نے سائنسی تحقیق کے لیے جو عظیم تحریک دی ہے ان میں اس کی وضاحت ہے۔ قرآن کبھی نہیں کہتا کہ مسلمان اندھا دھند یا عقیدے کی بنا پر بات مان لے۔ اس کے بجائے ہم پر لازم کیا گیا کہ ہم بغور مرئی کا مطالعہ کریں تاکہ یہ غیر مرئی کے وجود کی سمت ایقان کی رہنمائی کرے۔ وجودِ ظاہری مظہرِ خداوندی ہے اور اس کا عمل خیر کے لیے وہ دانش، طریقِ کار اور موزوں انداز ہے جس سے خدا کی ذات کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ قرآن حکیم یہ بھی کہتا ہے، ''تمہاری رُوحوں میں نشانیاں ہیں، تم دیکھتے کیوں نہیں؟''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور علم سائنس کے مطالعے کو کبھی بھی تعلیماتِ اسلامی کے منافی یا متضاد نہیں سمجھا گیا۔ لاریب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: ''علم (سائنس) کا مطالعہ روزے کی قدر و منزلت رکھتا ہے۔ علم کی تدریس بمنزلہ عبادت ہے۔'' آپ نے یہ بھی فرمایا: ''علم پڑھاؤ، جو علم پڑھاتا ہے، اللہ سے ڈرتا ہے۔ جو علم حاصل کرتا ہے، اللہ کی شان بتاتا ہے۔ جو علم پھیلاتا ہے، خیرات بانٹتا ہے۔ جس کے پاس علم ہو، وہ احترام اور فیض کا پیکر بن جاتا ہے۔ علم خطا اور گناہ سے بچاتا ہے۔ یہ جنت کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ سفر میں ہمارا ساتھی اور دشت میں اعتماد کا موجب ہوتا ہے۔ زندگی کی مسرتوں اور تکلیفوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہمارے دوستوں کے روبرو زیور کا کام دیتا ہے۔''

مغرب نے سائنس نہیں دی۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے ذیل کے اشعار میں سائنس کے شعبے میں مسلمانوں کے کام کا مختصراً ذکر کیا ہے۔

حکمتِ اشیاء فرنگی زاد نیست | اصل اُو جز لذتِ ایجاد نیست
نیک اگر بینی مُسلمان زادہ است | ایں گہر از دست ما اُفتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پر کشاد | علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند | حاصلش افرنگیاں برداشتند
ایں پری از شیشہ اسلاف ماست | باز صیدش کن کہ اُو از قاف ماست

ٹیکنالوجی، صنعتی فنون اور زراعت
میں
اسلام کا حصہ

پچھلے باب میں ہم نے دیکھ لیا کہ اسلام کے پھیلنے سے کئی مغربی ملکوں نے سائنسی علوم کے تمام شعبوں میں نامور مسلمانوں سے استفادہ کیا۔ مغرب نے ان علوم سے عملی طور پر صنعتی فنون اور ٹیکنالوجی میں بھی فائدہ اُٹھایا۔ مسلمانوں کو کاغذ سازی، پارچہ بافی اور دھات کے کام میں جو مہارت حاصل تھی اس سے ان ملکوں کے باشندوں کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا جو مسلمانوں کے زیر نگیں رہے۔ پھر مسلمانوں کی خوشحالی سے یورپی تجارت کو زبردست تحریک ملی۔ اس طرح مغربی دنیا کے کئی حصوں میں معیارِ زندگی بلند ہوا۔

کاغذ سازی مسلمانوں نے آغاز ہی میں جن صنعتوں میں مہارت پیدا کی ان میں کاغذ سازی شامل ہے۔ آٹھویں صدی ہی میں سمرقند میں نہایت نفیس قسم کا تحریری کاغذ بنتا تھا۔ بغداد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۷۹۴ء میں یہاں کاغذ کا پہلا کارخانہ لگا۔ اس کے بعد تمام سرکاری دفاتر میں کاغذ نے چرمی پارچے کی جگہ لے لی۔ مسلمانوں کے دوسرے شہروں میں مختلف قسم کے سفید اور رنگین کاغذوں کے کارخانے کھولے گئے۔ جہاں میں سبزیوں سے کاغذ بنانے اور شام میں بہترین قسم کا کاغذ تیار کرنے کے کارخانے قائم کیے گئے۔ طرابلس کاغذ کی نفیس اقسام کے لیے مشہور تھا، مصر میں کاغذ بنانے کے پہلے کارخانے نویں صدی عیسوی میں کھولے گئے۔ دسویں صدی کی ابتدا میں نہ صرف بغداد بلکہ تمام دنیائے اسلام میں کاغذ نے چرمی پارچے کی جگہ لے لی تھی۔ اب تک کاغذ پر تحریر کیا ہوا قدیم مسودہ احادیث کے موضوع کی وضاحت کے بارے میں

ہے۔ اس کا نام "غریب الحدیث" ہے اور ابو عبید کی تالیف کی تاریخ ۸۳۷ عیسوی خیال کی جاتی ہے۔ اسے ہالینڈ میں دیکھا جاسکتا ہے کہ یہ وہاں لیڈن کی یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

بعد ازاں کاغذ سازی کی صنعت مراکش پہنچی اور وہاں اسلامی مملکتِ ہسپانیہ میں ۱۲۵۰ عیسوی کے لگ بھگ پھیلی۔ ہسپانیہ ہی وہ ملک ہے جس کی وساطت سے یورپ میں کاغذ بنانے کا طریقہ رائج ہوا۔

جے۔ ایچ۔ کریمر لکھتا ہے ——

"تیرھویں صدی میں مسلمانوں کے ذریعے کاغذ سازی کی صنعت یورپ میں آغاز پذیر ہوئی۔ مدتوں کاغذ سازی کی صنعت پر اسلامی مملکت ہسپانیہ کے شہر ویلنیشیا (بلنسیہ [۱]) کے نزدیک اس کی اجارہ داری قائم رہی۔ پھر یہاں سے یہ صنعت کیٹیلونیا (قطلونیہ یا قیطلونیہ) اور فرانس میں پہنچی۔"

یہ امر دلچسپی کا موجب ہوگا کہ ۵۵-۱۴۵۰ء میں طباعت کی ایجاد کے بعد کاغذ کی مقدار بڑھتی چلی گئی۔ کاغذ کی ایجاد کا سہرا سمرقند کے مسلمان کاغذ سازوں کے سر ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ سستا کاغذ ملنے سے امریکہ اور یورپ میں جو تعلیم عام ہوئی تو وہ دراصل مسلمانوں کی دریافت کی مرہونِ منت تھی۔

ازمنہء وسطیٰ کے قرطبہ کی "کتاب منڈی" پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نامور یورپی مورخ یوں رقمطراز ہے ——

"لکھنے والے کاغذ کی مقامی صنعت ہی کی بدولت ایسا ہوسکا ہے کہ اندلس میں کتابوں کے انبار لگے پڑے ہیں۔ یہ اسلام ہی کا کارنامہ ہے جس سے یورپ کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا۔ کاغذ کے بغیر متحرک ٹائپ کی

---

[۱] مشرقی اندلس کا ایک شہر بھی ہے اور صوبہ بھی۔ بنی امیہ کے زمانے میں یہ ایک بڑا علاقہ تھا۔ یہاں ایک جھیل ہے، جسے البحیرہ کہتے ہیں۔ یہ البحیرہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مسلمانوں نے زرعی ضرورت کے لیے آبی ذخیرے اور حوض بنائے۔ ریشم کے کیڑے پالے جاتے۔ اہلِ عرب کے تسلط کے باعث عربی کا اتنا رواج ہوا کہ ان کے بعد بھی اسی زبان میں انجیل پڑھائی جاتی۔ عربی کے الفاظ آج بھی لوگوں کی بول چال میں پائے جاتے ہیں اسلامی تہذیب و تمدن کے اثرات مختلف شکلوں میں ملتے ہیں۔ اندلس کے تمام شہروں میں سب سے روشن یہی شہر تھا۔ اسے خوشبوؤں کا شہر کہتے تھے۔ بڑے بڑے باکمال انسان یہاں ہوئے۔ (مترجم)

چھپائی کامیاب ہوتی نہ کاغذ اور طباعت کے بغیر یورپ میں عام تعلیم رائج ہو سکتی۔"

اس تاریخی حقیقت کا لسانیاتی ثبوت یہ ہے کہ انگریزی کا لفظ "رِم" [1] قدیم فرانسیسی لفظ RAYME سے ماخوذ ہے۔ یہ فرانسیسی لفظ ہسپانوی لفظ "ریسمیا" سے لیا گیا ہے اور یہ لفظ عربی لفظ رزمہ سے ماخوذ ہے۔

ہسپانیہ میں اسلامی صنعتی مرکز عہد اسلام میں ہسپانیہ یورپ کا سب سے مالدار، خوشحال اور گنجان آباد ملک تھا۔ اس کا دارالحکومت اپنے تیرہ سو پارچہ بافوں پر نازاں تھا۔ اُون اور ریشم کے کپڑے قرطبہ، مالقہ [2] اور المیریا (المریہ) [3] میں تیار کیے جاتے تھے۔ المیریا ہی میں کانسی کے برتن اور شیشہ بنایا جاتا تھا۔ ویلنیشیا میں پیڑنا کے مقام پر برتن بنتے تھے۔ یہ تو بلکہ برتنوں کا گھر تھا۔ جین اور الغرب سونے اور چاندی کی کانوں کے لیے مشہور تھے۔ اسی طرح قرطبہ سیسے کے لیے مشہور تھا۔ یہ دھاتیں طلیطلہ کی ایک بڑی صنعت میں کھپتی تھیں ——— یہاں نہایت نفیس قسم کی منقش تلواریں بنتی تھیں۔

پہلے دمشق نے شہرت پائی پھر اسی طرح طلیطلہ نے تلواروں کی صناعی اور دلفریبی کے باعث نام پایا۔ یہ تلواریں فولاد سے تیار کی جاتیں۔ ان میں سونے اور چاندی سے پھول بوٹے بنائے جاتے۔ یہ فن پہلے دمشق میں رائج ہوا اور نام کی رعایت سے دمشقین کہلایا۔

یہی ہنرمندی دھات کے کام میں دکھائی گئی جس سے جواہرات کی صنعت کو فروغ ملا۔ اس کے لیے مالقہ سے قیمتی یاقوت حاصل کیے جاتے۔ سنتے ہیں کہ بازوبندوں، بروچوں اور ہاروں کے علاوہ سنار شجر طلائی ایسے غضب کے نازک زیور بناتے تھے۔ پھر مسلمان ریاضی دانوں نے جو گھڑیاں بنائیں ان کے لیے نہایت خوشنما خانے اور خول تیار کرتے تھے۔

1۔ REAM کاغذ کا گٹھہ جس میں بالعموم پانسو تختے ہوتے ہیں۔

2۔ MALAGA جنوبی اندلس کے ایک صوبے اور دارالحکومت کا نام۔ رومن نام "مالاکا" تھا۔ مالقہ میں نمک کی ایک جھیل ہے۔ یہاں لوہے اور سیسے کی کانیں ہیں۔ ۷۱۱ء میں مسلمانوں نے فتح کیا۔ اسے بڑا شہر اور بندرگاہ بنا دیا۔ یہاں کی شراب بہت مشہور تھی۔ نہایت نفیس اور قیمتی کپڑا بنایا جاتا جس کی قیمت بعض اوقات ہزاروں درہم ہوتی۔ (مترجم)

3۔ جنوبی اندلس کا ایک شہر۔ یہاں پہاڑوں کے کئی سلسلے اور کئی وادیاں ہیں۔ قدرتی ذخائر بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ تانبہ، لوہا، پارہ، جست، گندھک کی بجری کانیں ملتی ہیں۔ سنگ مرمر بھی نکلتا ہے۔ پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔ یہاں مسلمانوں نے جہاز سازی کے کارخانے اور اسلحہ خانے بنائے۔ ریشم کے آٹھ سو کارخانے تھے۔ پھلواڑیاں، باغ اور پن چکیاں تھیں۔ (مترجم)

اسی طرح ہم چمڑے کی صنعت میں مسلمانوں کی کاریگری اور ڈیزائن کی خوبی اور اعلیٰ معیار دیکھ سکتے ہیں۔ ہسپانیہ کے کاریگروں نے مراکش سے چمڑے کی "دباغت اور اس میں نقش ابھارنے کا کام سیکھا۔ ان آسائشی صنعتوں کے پہلو بہ پہلو ہسپانیہ میں عطر سازی کی صنعت نے بھی بہت زیادہ فروغ پایا تھا۔

جڑاؤ کام طلیطلہ کے کاریگروں کا نقش کنی کا فن کئی دوسری شکلوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ بہتیرے لوگوں کا خیال ہے کہ قیمتی پتھر جڑنے کا فن اطالیہ میں آغاز پذیر ہوا لیکن درحقیقت اس کی تیکنیک مسلمانوں کو کئی صدی پہلے سے معلوم تھی۔ فلورنس میں تو اس کا رواج ۱۵۱۰ شمسی میں ہوا۔

یورپ میں مسلمانوں کی دستکاریوں کا فروغ پارچہ بافی مسلمانوں کی سب سے بڑی دستکاریوں میں سے ایک تھی۔ جے۔ ایچ۔ کریمر لکھتا ہے ــــــ

"یہ مسلمان کاریگر ہی تھے جن کے سر فرانس اور اطالیہ میں پارچہ سازی کی صنعتیں قائم کرنے کا سہرا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مسلمانوں کی خوشحالی کے طفیل صنعتی فنون کو عروج ملا۔ اس دَور میں مصنوعات کا رنگ روپ جمالیاتی اعتبار سے بے نظیر تھا۔

یہ انوکھی حقیقت قابلِ توجہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں جرمنی کے شہنشاہ کے ملبوسات پر عربی عبارت لکھی ہوتی۔"

ایک اور یورپین مستشرق بتاتا ہے کہ مسلمانوں کے بُنے ہوئے کپڑے بے حد خوشنما ہوتے تھے ــــــ اس قدر خوشنما ہوتے تھے کہ جنگِ صلیب و ہلال میں لڑنے والے سپاہی اپنے دشمنوں اور حریفوں کے بُنے ہوئے کپڑوں کو ترجیح دیتے اور انہیں پہنتے۔

اسلامی دور کے صنعتی فن و ہنر نے نفاست میں اعلیٰ پائے کا وصف پالیا تھا۔ قالین بافی نے خصوصیت سے ترقی کی۔ مصر اور شام میں مسلمانوں کی کھڈیوں سے ریشم کے جو آرائشی دھاگے تیار کئے جاتے یورپ میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوتی۔ جنگِ صلیب و ہلال میں حصہ لینے والے مسیحی سپاہی اور دیگر اہلِ مغرب تمام کپڑوں پر انہیں ترجیح دیتے اور مسیحی اولیاء کے تبرکات ان میں لپیٹ رکھتے۔

عہدِ اسلام میں کپڑے کی صنعت درحقیقت بہت وسیع پیمانے پر مروج تھی۔ بارھویں

صدی میں بغداد میں ایک دھاری دار دھاگہ بنتا تھا جسے اقابی کہتے تھے۔ ہسپانیہ میں اس کی نقل کی گئی۔ یہی اطالیہ میں مقبول ہوا جہاں اس کا تجارتی نام "تافی" رکھا گیا۔ طسطائی اور السوسن جستان میں کئی ایسے کارخانے قائم کیے گئے جن میں سونے کے تاروں کی کشیدہ کاری والا کپڑا تیار کیا جاتا۔ انہی کارخانوں میں سے جنگِ صلیب وہلال کے مسیحی لشکریوں کے لیے ملبوسات آتے۔

اگرچہ عربوں کی کپڑے کی تجارت بہت وسیع تھی پھر بھی مغرب کی منڈیوں کی روز افزوں مانگ (مسلمانوں کے) کارخانے پوری نہ کر پاتے چنانچہ دستی کھڈیوں اور گھریلو صنعت سے کارخانوں کی رسد پوری کی جاتی۔ یہی حال قالینوں اور نفیس پھلکاری کا تھا۔ ہر طول وعرض اور ہر قیمت کے قالین برآمد کیے جاتے۔ گراں ترین قالینوں میں سے ایک کی قیمت ایک کروڑ تیس لاکھ ڈالر معلوم ہوئی ہے۔

کپڑے اور قالین کی صنعتوں میں بھی رنگ روپ اور ہنرمندی کا وہی اعلیٰ معیار پایا جاتا جو مسلمانوں کی دوسری دستکاریوں میں پایا جاتا۔ ایک معروف یورپی مستشرق کے الفاظ میں مصنوعات کے میدان میں انھوں (مسلمانوں) نے انواع واقسام، ڈیزائن کی دلفریبی، ہنرمندی اور مہارت میں تمام دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ تمام دھاتوں ـــــــ سونے، چاندی، تانبے، کانسی، لوہے اور فولاد پر کام کر لیتے۔ پارچہ بافی کے دھاگوں کی صنعت میں انہیں کبھی کسی نے مات نہیں کیا۔ وہ نفیس ترین قسم کا شیشہ اور برتن بناتے۔ رنگ سازی اور کاغذ سازی کے اسرار ورموز سے آگاہ تھے۔ انہیں چمڑہ بنانے کے کئی کئی طریقے آتے تھے اور یورپ بھر میں ان کے کام کا شہرہ تھا۔

محولہ بالا شیشے کی صنعت کا مرکز دمشق تھا جہاں اعلیٰ درجے کے بلوری ظروف تیار ہوتے۔ افسوس تیمور نے اسے برباد کیا۔ دمشق میں مسجدوں کے لیے خاص چراغ تیار کیے جاتے اور پھر دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں بھیجے جاتے۔ دمشق ہی وہ شہر تھا جہاں سے شیشے کی صنعت وینس پہنچی۔ مسلمانوں ہی نے اطالوی کاریگروں کو کام کے اسرار ورموز بتائے۔

مسلمانوں نے یورپ میں صرف نئی صنعتیں ہی قائم نہیں کیں بلکہ وہاں سے وہ ایسی خام اشیاء بھی لے لیتے جو ان کے اپنے ملکوں میں ناپید تھیں۔ مثلاً عنبر بحیرۂ بالٹک کے ساحل سے اور پوستینیں روس سے منگواتے۔ بغداد ایسے شہروں کی منڈیوں میں جس انداز سے یورپ کے انتہائی شمالی علاقوں کی خام اشیاء پہنچیں اس پر پروفیسر ہَیل نے خاص توجہ دی ہے۔ خام اشیاء کے

عوض عرب ان علاقوں کو اپنی مصنوعات بھیجتے۔

پروفیسر ہٹیل کے بقول ـــــــ

"عرب ان ملکوں (روس، شمالی یورپ) کو بنی ہوئی چیزیں، جواہرات، دھات کی آرسیاں، بلوری منکے، گرم مصالحہ اور مچھلی مار بلم مہیا کرتے۔ درآمد ـــــــ اور برآمد پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے سے اسلامی سلطنت کی تہذیبی برتری عیاں ہوتی ہے۔ شمال کو اس کے خام مال کے عوض اسلامی سلطنت مصنوعات بھیجتی۔"

مسلمانوں کی برآمدی اور بین الاقوامی تجارت

ازمنہ وسطی میں عرب بین الاقوامی تجارت پر چھائے رہے۔ ہر نئی فتح مسلمانوں کی دستکاریوں اور صنعتوں کے لیے نئی نئی منڈیاں پیدا کرتی۔ سولھویں صدی میں بغداد، بخارا اور سمرقند ایسے اسلامی شہر عالمی میلوں کے مرکز رہے۔ یہ شہر تین براعظموں کے تجارتی راستوں پر مسلط تھے۔

سمندر پر مسلمانوں کو جو تسلط حاصل تھا اور جس کا ذکر اسی کتاب میں دوسری جگہ کیا گیا ہے اس کے باعث عرب تاجروں کے لیے چھبیس ۲۶ ہزار بحری جہاز رکھنا ممکن ہوا جن کے ذریعے چین اور برطانیہ ایسے دور دراز ملکوں کو مال بھیجا جاتا۔ عرب تاجر ہندوستان، جاوا، سماٹرا، لنکا، افریقہ اور یورپ تک سے تجارت کرتے۔ مسلمان تاجر عام استعمال اور آرائش کی متعدد اشیاء ان سے حاصل کرتے اور یورپ کو بھیج دیتے۔ ان کے پہلو بہ پہلو اسلامی ممالک کی مصنوعات بھی برآمد کرتے۔ ان میں ریشمی کپڑے، اطلس و کمخواب، پھلکاریاں، زیورارت، جواہرات، نمدے، غالیچے، صوفے، میزیں اور دوسرا فرنیچر، چراغ، مطبخ کے ظروف، قینچیاں، سوئیاں، بلوری برتن اور صابن تک شامل تھے۔

یورپ کی متعدد زبانوں کی تجارتی ڈائریکٹریوں میں اب تک بہ تعداد کثیر عربی لفظ موجود ہیں اور اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ مسلمانوں نے پہلی بار یورپی ملکوں کو ان اشیاء سے متعارف کیا۔ لفظ ٹیرف TARIFF جو اس قدر مستعمل ہے عربی سے ماخوذ ہے جہاں اس کے معنی "اعلان" کے ہیں۔

عربوں نے جس اسلوب سے منافع میں شرکت کی اس کے متعلق وان کریمر لکھتا ہے ـــــــ

"دنیائے اسلام نے تقریباً پانسو سال تک مادی ثقافت کا جو گراں بہا سرمایہ جمع کیا وہ یورپ چلا گیا۔ یہ سرمایہ صرف چین، ہندوستان اور افریقہ کی دولت پر مشتمل نہ تھا جسے اسلام کی مہم جویانہ اسپرٹ کے طفیل دور

اُفتادہ ملکوں سے لایا گیا بلکہ سب سے پہلی نمائندگی تو اسلامی ملکوں کو حاصل ہے۔ انھی نے قدرتی دولت اور صنعتی پیداوار پیش کی۔"

پھر ایک بار ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان تہذیب کا تحفظ بھی کرتے ہیں اور آغاز بھی۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مغرب کو اپنی ذہانت اور عملی کمال کے ثمر سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت دی۔ انہوں نے علمی معاملات میں بھی یہی رویہ اختیار کیا۔

نیا معیارِ زندگی فلپ حِتّی نے History of the Arbas میں قرطبہ کا جو حال بیان کیا ہے اس سے بہتر انداز سے کہیں بھی زندگی کی ان لطافتوں اور آسائشوں کا تذکرہ نہیں ملتا جن میں مسلمانوں کا حصہ تھا۔ حتّی لکھتا ہے ——

"عبدالرحمان ثالث اور اس کے جانشین الحکم ثانی (۹۶۱ سے ۹۷۶ شمسی تک) نیز الحاجب المنصور (۹۷۷ سے ۱۰۰۲ شمسی تک) کی آمریت کا عہد مغرب میں دور دور تک اسلامی تسلط کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس دور میں بنی امیہ کا دارالخلافہ یورپ کے مہذب ترین شہر کا ہم پایہ نکلا۔ قسطنطنیہ اور بغداد کے پہلو بہ پہلو یہ دنیا کے تین تہذیبی مرکزوں میں سے ایک تھا۔ دارالخلافہ میں تیرہ ہزار ایک سو گھر تھے، اکیس مضافات تھے، ستر کتب خانے، کتابوں کی کئی دکانیں تھیں۔ کئی مسجدیں اور محل تھے۔ انھی سے اس نے بین الاقوامی شہرت پائی اور سیاحوں کو مرعوب کیا اور ان سے خراجِ تحسین لیا۔ یہاں میلوں پختہ گلی کوچے تھے جنھیں کنارے کے مکانوں کی روشنیاں منور رکھتیں جبکہ اس کے سات سو سال بعد تک لندن کے کسی گلی کوچے کو روشن کرنے کے لیے ایک بھی چراغ نہ تھا، صدیوں بعد پیرس کا یہ حال تھا کہ جس دن بارش ہوتی اس دن دہلیز پر قدم دھرتے تو ٹخنوں ٹخنوں کیچڑ میں دھنس جاتے۔ اسی زمانے میں آکسفورڈ یونیورسٹی غسل کو کافروں کی رسم سمجھتی۔ درآنحالیکہ قرطبہ کے سائنسدانوں کی نسلیں شاندار حماموں میں غسل کا لطف اٹھا رہی تھیں ...... جب کبھی لیون[1] اَبنرہ[2]

---

[1] لیون شمالی اندلس کا صوبہ اور صدر مقام۔ رومنوں کے عہد میں یہاں سے سونا نکلتا تھا۔ اسلامی دور کے بعد سب سے پہلی مسیحی حکومت یہیں قائم ہوئی۔ یہ شہر فصیل دار تھا۔ ۷۱۲ء میں مسلمان مسلط ہوئے۔ اہلِ عرب اس لیونش بھی کہتے تھے۔ (مترجم)

[2] موجودہ شمالی اندلس کا صوبہ۔ یہاں سے فرانس میں جانے کو پہاڑی درے ہیں۔ زرخیز علاقہ ہے۔ (مترجم)

اور برشلونہ [1] (بارسلونا) کے حکمرانوں کو جراح، معمار، ماہر موسیقی یا خیاط کی ضرورت پڑتی تو قرطبہ سے رجوع کرتے۔ اسلامی دارلحکومت کی شہرت دور افتادہ جرمنی تک پہنچی جہاں ایک راہبہ نے اُسے "دنیا کا نگینہ" کہہ کر یاد کیا۔ [2]

زراعت کے شعبے میں مسلمانوں کا حصہ مسلمانوں نے جس انداز سے زراعت کی اسے لازماً عملی سائنسوں میں جگہ دینی پڑے گی۔ جن ملکوں میں مسلمانوں کی حکمرانی تھی ان میں بنیادی طور سے اس کا انحصار پانی پر تھا۔ یہاں مسلمان ریاضی دانوں اور طبیعیات کے ماہروں کی معلومات کو عملی مسائل میں برتا جاتا تھا۔ مثلاً ان کی مدد سے پانی کی سطح اونچی کی جاتی تھی اور اس کی تقسیم کا مسئلہ حل کیا جاتا تھا جس سے مفلس تر لوگوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ مسلمان نباتیات دانوں نے بھی فصل کی اصلاح میں مدد دی۔ چنانچہ جہاں پہلے ریگستان تھا وہاں اب فصلیں اگائی جانے لگیں۔ اس بات کو ملحوظ رکھنا اسلام کی روشن خیالی کی پالیسی ہی کا حصہ تھا کہ مذہب وملت کی تمیز سے قطع نظر کھیت کے مزدوروں کو دل کھول کر مدد دی جاتی اور ان کی حفاظت بھی کی جاتی۔

نئی مملکتوں کے عمال (گورنر) ہمیشہ پہلے آبپاشی کے وسیلے کو اپنی تحویل میں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں زمینی ساخت اور موسم نے اجازت دی وہاں وہاں ہزاروں پون چکیاں اور پن چکیاں لگائی گئیں [3] سینکڑوں نئی نہریں کھودی گئیں اور اتنی ہی پرانی نہریں از سرِ نو جاری کی گئیں۔ عرب جغرافیہ دانوں نے اکثر بتایا کہ خلیفہ دریا نکال رہا یا جاری کر رہا ہے۔ [4] درحقیقت یہ اشارہ نئی نہر بنانے یا پرانی نہر صاف کرنے کی جانب ہوتا۔ آبپاشی سے جو نتیجہ برآمد ہوا اسکی مثال

---

[1] برشلونہ کا پرانا نام برشیونہ (رومن نام بارسینونہ) ہے۔ شمال مشرقی علاقے کا صدر مقام جو بحر متوسط کے ساحل پر واقع ہے۔ اس پر کبھی مسلمان اور کبھی فرانسیسی قابض ہوئے۔ بالآخر یہ مسیحیوں کا شہر ہو کر رہ گیا اور اندلس کے دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی مسلمان ختم ہوئے۔ (مترجم)

[2] حطی کی "ہسٹری آف دی عربز" صفحات ۲۷۔۵۲۶

[3] پن چکی کے پنکھ پر پانی کا دھارا زور سے گرتا ہے تو وہ حرکت میں آتی ہے۔ چکی آٹا پیستی ہے اور پانی کا دھارا کھیت میں چلا جاتا ہے۔ پون چکی کے پنکھ ہوا سے چلتے ہیں اور یہ پانی نکالنے کے کام آتی ہے۔ مغربی پاکستان میں مکران کے ساحلوں پر تجربۃً پون چکیاں لگائی جا رہی ہیں (مترجم)

[4] مختلف طریقوں سے پانی کی تسخیر ــــ پانی کے مصنوعی ذخیرے بنانے، جمال کی آبپاشی کا اہتمام کرنے اور نہریں کھودنے کی تحریک کے لیے قرآن میں نہایت واضح اشارات موجود ہیں۔ یہ دو آیات نسبتاً زیادہ معروف ہیں۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (ہم نے ہر جاندار شے پانی سے بنائی) اور سَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ (اس نے تمھارے لیے دریا مسخر کیے)۔ مسلمانوں نے اپنے عہد اقتدار میں صف اول کے آبیات دان (ہائیڈرولوجسٹ) ماہرین علم آب رواں (ہائیڈرالکس) اور شعبہ آب کے انجینئر پیدا کیے۔

خراسان، شرقِ فردان اور بجستان سے ملتی ہے جو مصر اور عراق ایسے دنیا کے زرخیز ترین خطوں سے مقابلہ کرنے لگے۔ بخارا اور سمرقند کے درمیان زمین پر حقیقی جنت اُتر آئی تھی ـــــــ وادالسجو وادور انہارعبداللہ سے سیراب ہونے والے باغات قابلِ دید تھے۔ یہ نہریں بصرہ کے جنوب مشرق تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ادھر دمشق کے اردگرد کا حصہ باغ کی صورت میں نمودار ہوا تھا۔ ان باغات میں مختلف قسم کے پھل، پھول اور سبزیاں اُگتی تھیں۔ ان میں کھجوریں، سیب، زیتون، آڑو، ناشپاتیاں، کشمش، لیموں، سنگترے، انجیریں، انگور، مولیاں، انار اور گلاب شامل ہیں۔ فارس اور الاہواز میں گنا پیدا ہوتا تھا۔ شکر صاف کرنے کے کام نے پھولتی پھلتی ہوئی صنعت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ خصوصاً جنگ صلیب و ہلال کے بعد جب یورپ میں اس کا رواج ہوا۔ مسلمانوں نے نہروں کا ایسا عمدہ جال بچھایا کہ جنگ عالمگیر سے پہلے جب حکومت ترکیہ نے ولیم ولکاکس کو''العراق'' کے مسائلِ آبپاشی کے مطالعے پر متعین کیا تو اسکی رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ نئی نہریں تعمیر کرنے کی بجائے پرانی نہریں صاف کی جائیں۔

عربوں نے ہسپانیہ فتح کیا تو کئی ہزار ایکڑ بے آب ویرانے نہروں سے سیراب ہونے لگے۔ ایسا قانونی ضابطہ وضع کیا گیا کہ کاشتکاروں کو منصفانہ طریقے سے پانی مل سکتا۔ جب تک زمین کو سیراب کرنے کی ضرورت نہ پڑتی نہر کے پھاٹک بند رہتے۔ پانی کی ضرورت خاص خاص موسموں ہی میں پڑتی۔ پھر ایسا نظام بھی قائم تھا جس کے مطابق فالتو پانی اصل نہر میں لوٹا دیا جاتا اور کسی دوسرے وقت کام میں لایا جاتا۔

سائفن کے ذریعے پانی گزارنے کا اصول مسلمانوں کو معلوم تھا۔ ان کے تین سو سال بعد فرانس نے اُسے دوبارہ دریافت کیا اور وسیع پیمانے پر آبِ رواں کے نظام میں استعمال کیا۔ مارولا میں زمین تلے میل بھر لمبی اور تیس فٹ کے قطر کی آبی گزرگاہ بنائی گئی جس کے ذریعے ارگئی کا میدان سیراب کیا جاتا۔ ایک ہزار سال گزرنے پر بھی یہ تعمیر اچھی حالت میں موجود ہے۔

ابتدائی دور کے مسلمان کاشتکار کھاد کی اہمیت سمجھتے تھے اور وسیع پیمانے پر زمین کو کھاد دیتے تھے۔ تھیچر اور سوِل اپنی تالیف ''جنرل ہسٹری آف یورپ'' میں لکھتے ہیں ـــــــ

''وہ سائنسی طریقے سے کھیتی باڑی کرتے تھے اور آبپاشی کا عمدہ نظام رکھتے

تھے، کھاد کی قدر و منزلت جانتے اور زمین کے کوائف مدّ نظر رکھ کر فصل اُگاتے تھے۔"

مسلمان نباتیات دانوں نے پودوں میں اس کی حرکات سے آگاہ ہونے کے بعد بیج بونے کے لیے بہترین وقت کا مطالعہ کیا، پیوند کاری کے ذریعے انھوں نے بیج کی اصلاح بھی کی۔ انھیں پیوند کاری کے آٹھ طریقے معلوم تھے۔ تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں زراعتی مدرسے تھے۔ یہاں جو معلومات حاصل ہوتیں کاشتکاروں تک پہنچادی جاتیں۔ حیاتیات و نباتیات کے ماہر اس امر سے آگاہ تھے کہ چھوٹے چھوٹے پودوں کو دھوپ کے مضر اثرات اور پھلوں کو نقصان دہ کیڑوں کے حملے سے کیسے بچایا جاسکتا ہے۔ تھیچر اور سوِل مسلمان زراعت دانوں کی تعریف کیے جارہے ہیں ـــــ

"باغبانی میں مسلمانوں نے کمال کر دکھایا۔ اُنھیں پیوند کاری آتی تھی، نیز وہ پھولوں اور پھلوں کی نئی قسمیں اُگانا جانتے تھے۔ انھوں نے مغرب میں مشرق کے کتنے ہی پیڑ پودوں کی کاشت کا آغاز کیا، زراعت پر سائنسی کتابچے لکھے۔"

مغرب میں جن اجناس کی کاشت شروع ہوئی، زیتون ان میں سے ایک ہے جس کی فصل ہسپانیہ میں اُگائی گئی۔ مدّتوں یہاں روغنِ زیتون کی صنعت وسیع پیمانے پر جاری رہی۔ جان ولیم ڈریپر لکھتا ہے: "انھوں (مسلمانوں) نے نہ صرف پودے اُگانے پر بلکہ نئے نئے پودے اُگانے اور اسی کے پہلو بہ پہلو مویشی، بھیڑ بکریاں اور گھوڑے پالنے پر توجہ صرف کی۔ چاول، شکر اور کپاس ایسی بڑی بڑی اجناس کے لیے ہم ان کے مرہونِ منت ہیں۔ جیسا کہ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں انھوں نے باغ کے تمام پھل نیز پالک اور زعفران ایسے کم اہم پودے بھی کاشت کیے۔ ریشم تیار کرنے کے لیے ہسپانیہ انھی کا ممنون ہے۔"

اسلامی ہسپانیہ کی زرعی پیداوار گھریلو ضرورت سے بڑھ کر تھی۔ اشبیلیہ اس کی بڑی بندرگاہوں میں سے تھی۔ یہاں سے روغن زیتون اور کپاس دساور بھیجی جاتی۔ مالقہ[1] سے بھاری مقدار میں زعفران، انجیر اور شکر درآمد کی جاتی۔

---

[1] مالقہ (رومن نام مالاکا) اسی نام کے صوبے کا صدر مقام تھا۔ قبل مسیح قرطاجنہ CARTHAGE کے دور ہی میں یہ بہت بڑا شہر تھا۔ مسلمانوں نے اسے ۷۱۱ء میں فتح کیا۔ انھوں نے اسے اور بھی بڑا شہر اور عمدہ بندرگاہ بنا دیا۔ بڑی گہما گہمی رہتی۔ گلی کوچے اور بازار پُر رونق تھے۔ یہاں سے بہترین انجیر برآمد کی جاتی۔ یہ پھل ہندوستان تک پہنچتا۔ وادی المدینہ (شہر کی ندی) ایک جانب بہتی۔ شریف ادریسی اور ابن بطوطہ نے اس شہر کا ذکر کیا ہے۔ رنگین کپڑے اور سنہری رنگ کے مٹی کے برتن بنانے کی صنعت کو بڑا فروغ ملا۔ یہاں کی عظیم الشان مسجد کو کھنڈر اور اس پر گرجا بنایا گیا ہے۔ اسلامی عہد کے چند آثار عیسائی حکمرانوں کے ستم کا شکار ہونے سے بچ رہے ہیں (مترجم)

جوزف ہیل اپنی تالیف ''عربوں کی تہذیب [1]'' میں ہسپانیہ میں مسلمانوں کی زرعی ترقی کے بارے میں یوں رطب اللسان ہے ———

''مئی ۷۵۲ء عیسوی کے وسط میں، مشرق سے الگ، بنوامیہ نے ہسپانیہ پر اندلس [2] کے شہزادگان کی مانند تسلط جمایا۔ مسلمان ۲۸۰ سال تک اندلس پر حکمران رہے۔ میں ان کا عہد اسلامی کلچر کی گل افشانی کا دور تھا۔ ملک کو غضب کا اقتصادی فروغ حاصل ہوا۔ آبپاشی اور نہری تعمیرات کی بدولت چاول، گنے، کھجور، ناشپاتی اور انار ایسی مشرقی اجناس پیدا ہونے لگیں اور یوں دولت میں اضافہ ہوا۔ افریقہ اور ایشیا سے ان کی تجارت پروان چڑھی۔ ان کی ریشم کی صنعت میں ایک لاکھ تیس ہزار آدمی مصروف کار رہتے۔''

ہسپانیہ کی زراعت پر مسلمانوں کے اثر کا اندازہ ایک اور طرح بھی کیا جاسکتا ہے اور وہ یوں کہ موروں [3] کے جانے پر غرناطہ جس تباہی اور بربادی کا شکار ہوا اور اس کا مقابلہ پہلے کے خوشحالی کے دور سے کریں۔ مؤرخ کونڈ لکھتا ہے ———

''اور اس طور ہسپانیہ کی سرزمین سے وہ جری، دانشور اور روشن خیال لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے جنھوں نے عزم اور محنت سے ایسی سرزمین میں جان ڈال دی جسے اپنے کھوکھلے غرور کے باعث گوتھوں [4] نے بنجر کر کے رکھ دیا تھا۔ موروں نے اس سرزمین کو خوشحال اور بہتات

---

[1] ARAB CIVILIZATION

[2] ماضی میں جزیرہ نمائے ہسپانیہ میں پرتگال کی مملکت بھی شامل تھی جسے یونانی آئی بیریا کہتے۔ رومنوں نے اسے ہسپانیہ کا نام دیا۔ عربوں نے اسے اندلس کہا۔ بعض مؤرخ' سے عربی اور بعض عجمی لفظ قرار دیتے ہیں۔ بعض نے اسے نوح علیہ السلام کے نسب سے اندلس بن طوبال سے منسوب کیا۔ قیاس ہے کہ ایک وحشی قوم وندال یا ''وندالس'' سے اس کا تعلق ہے۔ اسی قوم کے نام پر اس اقلیم کا نام ''نام ہوندالیکیہ'' یا ''وندیسیہ'' پڑ گیا جس سے اندلس کا نام وضع ہوا (مترجم)

[3] مخلوط بربری اور عربی نسل کے مسلمان جو افریقہ کے شمال مغرب کی ریاستوں یا مراکش میں رہتے ہیں۔ یہ ہسپانیہ کے فاتح بھی تھے۔ (مترجم)

[4] جرمنی کی ایک غیر مہذب قوم جس نے تیسری اور پانچویں صدی میں اطالیہ، فرانس اور ہسپانیہ میں حکومتیں قائم کیں اور آثار تمدن برباد کیے۔ (مترجم)

سے آشنا کیا۔ یہاں بے شمار نہریں بنائیں۔ خوشی اور تباہی، دونوں ہی حالتوں میں ان کا قابلِ قدر حوصلہ یکساں رہتا۔ خلیفہ کے تخت کے لیے یہ بہت بڑا دفاعی حصار تھے۔ ان کی ذہانت، ترقی اور مطالعے نے شہروں میں ہمیشہ تک رہنے والے مینار قائم کیے جن کی شعاعیں یورپ میں پہنچیں۔ ان میں مطالعے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ان کی ذی شان اسپرٹ نے تمام اعمال کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ شان و شوکت اور عالی ظرفی کے اعتبار سے یہ رنگ بے نظیر تھا۔ آنے والے زمانے کی نظر میں یہ غیر معمولی عظمت اور بہادری سحر آفریں روپ سے مزین رہی۔"

لین پون اپنی تالیف "ہسٹری آف دی مورز ان سپین" میں اس طریق کار پر تبصرہ کرتا ہے جس سے مسلمانوں کی انجینئری کی مہارت نے ملک میں زراعت کی ترقی میں مدد دی اور لین پول غرناطہ کے سقوط کے بعد اسی ملک کی مایوس کن تصویر یوں کھینچتا ہے ——————

"غرناطہ فتح ہوا تو اس کے ساتھ ہی ہسپانیہ کی عظمت بھی زوال کا شکار ہوئی۔ کچھ مدت تک تو موروں کی شان و شوکت کی پرچھائیاں ہسپانیہ کی تاریخ پر ہالہ نور بنی رہیں لیکن پھر شکست و ریخت کی ہیبت چھا گئی۔ ہسپانیہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کلیسائی عدالتوں کے وحشیانہ دور اور جہالت کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ وہی سرزمین جہاں کبھی سائنس کو اقتدار حاصل تھا اب جہالت اور گمنامی کے سوا اور کسی شے سے اس کی یاد باقی نہ رہی۔ طلیطلہ اور المریہ[1] کے فنون بے معنی ہو کر رہ گئے۔ زمین موروں کے ماہرانہ نظام

---

[1] المریہ (ALMERIA) آجکل ایک صوبہ ہے۔ مسلمانوں کے آخری دور میں غرناطہ کا مشرقی حصہ تھا۔ اس میں سے تین دریا گزرتے ہیں۔ سمندر کے قریب کی گھاٹیوں میں زراعت خوب ہوتی ہے۔ لیموں اور بادام کے درخت بہ کثرت ملتے ہیں۔ یہاں لوہے، تانبے، پارے، جست اور گندھک کی کانیں بھی بہت تھیں۔ جبل الشیرا سے سنگ مرمر بھی نکلتا تھا۔ یہ شہر نرم و شاداب زمین پر آباد ہوا۔ قلعہ خیران کے چار مینار صدہا سال گزرنے پر بھی بڑی شان سے اپنا سر بلند کیے ہوئے ہیں۔ مضبوط شہر پناہ، برجوں اور مورچوں سے شہر کو مستحکم و محفوظ کیا گیا۔ طارق کی فتوحات کے عہد میں پہلی صدی ہجری کے آخر میں مسلمانوں نے اسے فتح کیا۔ یہاں کی ترقی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف ریشمی پارچات کے آٹھ سو کارخانے تھے۔ دریائے المریہ پر پن چکیاں نصب کی گئیں۔ بندرگاہ پر اسکندریہ اور شام تک سے جہاز آمد و رفت رکھتے۔ اندلس بھر کے سب سے بڑے تاجر اور اہلِ ثروت یہیں تھے۔ مسلمانوں نے ۷۹۰ سال یہاں حکمرانی کی۔ (مترجم)

آبپاشی سے محروم ہوئی تو بیکار ہوئی اور غفلت کا شکار ہوئی۔ زرخیز ترین اور شاداب ترین وادیاں بے جان اور کھنڈر ہو گئیں۔ اندلس (ہسپانیہ) کے ہر ضلع میں گنجان آباد شہر تھے۔ یہ شہر پامال ہوئے، رو بہ زوال ہوئے۔ عالموں، سوداگروں اور شہزوروں کی جگہ گداگروں، راہبوں اور ڈاکوؤں نے لے لی۔ جب موروں کو نکال دیا گیا تو ہسپانیہ کا برا حال ہوا۔ یہ ہے وہ اندوہناک حقائق جو تاریخ پیش کرتی ہے۔"

اسلام اور ملکیت زمین زراعت کو ترقی دینے کے لیے زمین کو سیراب کرنا یا اس میں کھاد ڈالنا کافی نہ تھا۔ بلکہ زمین پر کام کرنے والوں کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ یہاں بھی مذہب اسلام کا عملی پہلو ثمر ور ثابت ہوا۔ قرآنِ حکیم میں ان الفاظ سے زراعت کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے:

"زمین پر تمھارے لیے مسکن ہے اور وقتِ معینہ تک خورد و نوش کا سامان ہے۔"

(سورہ ۲، آیت ۳۶)

اور لوگوں کو زمین پر محنت و مشقت سے کام کرنے پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں ہم پڑھتے ہے، "ان لوگوں کی کہانی جو اپنی دولت خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور یہ اناج کی کہانی سے ملتی جلتی ہے جس کی سات بالیں ہوتی ہیں، ہر بال میں سو دانے ہوتے ہیں اور اللہ جن کے لیے چاہتا ہے بہتات کر دیتا ہے۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا: "زمین نے جو چھپا رکھا ہے اس میں اپنی قسمت ڈھونڈو!" (ترمذی بھی دیکھیے) "جابر ابنِ عبداللہ سے امام مسلم روایت کرتے ہیں، حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جو مسلمان پودا لگاتا ہے اور سبزیاں اُگاتا ہے وہ خدا سے معاوضہ پاتا ہے۔"

جہاں تک زمین کی صحیح تقسیم کا مسئلہ ہے پیغمبر اسلام ﷺ کی حدیث ہے: "اگر کوئی آدمی زمین کے کسی ٹکڑے کا مالک ہو تو وہ خود اس میں کھیتی باڑی کرے یا پھر اپنے بھائیوں کو مفت دے دے اور اگر یوں نہ کرے تو پھر زمین کو بے کار نہ پڑا رہنے دے۔"

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے محسوس کیا کہ ایک فرد کے پاس اتنی ہی زمین ہونی چاہیے جتنی اس کے کنبے کی پرورش کے لیے ضروری ہو۔ باقی زمین بے زمین لوگوں میں بانٹ دینی چاہیے جو

اپنی بہترین صلاحیت کے مطابق اس میں کھیتی باڑی کریں۔ ایک دوسرے موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جتنا کوئی کام کرتا ہے اس سے زیادہ اسے معاوضہ نہیں ملنا چاہیے۔"

جب نئے علاقے فتح کیے گئے تو زمینیں جُوں کی توں وہاں کے اصل باشندوں کی ملکیت میں رہنے دی گئیں اور ان سے اسی قدر لگان وصول کیا جانے لگا جو وہ پہلے ادا کیا کرتے تھے۔ اس ٹیکس کی بدولت مسلمانوں پر ان کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تسخیر کے دوران میں مسلمان سپاہیوں کو سختی سے ہدایت دی کہ وہ پیڑ یا فصلیں تباہ نہ کریں۔ اُنہیں دشمن کے ان کاشتکاروں کو ہلاک کرنے کی اجازت بھی نہ دی جو پُر امن رہ کر کام کرتے رہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مثال ہی کا اثر تھا کہ جب ۶۳۲ عیسوی میں حضرت اسامہ بن زید کی قیادت میں شام میں پہلی بار لشکرِ اسلام بھیجا گیا تو خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے اور دوسرے جرنیلوں کے نام یہ فرمان جاری کیا ــــــ

> "دیکھنا! سفاکی سے احتراز کرنا، کسی طور صداقت کا دامن نہ چھوڑنا، کسی شخص کی شکل وصورت مسخ نہ کرنا ــــــ عورت، بوڑھے اور بچے کو ہلاک نہ کرنا۔ کھجور کے پیڑ کو نقصان پہنچانا نہ اُسے جلانا۔ جس پیڑ سے آدمی یا حیوان کو روزی یا خوراک ملتی ہو اسے مت کاٹنا۔ مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کے گلوں یا اونٹوں کو ذبح نہ کرنا تاوقتیکہ جینے کے لیے ایسا کرنا ضروری نہ جانو!"

قرونِ اولیٰ کے مسلمان محسوس کرتے تھے کہ زمین اللہ کی بنائی ہوئی ہے لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ اسے سب کے مفاد کی خاطر کام میں لائیں۔ قرآنِ حکیم کا بہ غائر مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوگی کہ جاگیرداری اسلامی اصول کے منافی ہے۔ خلافِ ازیں کتاب اللہ میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جو زرعی اصلاحات کے منافی ہو۔ اس باب میں اور تمام دوسرے معاملات میں ملت سب پر فائق ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج کوئی اسلامی ملک ایسی معقول اور دانشمندانہ زرعی پالیسی نہ اختیار کرے جو بیسویں صدی کے حالات کے پیشِ نظر وضع کی گئی ہو اور حضرت ابو بکرؓ یا حضرت عمرؓ کے زرّیں عہدِ اسلام میں رائج رہی ہو۔

اسلام، فنونِ شریفہ اور فنونِ لطیفہ

اسلام اور فلسفہ پہلے دو ابواب میں قاری پر کسی حد تک واضح کیا گیا ہے کہ اسلام نے سائنسی معلومات اور صنعتی فنون کی ترویج و ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس باب میں فنونِ شریفہ میں مسلمانوں کی فتوحات پر توجہ منعطف کروائی جائے گی۔ اس کے بعد بہ حیثیتِ مجموعی اسے تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کے نظریات کی جانچ پڑتال کے لیے مدعو کیا جائے گا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اسلامی علم و دانش کے دورِ عظمت میں کوئی ایک مضمون ہوا بند کمرے میں الگ کر کے نہیں رکھا گیا تھا۔ متخصصین تو ہوتے تھے لیکن اپنی گرد و پیش کی دنیا کے بارے میں ان کا ذوق و شوق جو انہیں کیمیا دان یا منجم بنا سکتا لاریب یکساں طور پر فلسفی بھی بنا دیتا۔ عمر خیام انھی میں سے ایک تھا۔ مغرب میں وہ شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے معروف ہے لیکن اس کی شہرت کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ اس نے منجم اور ریاضی دان کی حیثیت سے نہایت نمایاں اور اونچے پایے کا اور جنل کام کیا۔ مؤرخ ابنِ خلدون بیک وقت فلسفی اور وقائع نگار تھا۔ حِطّی اس کی نسبت کہتا ہے ــــــ

"عظیم ترین مؤرخ فلسفی جسے اسلام نے پیدا کیا اور جو ہر زمانے کی عظیم ترین ہستیوں میں سے ایک ہے۔"

ایک اور مسلمان اسکالر جس نے خود کو فقط سائنس کے مطالعے تک محدود نہیں رکھا طبیب ابنِ رُشد تھا۔ اس کی نسبت حِطّی کہتا ہے ــــــ

"طبیب کی حیثیت سے ابنِ رشد کی ذات پر وہ ابنِ رشد چھا گیا جو فلسفی اور مُفسّر تھا۔"

ابنِ رُشد کے کام کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہیے۔ اس کی سب سے بڑی تالیف کی نسبت کئی مسلمان آج اسے بدعت قرار دیتے ہیں۔ حِطّی کسی طور بھی ابنِ رشد کی عقل پرستی کو مسلمانوں کے عقائد کے خلاف نہیں سمجھتا کیونکہ وہ اسلام کو نہایت معقولیت پسند مذہب قرار دیتا ہے۔ فرانس کا

پروفیسر مونیت اسی نکتے کو بڑے شد و مد سے اُبھارتا ہے اور کہتا ہے ــــــــ

''اصطلاح کے وسیع ترین مفہوم، لسانیات اور تاریخ کے اعتبار سے اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو معقولیت پسند ہے۔ ایک ایسا نظام جس کی بنیاد ان عقائد و اصول پر ہو جن میں دلیل موجود ہو اس کے حوالے سے معقولیت پسندی کی جو تعریف بنتی ہے اس کا اطلاق صحیح طور پر اسلام پر ہوتا ہے۔''

ابنِ رُشد نے اپنے فلسفیانہ کام میں جو طریقِ کار اختیار کیا ہے غالباً یہی تعریف یکساں طور پر اس پر بھی پوری اترتی ہے۔ جلی محسوس کرتا ہے کہ ابنِ رُشد کی تحریروں کا بیشتر حصہ جسے کافرانہ خیال کیا جاتا ہے اس نے کبھی لکھا ہی نہیں۔ کمتر درجے کی کثیر تحریریں جو دوسرے مصنفوں کی لکھی ہوئی ہیں غلطی سے اس کے نام سے منسوب کی گئی ہیں۔ جلی یہاں تک کہتا ہے ــــــــ

''اس کے نام تلے محاسن اور غلط فہمیوں کے جو انبار لگ گئے ہیں ان سب کے باوجود جدید تجرباتی سائنس کے معرضِ وجود میں آنے تک یورپ کے فکر میں ابنِ رُشد کا عمل دخل رہا۔''

ابنِ رُشد کو یورپ والے ''ایوی روز'' کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔ مقابلہ کریں تو اسکی دانش بہت زیادہ قابلِ قدر معلوم ہوتی ہے کیونکہ ازمنۂ وسطیٰ میں اس کے ہمعصر عیسائی کیمیا دان (مہوّس) ابھی تک ٹامک ٹوئیے مار رہے اور پارس ڈھونڈ رہے تھے، جس کے بارے میں ان کا خیال تھا یہ ادنیٰ دھاتوں کو سونے میں بدل دیتا ہے۔ اس سلسلے میں حکمت و فلسفہ کا استعمال اصطلاحی نام کی نوعیت کے اعتبار سے اس امر کو مزید عیاں کرتا ہے کہ اس میں تمام علوم و فنون شامل تھے۔ اصل یونانی میں ''فلاسفی'' کے معنی حکمت اور دانش کی محبت تھا، اس میں کسی خاص حکمت و دانش کی تخصیص نہ تھی۔ آج ہم اس لفظ کے استعمال سے ایسے فنون اور ذہنی اسالیب مراد لیتے ہیں جن کے باعث ابنِ رُشد اور دو پیشرو جو عین اس سے پہلے بارھویں صدی میں اُندلس میں رہتے تھے ممتاز ہوئے۔ یہ ابنِ ماجہ اور ابنِ طفیل تھے[1]

---

[1] ابوبکر محمد بن عبدالملک ابنِ طفیل غرناطہ کا معروف اور یکتائے روزگار طبیب ۱۱۱۳ ش میں پیدا ہوا اور اس نے ۱۱۸۵ ش میں وفات پائی۔ تمام عمر تحصیلِ علم و فن میں مصروف رہا۔ مراکش کے فرماں روا ابو یعقوب نے اسے اپنا وزیر اور طبیب مقرر کیا۔ یہاں اسے اس نایاب کتب خانے سے استفادے کا زریں موقع ملا جو شاہی محل میں موجود تھا۔ اس زمانے کے سلاطین اور امراء و روساء بھی علم و فن کے عاشق تھے، اُنہیں کتابیں جمع کرنے کا جنون ہوتا۔

ابنِ طفیل نے ''حی ابنِ یقظان'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس نے یورپ کے ادب پر بڑا اثر ڈالا۔ یہ دو افراد کی دلچسپ داستان ہے جن میں ایک فرد اصولِ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے، دوسرا راحت اور تکلف سے رہتا ہے۔ سترھویں صدی میں اس کتاب کو لاطینی میں منتقل کیا گیا۔ بعد ازاں کئی دوسری زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے حکیمانہ انداز سے متاثر ہو کر بعد ازاں انگریزی ناول ''رابنسن کروسو'' لکھا گیا۔ (مترجم)

فلسفے کی تاریخ میں اسلامی اندلس کی بارھویں صدی کو عظیم ترین صدی مانا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمان علماء نے مغربی افکار پر سب سے زیادہ اثر ڈالا۔

سر اڈورڈ تھورپین اپنی تالیف "اے ہسٹری آف کیمسٹری" (تارخ کیمیا) میں یوں رقمطراز ہے ــــــ

"اندلس کی خلافتِ اسلامیہ نے یوسف اور یعقوب کے مخیرانہ دورِ اقتدار میں سائنس کو مٹنے سے بچایا۔ مغربی یورپ میں قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ اور طلیطلہ تحصیلِ علم وفن کے بڑے مرکز تھے۔ ابنِ رُشد (۱۱۲۶ سے ۱۱۹۳ عیسوی تک) جو زیادہ تر "ایوی روز" کے نام سے معروف ہے نہایت کامل اور ذی شان طبیعیات دان تھا۔ اسی کی بدولت رَوجر بیکن ایسے عیسائی علماء نے ارسطو کے نظامِ فلسفہ کے بارے میں بیشتر آگاہی پائی۔[1] مسلمان مفکرین ابنِ جابر اور بوعلی سینا کے ذریعے اُنھوں نے مشرق کی نسبت علم حاصل کیا۔"

فرانسیسی مؤرخ ارنسٹ رینان ایوی روز یعنی ابنِ رشد کو اس قدر اہم خیال کرتا ہے کہ اس نے اپنی کتاب کا بیشتر حصہ اس مفکرِ اسلام اور اس کے افکار کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس کی تالیف "ابنِ رُشد اور ابنِ رُشدیت" دیگر اوصاف کے علاوہ اس شاندار رواداری پر زور دیتی ہے جس سے قرطبہ کے ماحول کو ممتاز حیثیت حاصل رہی۔ اسی ماحول میں ابنِ رُشد لکچر دیا کرتا۔

اسلام اور فنِ تاریخ نویسی زندگی کے بارے میں صحیح فلسفی کے انداز سے نظریہ رکھنے والے مسلمان تاریخ نویس تھے۔ مسلمان مورخین میں تین نام غیر معمولی طور پر اُبھرتے ہیں۔ سب سے پہلے ابوالحسن علی المسعودی کا نام آتا ہے جسے عربوں کا ہیرودوطس (ہرودوط) کہتے ہیں۔ اس عظیم یونانی مورخ کی طرح المسعودی بھی عربوں کی تاریخ کی بزرگ ہستی ہے لیکن اسے جو حقائق

---

[1] فرانسیسی مورخ بریفالت اپنی کتاب "دی میکنگ آف ہیومینٹی" (تعمیر انسانیت) میں روجر بیکن کی نسبت یہ کہتا ہے: "مسیحی یورپ میں وہ اسلامی سائنس اور اسلامی سائنسی طریق کار کے سلسلے میں ایک پیغمبر سے کم مرتبہ نہ رکھتا تھا۔ وہ اپنے معاصرین سے یہ کہتے کہتے نہ تھکتا تھا کہ صحیح علم کے لیے ایک ہی طریقہ ہے کہ عربی زبان سیکھی اور عربی علم حاصل کیا جائے۔" (مترجم)

دستیاب ہوتے ہیں انھیں مختلف طریقے سے پیش کرتا ہے۔ اس نے ''موضوعاتی'' طریقہ رائج کیا۔ اس نے ماہ و سال اور تاریخوں کے اردگرد واقعات جمع نہیں کیے بلکہ لوگوں اور خاندانوں کے اردگرد جمع کیے۔ پھر وہ پہلا مؤرخ ہے جس نے تاریخ کی کتاب میں جان ڈالنے کے لیے واقعات سے خُوب کام لیا۔

باقی دو نام ـــــــــ ابنِ خلدون اور طبری ہیں۔

ابنِ خلدون بلاشبہ تینوں میں سب سے زیادہ نامور ہے۔ اس کے نام کی شہرت ''مقدمہ'' پر ہے جس میں پہلی بار اُس نے تاریخی ارتقاء کا نظریہ پیش کیا ـــــــــ اس نے موسمی اور جغرافیائی عوامل نیز زندگی میں جو اخلاقی اور روحانی قوتیں کارفرما ہتی ہیں انہیں بجا طور پر ملحوظ رکھا۔ لاریب ابنِ خلدون کو بآسانی عمرانیات کا حقیقی بانی کہا جاسکتا ہے کیونکہ یہ پہلا آدمی ہے جس نے قوم کے عروج و زوال کے اصول معلوم کیے۔ فلپ ہٹی کے الفاظ میں ـــــــــ

''کسی عرب مصنف نہ کسی یورپین نے اس جامع اور فلسفیانہ انداز سے تاریخ لکھی۔''

یورپ پر عرب مؤرخین کا جو احسان ہے ایک اور مؤرخ بہ الفاظ ذیل اس کا ذکر کرتا ہے ـــــــــ

''وہ (عرب) بدیں وجہ دائمی شکریے کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے یونانیوں اور ہندوؤں کا علم محفوظ کرلیا جبکہ ثانی الذکر کوئی نئ بات پیدا نہیں کررہے تھے۔ اس وقت یورپ اتنا جاہل تھا کہ علم کے گراں قدر شعبے کو سنبھال نہ سکتا تھا۔ عرب مورخین کا نام اور کام مٹا دیں تو یورپ میں احیائے علوم کی تحریک کئی صدیوں تک تھمی رہتی۔''

فرینز روز تھل اپنی تالیف ''ہسٹری آف مسلم ہسٹوریوگرافی'' میں یوں رقمطراز ہے۔

''اسلامی فنِ تاریخ نویسی کا جو ہمیشہ دائرہ اسلام میں عمومی سطح پر ہونے والی علمی ترقی سے قریب ترین رشتہ استوار کیا گیا، اسلامی تعلیم و تدریس میں تاریخی علم کے شمول سے حکمت و دانش کے اعتبار سے تاریخ

نویسی کے معیار پر یقیناً اثر ڈالا۔ تاریخ کے ذریعے عمرانیاتی سوجھ بوجھ پیدا کرنے اور تاریخ نویسی میں نظم و ترتیب قائم کرنے میں مسلمان قطعی طور پر تاریخ کے سابقہ مورخوں پر سبقت لے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جدید تاریخ نویسی میں اسلامی لٹریچر کے استعمال سے رفتار کار اور مواد کے لحاظ سے خاص فائدہ پہنچا ہے۔ اس طرح سترھویں صدی اور اس کے بعد غیر ملکیوں کی آنکھ سے دنیا کا بیشتر حصہ دیکھنے کی توفیق ہوئی۔ تاریخ کے شعبے میں عہدِ حاضرہ کی سوچ کی تشکیل میں اسلامی فنِ تاریخ نویسی کی بدولت بالواسطہ طور پر معقول حد تک مدد ملی ہے۔"

مسلمان مورخ سیر حاصل لکھنے والے تھے۔ ایک جرمن مستشرق نے ذاتی طور پر اسلام کے اوّلین ایام کی لکھی ہوئی پانسو نوّے (۵۹۰) عربی کتابیں جمع کیں۔ کشف الظنون کا مصنف ایک ہزار تین سو ایسی کتابوں کی فہرست دیتا ہے جو عہد اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ضبط تحریر میں لائی گئیں۔ ان کتابوں میں سے الطبری کے بارے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ عربی فنِ تاریخ نویسی میں گلفشانی کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ طبری نے دنیا کی ابتدا سے ۹۱۵ عیسوی تک کی تاریخ لکھی ہے۔ روز نیھتل کہتا ہے ـــــ

"اس میں سے تاریخِ عالم باقی تاریخوں میں سب سے اہم تر ہے۔ الطبری میں کمال کی تفصیل موجود ہے۔ اس میں ایک عالمِ دین کے نہایت پیچیدہ اور انتھک کام کا سراغ ملتا ہے۔ ایک فقیہہ کی لگن اور صحت پسندی نیز سیاسی معاملات میں اس کی بے نظیر بصیرت کا پتا چلتا ہے۔"

ذیل کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ الطبری علم برائے علم کے نظریے کا قائل تھا۔ ایک بار خلیفہ بغداد نے مورخ کو عزت بخشنے اور پانچ ہزار طلائی دینار پیش کرنے کی خواہش کی۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم بہت بڑے جلوس کے ساتھ شہر کے بازاروں میں سے گزرا اور پھر اس جھونپڑے پر سینکڑوں لوگ ہجوم کر آئے جہاں وہ بوڑھا آدمی یہ دیکھنے کو جی رہا تھا کہ اس کی محنت کی قدر ہوگی۔ الطبری نے یہ کہہ کر تحفہ لینے سے انکار کیا کہ علم کے باب میں اس کی خدمات

کسی قسم کے معاوضے کا تقاضا نہیں رکھتیں۔ایک وقت وہ ایسا مفلس ہوا کہ روٹی کے لیے اسے اپنی قمیض بیچنی پڑی لیکن بڑی سے بڑی تکلیف بھی اسے اپنی محنت کا معاوضہ لینے پر مجبور نہ کر سکی۔ پچاسی سال کی عمر میں وہ کنگال ہو کر مرا لیکن ہمعصروں نے اس کا احترام کیا۔

تاریخِ عالم کے علاوہ طبری نے قرآن کی دو ضخیم تفسیریں لکھیں جو تین تین ہزار صفحوں پر مشتمل تھیں۔آج بھی انہیں معیاری مانا جاتا ہے۔

اسلام اور ادب و کتب خانے بڑے بڑے تمام مسلمان عالم مصنف بھی تھے اور معلم بھی۔ دوسروں کے فائدے کی غرض سے وہ اس امر پر آمادہ رہے کہ ان ولولہ انگیز علمی انکشافات کو سپردِ قلم کرتے رہیں جو انہوں نے کیے۔جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مسلمانوں کے کاغذ بنانے کے کارخانے ایسا کاغذ تیار کرتے تھے جن پر یہ کتابیں لکھی جاتی اور نقل کی جاتی تھیں۔قرونِ اولیٰ میں مسلمان کتابوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔اسی احترام سے عربوں کی ادبی فتوحات کا علم ہوتا ہے۔

کتنے ہی کتب فروش تھے جو ہزاروں لوگوں کے ہاتھوں نقل شدہ کتابیں فروخت کرتے۔ انہی کے پہلو بہ پہلو نجی کتب خانوں کو بھی کتابیں دیتے۔نجی کتب خانوں میں الموصل کا کتب خانہ سب سے زیادہ معروف تھا۔یہاں اسکالروں کو مفت کاغذ مہیا کیا جاتا۔اسی زمانے میں بصرہ میں کتب خانے کے بانی نے اس میں آکر کام کرنے والوں کو جی کھول کر وظائف دیے۔پھر جب اندلس پر مسلمان قابض ہوئے تو سب سے زیادہ یہیں کے لوگوں کو نجی اور سرکاری کتب خانوں سے فائدہ پہنچا۔تیرھویں صدی میں قرطبہ کی لائبریری میں چار لاکھ اور چھ لاکھ کے درمیان کتابیں تھیں لیکن مسیحی یورپ میں، کیتھولک انسائیکلوپیڈیا کے بموجب ایسی کوئی لائبریری نہ تھی جس میں دو ہزار سے زائد کتابیں ہوتیں۔

قاہرہ کے بیت الحکمت میں بیس لاکھ کتابیں تھیں۔طرابلس کے کتب خانے میں تیس لاکھ کتابیں تھیں۔ان میں پچاس ہزار نسخے قرآن پاک کے تھے۔پہلی صلیبی جنگ میں عیسائیوں نے یہ کتب خانہ نذرِ آتش کیا۔[1]

1۔ عیسائی مصنفین نے اکثر الزام لگایا ہے کہ جب عمرو بن العاص نے مصر فتح کیا تو عربوں نے اسکندریہ میں عظیم یونانی کتب خانہ تباہ کیا در آنحالیکہ تازہ تحقیق نے اس الزام کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے کتاب کے ضمیمے میں اس کے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی کا کتابچہ "اسکندریہ کا کتب خانہ" لائقِ مطالعہ ہے۔(مترجم)

الحکیم کے کتب خانے میں چالیس شعبوں میں کتابیں چنی گئیں تھیں اور ہر شعبے میں اٹھارہ اٹھارہ ہزار کتابیں تھیں۔ ایک اور لائبریری خزینۃ الکتب تھی۔ ایرانی فرماں رواعضد الدولہ نے ۹۸۴ عیسوی میں اسے قائم کیا۔ اس کی عمارت تین سوستر خوشنما کمروں پر مشتمل تھی اور ایک شاندار سیر گاہ میں واقع تھی۔ یہاں ایک نفیس پویلین بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ ان دنوں ادب کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

مرو میں ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا جہاں جغرافیہ دان یاقوت نے مواد جمع کرنے میں کئی سال صرف کیے اور پھر جب چنگیز خاں کے منگولی لشکر نے حملہ کیا تو یہ بھاگ گیا۔ علاوہ ازیں بغداد، رامہرمز، بصرہ، رَے، بلخ، بخارا اور غزنی میں بھی ایسے کتب خانے تھے جن کی بڑی شہرت تھی۔ ان نفیس عمارتوں کے ڈیزائن اس انداز کے تھے علم وادب کی مسرتوں سے آہنگ قائم رہے۔ متعدد بلند پایہ اصحاب نے اپنی کتابیں عوام کے لیے وقف کرنے کی وصیت کی۔ ان میں مورخ الخطیب کا نام بھی آتا ہے۔ اس کی یاد میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا۔ یہ کتب خانے صرف کتابوں کے حفاظت خانے ہی نہیں تھے بلکہ ان میں عوامی مباحثوں کے لیے لکچر ہال اور جلسہ گاہیں بھی تھیں۔

مسجدیں بھی کتب خانوں کا کام دیتیں۔ چنانچہ پورے دورِ اسلام میں خواہشمند کو کتابیں میسر آئیں۔ ابنِ سینا، ابنِ مسکویہ اور الشبسطی ایسے عالم اور فاضل مہتمم کے طور پر کتب خانوں میں کام کرنے میں فخر محسوس کرتے۔

اہلِ ثروت بالعموم اپنے طور پر کتب خانے رکھتے۔ مورخ گبن ایک مسلمان طبیب کی کہانی بیان کرتا ہے جس نے سلطان کی دعوت محض اس لیے مسترد کر دی کہ اسے اپنی کتابیں ساتھ لے جانے کے لیے چار سو اونٹ درکار تھے۔

خلیفہ ہارون الرشید کے بارے میں جو باتیں مشہور ہیں ان میں سے ایک یہ بات ہے کہ وہ علم وفن کا بڑا دلدادہ تھا اور نایاب کتابیں اکٹھی کرنے میں ممتاز مقام رکھتا تھا۔

رومن شہنشاہِ نیسیفورس کو متعدد لڑائیوں میں شکست دینے کے بعد خلیفہ نے اسے خط لکھا جس میں کہا تھا ——

"میں نے تمہاری سلطنت کا ایک بڑا حصہ فتح کر لیا ہے اور اب اس
کی ملکیت میرا حق ہے لیکن اگر تم وعدہ کرو کہ ادب اور سائنس کے موضوع
پر تمہاری سلطنت میں جتنی کتابیں ہیں ان کی نقلیں مجھے دے دو گے تو میں
بخوشی تمہیں مفتوحہ علاقے لوٹا دوں گا۔"

رومن حکمران نے بخوشی خلیفہ کی درخواست قبول کر لی۔ خلیفہ نے مفتوحہ علاقے لوٹا دیے اور رومن سلطنت کے تمام کتب خانوں میں ادب اور سائنس کے موضوع پر جتنی کتابیں تھیں انہیں نقل کرنے کے لیے مسلمان عالموں کو روانہ کیا۔ اس کا بیٹا المامون بھی بڑا عالم تھا اس نے رومن سلطنت کے کتب خانوں کی کتابیں نقل کرنے کا کام جاری رکھا۔

ونفروپ ریڈ اپنی مشہور کتاب "آدمی کی شہادت" میں مسلمانوں کے علم و فضل کی تعریف بدیں الفاظ کرتا ہے ———

"ایک وہ وقت تھا کہ یورپ میں کتابوں کا سخت کال تھا۔ تب اگر
کسی شخص کے پاس کتاب ہوتی تو وہ اسے کلیسا کے حوالے کر دیتا اور
اپنے گناہ بخشوانے کے لیے قربان گاہ پر چڑھا دیتا۔ کسی کلیسا کی تحویل
میں تین چار سو قلمی نسخے ہوتے تو وہ اس شاندار تحفے کی بنا پر بیش بہا سمجھا
جاتا۔ تب یورپ میں شاید ہی کوئی ایسا پادری تھا جو لاطینی کتابیں اپنی
مادری زبان میں منتقل کر سکتا۔ پھر جب کسی راہب نے اطالیہ میں ریاضی
کے اُلٹے پلٹے گر سیکھ لیے تو لوگ اُسے جادوگر سمجھنے لگے۔ اسی زمانے میں
مسلمانوں کا ایسا ملک بھی تھا جہاں ہر بچے کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا جس
کے ہر شہر اور قصبے میں عوامی کتب خانہ تھا اور جہاں کتابیں جمع کرنے کا
شوق جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔"

عظیم جغرافیہ دان الیعقوبی بتاتا ہے کہ اس کے زمانے میں بغداد کے صرف ایک کوچے میں کتب فروشوں کی ایک سو دکانیں تھیں۔

اندلس ایک ایسا ملک تھا جہاں خصوصیت سے قرطبہ میں مسلمانوں کے ادبی کارنامے

نقطۂ عروج کو پہنچے۔ لین پول "اندلس کے موروں کی تاریخ" میں بتاتا ہے کہ اس زمانے میں ہر شخص کی زبان پر شعر ہوتا۔

"یورپ میں کبھی پہلے ایسا وقت نہیں آیا کہ شاعری ہر شخص کا اتنا پسندیدہ موضوع گفتگو ہو۔ اندلس میں ہر طبقے کے لوگ عربی شعر کہتے جو اطالیہ اور پروونس کے مغنی شاعروں اور اندلسی گویوں کے گیتوں اور گانوں کے لیے نمونہ بن جاتے۔ اندلسی خطیبوں کی کوئی تقریر اس وقت تک مکمل نہ ہوتی جب تک عین اسی لمحے کوئی شعر فی البدیہہ نہ کہا جاتا یا پھر حافظے کے زور پر کسی معروف شاعر کے شعر کا حوالہ نہ دیا جاتا۔"

فلپ حِٹی اپنی تالیف "عربوں کی تاریخ" میں یورپ پر عرب شعراء کے احسان کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ نثر پاروں پر عربی ادب کے اثر کا بھی ذکر کرتا ہے۔

"اندلسی ادب میں جو غضب کا سراب خیال (فینتاسیہ) ملتا ہے وہ اسی طرح عربی اصل کی غمازی کرتا ہے جس طرح سروِنتی کی خرد کی غمازی کرتا ہے جس نے مذاق سے دعویٰ کیا کہ اس کی تالیف ڈون کوک زوٹ کا ماخذ عربی ہے۔"

حِٹی متعدد ایسے اندلسی مسلمانوں کے نام لیتا ہے جو معروف مصنف تھے اور ابتداء ابنِ عبد ربہ (۸۰۰-۹۴۰ش) سے کرتا ہے جو عبدالرحمان ثالث کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ حِٹی بتاتا ہے کہ اس کی شہرت مجموعہ اشعار سے قائم ہے۔ اس نے "العقد الفرید" نظم کی لیکن اندلسی مسلمانوں میں سب سے بڑا اسکالر اور خلقی مفکر علی ابنِ حزم تھا جو ۹۹۴ سے ۱۰۶۴شمسی میں ہوگزرا ہے۔ یہ اسلام کے دو تین ذہین ترین اور عظیم ترین کثیر نویسوں میں سے ہے...... ابنِ خلکان اور قفطی بتاتے ہیں کہ اس نے تاریخ، دینیات، حدیث، منطق، شاعری اور متعلقہ مضامین پر چار سو کتابیں لکھیں...... اُس کے جو شاہکار محفوظ رہے ہیں ان میں سب سے گراں مایہ "الفصل فی الملل والاہواوالنحل" ہے جس نے اسے مذاہب کے تقابلی مطالعے کے میدان میں پہلا عالم ہونے کا شرف بخشا۔

مغرب کا ایک دوسرا عالم سیف سہیل اپنی تالیف "عربی تمدن" میں اندلس میں شاعری کے مقام کا تذکرہ کرتا ہے۔وہ کہتا ہے ــــــ

"شاعری اہلِ اندلس کا مقتدر جذبۂ شوق بن گیا۔ گیارھویں صدی کے اہلِ علم کی زندگی اور سرگرمیوں کے مطالعے سے پچھلی صدی کے ذہنِ رسا کی حیرت خیز بصیرت کا انکشاف ہوتا ہے، پس اہلِ مغرب کی یہ اطمینان بخش قیاس آرائی ناقص ہے کہ صرف یورپ کی سرزمین ہی پر درحقیقت اسلام کی ذہانت اور فراست کے گل بوٹے کھلے۔ مشرق میں بھی مسلمان، سائنس اور فنون میں نصف النہار پر پہنچے۔"

علم وفن کے اس عظیم دور میں مسلمانوں کی بہادری اور جسارت پورے عروج پر تھی۔ خلفاء کے درباروں میں نوعمر رؤساء کو خواتین کا جی بہلانے کے لیے جس قدر شہسواری کا مظاہرہ کرنا پڑتا اسی قدر عقل وفراست کا، جس آہنگ اور لے سے شاعری میں مہارت دکھانی پڑتی اسی طرح طلیطلہ کی تلواریں گھمانے میں دکھانی پڑتی۔ خواتین بھی شاعری کے وصف سے محروم نہ تھیں۔ المقری نے اندلس کی ادیب خواتین پر پورا باب صرف کیا ہے اور ہِٹی خلیفہ مُستکفی کی حسین دختر ولادہ کو "اندلس کی سیفو" کہتا ہے ــــــ "دخترِ خلیفہ نامور شاعرہ ہو گزری ہے۔"

یورپ کا ایک اور شاہکار جس پر اسلامی اندلس کی افسانوی شاعری کا زبردست اثر پڑا۔ ہِٹی کے بیان کی رو سے ایک فرانسیسی رزمیہ نظم "لاشانساں دارولاں" ہے جو ۱۰۸۰ء کے لگ بھگ منظرِ عام پر آئی۔ ہِٹی محسوس کرتا ہے کہ اس سے یورپ میں ایک نئی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے ــــــ ایسی تہذیب کا آغاز جو فقط شاعری کے معاملے میں بلکہ کئی دوسرے پہلوؤں سے اسلام کی مرہونِ منت ہے اور مجموعہ نظم سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے۔

<u>اسلام اور خطابت</u> اسلام میں ہمیشہ خطابت کا دور دورہ رہا۔ ابتدائی دور ہی سے تمام اہم دنیاوی اور روحانی اعلانات مسجد ہی میں کیے جاتے۔ صدیوں تک مسلمان مبلغ، معلم اور طلبہ ان طریقوں کا مطالعہ کرتے رہے جن سے مفید ترین انداز سے سامعین میں حوصلہ مندی کا

جذبہ پیدا کیا جاسکتا، انہیں تعلیم دی جاسکتی اور انہیں اُبھارا اُکسایا جاسکتا۔ وہ فن جس کی ابتداء وعظ سے ہوئی تھی اس نے فنِ ادب کا روپ دھار لیا۔ پھر خطابت کے علم نے ان ایام میں بڑا اہم کردار ادا کیا جب ابھی ادب کا اظہار مسودوں کی صورت میں تحریر سے کہیں زیادہ لفظ اور زبان سے ہوتا تھا۔

فلپ حتی لکھتا ہے ——

''بنو امیہ کے عہدِ خلافت میں مختلف صورتوں میں خطابت کا فن ایسا پروان چڑھا کہ اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی اور پھر آنے والے عہد میں اس پر سبقت بھی نہ لے جاسکا۔ خطیب جمعے کے خطبۂ نماز میں اسے مذہب کی تبلیغ کے حربے پر استعمال کرتا، جرنیل اپنے لشکر میں جذبۂ جہاد پیدا کرتا اور صوبے کا حاکم اپنی رعایا میں حبُ الوطنی کا جذبہ اُبھارنے کے لیے اس کا سہارا لیتا۔ ایسے زمانے میں جب پروپیگنڈے کی خاص سہولتیں میسر نہ تھیں خطابت نے خیالات کی اشاعت اور جذبات انگیزی کی شاندار راہ پیدا کی۔ حضرت علیؓ کے اعلیٰ درجے کے پند آمیز خطبات جن میں اشعار اور اقوالِ دانش ملتے ہیں، درویش صفت حسن البصری کے وعظ جو انہوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے سامنے کیے اور جنہیں مؤخر الذکر کے سوانح نگاروں نے محفوظ کر لیا، نیز زیاد بن اَبیہ آتش نوا الحاج کی عسکری نوع اور حبِ وطن سے مملو تقریریں —— یہ تمام ایسے وقیع ترین خزانے ہیں جو قرونِ اولیٰ سے ہم تک پہنچے ہیں۔'' ۲

۱۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اسلام ایسے دور میں جلوہ گر ہوا جب عربوں میں شاعری اور خطابت نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ ان کے لیے تمام دنیا گونگی (عجمی) تھی۔ عہدِ جاہلیت کے عرب غضب کے شاعر تھے۔ ان کے خطیب دن رات فصاحت و بلاغت کے [redacted] یا بہاتے۔ پھر جب قرآن نازل ہوا تو عربوں کے یکتائے روزگار شاعروں اور خطیبوں کی زبانیں بند ہو گئیں۔ ان سے کہا گیا۔ "فاتوا بسورۃ من مثلہ" ایسی ایک آیت تو لاؤ! لیکن کس میں ایسی ایک آیت لانے کی تاب تھی۔ آج تک قرآن کے اس چیلنج کا جواب دیا گیا نہ قیامت تک دیا جائے گا۔ (مترجم)

۲۔ History of [redacted] Arabs ص ۲۳۹

اسلام اور مصوّری (آرٹ کا مسئلہ اسلام میں متنازعہ فیہ ہے تاہم ایک بات یقینی ہے کہ مسلمان فنکاروں نے مُصوّری کے فروغ میں خاصا حصہ لیا۔ اس میں شبیہ کی تصویر کشی شامل ہے۔

دیواروں پر تصویریں بنانے کا فن قدیم ترین بھی ہے اور مقبول ترین بھی۔ صحرائے شام میں ایسے حمام اور عشرت کدے پائے جاتے تھے جن کی دیواریں نہایت نفیس تصویروں سے مُزّین تھیں۔ ولید (۷۰۵۔۷۱۵ ش) کا قصرِ امرہ اور یزید ثانی (۷۲۰۔۷۲۴ ش) کی تعمیر شدہ مشاط۔ ایسی علامتی تصویریں جن میں فتح و نصرت شاعری یا حکمت کو متشکل کیا جاتا ہمیشہ پسند کی گئی ہیں۔ شاہی خاندان کے افراد کی تصویریں بھی بنائی جاتیں۔ ایسی ہی دیواری تصویریں ایران اور مصر میں بھی پائی گئی ہیں۔ یہ خلفائے بنو امیہ کی ہدایت پر بنائی گئی تھیں) ✱

تیرھویں صدی کی تصنیفات خصوصاً داستانوں اور سائنس کی کتابوں میں بہ کثرت تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ اس دور کے کامیاب ترین مصوروں میں یحیٰی ابن علی کا نام آتا ہے ''مقامات حریری'' میں جس کی پیش کی ہوئی تصویریں خوب پر لطف ثابت ہوئی ہوں گی۔ ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان میں بھی مُصوّر کتابوں کا رواج تھا۔ امیر حمزہ، نظامی کا شاہنامہ خاموش، اکبر نامہ اور دارانامہ ——— یہ تمام کلاسیکی کتب تصویروں کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔

لاریب مغلوں کے عہد میں بھی مسلمان مُصوّروں نے دنیا کے سامنے فن کے بہترین نمونے رکھے۔ فادر سیباسطین موزیک نامی ایک رومن کیتھولک پادری ۱۶۴۱ء میں جب شاہجہان کے دربار میں آیا تو اس کا خیال تھا کہ شبیہی مصوّری اور شاہانہ جاہ و جلال کے مناظر کی تصویروں نے جو بلند معیار قائم کیا ہے وہ کبھی قائم نہ ہوا تھا۔ سید علی اس زمانے کے عظیم فنکاروں میں سے ایک تھا۔

فادر موزیک نے یہ حقیقت بھی قلمبند کی ہے کہ آگرہ کے کتب خانے میں جو بیس ہزار قلمی نسخے تھے۔ ان میں سے اکثر مُصوّر تھے اور ان میں سنہری کام کیا ہوا تھا۔

سنہری کام غالباً معمولی قسم کا فن ہے لیکن مسلمانوں کے دور حکومت میں اس نے حسن آفرین شکل اختیار کی۔ قرآن مجید کے نسخے سب سے زیادہ مذہب و مطلاّ کیے جاتے۔[1]

---

[1] ایسے مطلاّ نسخے بہ کثرت مل جاتے ہیں جن پر سنہری بیل بوٹے، حاشیے بنے ہوئے ہیں۔

کتاب کی شان کے مطابق اس کی تزئین کرنے کے لیے فنکار بے حدوحساب زحمت گوارا کرتے۔ جہاں تک ان کا بس چلتا وہ کرگزرتے۔ اس محنت اور احتیاط سے نقش ونگار بنائے جاتے کہ مملوک خلفاء کے پاس قرآن کے جو حسین ترین نسخے تھے شاید ہی ان کے تین سے زائد صفحے مزین کیے گئے ہوں۔ آگرہ کے کتب خانے میں جو نسخے محفوظ ہیں ان کا شمار مسلمانوں کے عظیم ترین فن پاروں میں ہوتا ہے۔

اسلام اور فنِ تعمیر (مغرب پر مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا اثر نمایاں اور خاصا ہے۔ قرطبہ کی مسجد مذہبی فنِ تعمیر کے نمونے کے طور پر ابھی موجود ہے۔ اس میں بارہ سو ترانوے ستونوں کا ہجوم ہے، صحن ہے اور شامی طرز کے مینار ہیں۔ یہاں کا محرابی نظام صحیح معنی میں عربی فنِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ محرابیں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں اور ایک دوسرے کے آر پار جاتے ہوئے ستون عیاں ہیں۔)

اشبیلیہ کا القصر ایک غیر مذہبی عمارت ہے جو آج بھی عربوں کے فنِ تعمیر کے حسن اور آرائش کاری کی یادگار ہے۔ اس کے اندرونی حصوں میں مسلمانوں کے جس اسلوب کی زیبائش کی گئی ہے وہ غرناطہ کے الحمرا محل کی خصوصیت ہے۔

(صلیب وہلال کی جنگوں کے دوران میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے فنونِ تعمیر خوب آپس میں گھل مل گئے۔ اس اختلاطِ باہمی کا نتیجہ ایسی تعمیرات کی شکل میں رونما ہوا جو بالخاصہ اندلسی طرز کی تھیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اندلسی زبان میں فنِ تعمیر کی کتنی ہی عربی اصطلاحات محفوظ ہیں جن سے اکثر عمارتوں کا عربی الاصل ہونا عیاں ہوتا ہے۔ عربی طرز کی اندلسی محراب MOOROSH ARCH آج بھی ہر قسم کی نعل نما محراب کے لیے مروّج ہے۔ مغرب میں مسلمانوں کے فنِ تعمیر کو یہاں تک خصوصیت حاصل ہوئی۔

مصر میں چند بہترین تعمیراتی کارنامے ان مسلمانوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں جو تیرھویں صدی میں بغداد اور دمشق پر منگولوں کے حملے کے باعث بھاگ کر وہاں چلے گئے۔ اس سلسلے میں ہِطی کہتا ہے ——

"گنبد اس نفاست سے بنائے گئے کہ ان کے سبک پن بیرونی

خطوط کے حسن اور آرائش کاری کا جواب نہیں...... یہ زیادہ تر خاص قسم کی محرابوں اور آرائش کے دوسرے دو مانوس طریقوں کے باعث نمایاں درجہ رکھتا ہے۔ ایک اقلیدسی عربی تقدس اور دوسرا کوئی طرزِ تحریر۔"

تیرھویں اور چودھویں صدی کے پورے دور میں اسلامی اور عیسائی ملکوں میں فن تعمیر یکساں طور پر بڑے زوروں پر تھا۔ دونوں کی تہذیب ایک دوسرے کے فن تعمیر پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ مغرب نے دنیائے اسلام سے متعدد تعمیراتی نمونے لیے ـــــ ان میں رنگ و روغن والی محرابیں، کمانی دار چھجے، نقش و نگار والے جھروکے، کارچوبی، ستونوں کے زاویوں پر لٹھوں کا استعمال، آرائشی اور ترشی ہوئی فصیلیں، کندہ تحریریں، عمارتوں کے دھاریدار چہرے، دھاتی جالیاں اور اقلیدسی آرائشی نمونے شامل ہیں...... مزید برآں تعمیراتی حُسن کے کتنے ہی عناصر دوسری قوموں کے اسلوبوں میں گھل مل گئے۔

اسلام اور موسیقی کتنے ہی لوگ موسیقی میں مسلمانوں کے کام کی نسبت یکسر غلط تاثر رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں موسیقی کو اسلامی دورِ حکومت میں بہت نظر انداز کیا گیا۔ یہ صحیح نہیں (اسلام کے عہد عروج میں حکیم الفارابی [1] اپنے وقت کا سب سے بڑا عالمِ موسیقی تھا۔ مغرب کے نامور موسیقی دان ایچ۔ اے۔ فارمر کے نزدیک الفارابی کی "کتاب الموسیقی الکبیر" سترھویں صدی تک مغرب کے موسیقاروں کے لیے مُوجبِ کشش رہی۔)

الفارابی نے سن ۹۵۰ میں دمشق میں وفات پائی۔ اس کی تین شاہکار کتابیں موسیقی کے نظریے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ وہ زبردست مغنی تھا اور دھنیں ترتیب دینے کے معاملے میں ذہنِ رسا رکھتا تھا۔ حطی بتاتا ہے ـــــ

۱۔ فارابی ترکیہ کے شہر فاراب کا رہنے والا عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا شمار دنیا کے چند عظیم ترین فلسفیوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ سچا درویش تھا۔ علم و فن سے بے پایاں محبت رکھتا تھا۔ دنیوی وجاہت اور دولت سے اسے سخت نفرت تھی۔ جب حلب کے فرماں روا ـــــ سیف الدولہ کے دربار میں گیا تو لوگ اسے دیوانہ سمجھے اور دربار میں اس کی آمد پر سخت برہم ہوئے۔ اس کے تن سے چیتھڑے لگ رہے تھے۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ اپنے اندر علم کے بے پناہ خزانے چھپائے ہوئے ہے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ستر زبانیں جاننے والے اس دیوانے سے بے تکلفانہ گفتگو کر سکے۔ وہ عالمِ طب تھا، بے مثال منطقی بھی، طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کا ماہر تھا۔ (مترجم)

"ملاوی کے درویش اب بھی اس کی بنائی ہوئی دھنوں میں پرانے گیت گاتے ہیں اور وہ جس خوبصورتی سے بانسری بجاتا تھا اس کے بارے میں تو کئی افسانے سننے میں آئے ہیں۔ اپنے مربّی سیف الدولہ کے دربار میں جب اس نے موسیقی کا مظاہرہ کیا تو تمام سامعین کو مسحور کرلیا اور ایک موقع پر تو اس نے دربانوں کو سلا دیا۔"

ابنِ سینا بھی کے علم میں بہت زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ راجر بیکن کے نزدیک وہ پہلا سکالر تھا جس نے موسیقی کی شفائی تاثیر کا اندازہ لگایا۔ حِٹّی جسے عرب فنِ موسیقی کا بنیادی پتھر کہتا ہے وہ اندلس میں رکھا گیا۔ یہ ۸۲۲ ش کی بات ہے جب عرب زریاب بغداد کی مواصلی درسگاہ سے قُرطبہ میں آیا۔ اس نے رباب میں پانچویں تار کا اضافہ کیا اور موسیقی کی درسگاہ بھی قائم کی۔ بعدازاں طُلَیطُلہ، بلنسیہ (ویلنیشیا) اور غرناطہ میں درسگاہیں کھل گئیں۔ سب میں سے اہم ترین درسگاہ اشبیلیہ میں کھلی۔

اشبیلیہ نے موسیقی کے آلات تیار کرنے کی وجہ سے شہرت پائی اور ان مصنوعات کی برآمد کو فروغ دیا۔ مغنّیوں کے نزدیک اشبیلیہ کو وہی مقام حاصل تھا جو علماء کے لیے قُرطبہ کو حاصل تھا۔

غالباً عیسائی راہب ایڈیلارڈ آف باتھ وہ پہلا شخص ہے جس نے سب سے پہلے لاطینی دنیا کو عربی موسیقی کے نظریات سے آگاہ کیا۔ اس شخص نے ریاضی پر کئی عربی کے شاہکاروں کا ترجمہ کیا۔ ان میں سے الخوارزمی کی ایک کتاب میں ایک فصل موسیقی پر تھی۔[1] عیسائی راہب نے بارھویں صدی کے نصفِ اوّل میں پیرس میں موسیقی کا مطالعہ کیا۔ یہاں اسے موسیقی کے موضوع پر کئی ایسے یونانی قلمی نسخے ملے جن کا ترجمہ مسلمان علماء نے کیا تھا۔

تیرھویں صدی کے آخر میں عیسائیوں کی موسیقی میں ایک یکسر نیا اصول کارفرما ہوا جسے مسلمان علماء نے رواج دیا تھا۔ یہ تال کا اصول ہے جس کے مطابق سر مقررہ وقفے سے لگائے جاتے ہیں۔ سرتال کا یہ قاعدہ مدت سے عربی موسیقی کا جزو لاینفک تھا۔

---

[1] موسیقی میں صوت اور تال باہم مربوط ہوتے ہیں۔ ان کے صحیح میل اور ربط کے بغیر دھن نہیں بنتی ایک طرف یہ علم طبعیات کی ذیل میں آتا ہے، دوسری طرف ریاضی کی ذیل میں، سروں کے وقفے مقرر ہیں۔ ڈھول یا ڈھولک اور طبلے کی ضربیں مقررہ گنتی اور وقت کی پابند ہوتی ہیں اس لیے خوارزمی کی کتاب ریاضی میں موسیقی کا بیان برمحل ہے (مترجم)

فلپ حِتّی لکھتا ہے ـــــــ

''سُر تال کی موسیقی اس شعبہ علم میں عربوں کا عظیم ترین کارنامہ ہے لیکن ایک اسی کارنامے پر کچھ موقوف نہیں، عربوں نے مغربی یورپ کو دو ایسے ساز دیے جن سے فن موسیقی کے فروغ میں سب سے زیادہ مدد ملی۔ ایک کا نام عُود تھا (اسے اندلسی زبان میں لاڈ کہتے) اور دوسرے کا نام رباب تھا (جسے اندلسی ریبل کہتے)''

حِتّی ایسے دوسرے سازوں کی بھی فہرست دیتا ہے جو آج بھی یورپ میں مقبول ہیں اور جنھیں عربوں نے ایجاد کیا۔ ان میں ڈھول، طنبورہ، جھانجی اور کِتّار کا نام شامل ہے۔ بلاشبہ رباب وہ ساز ہے جو مغربی سازوں میں مقبول ترین ساز ـــــــ وائلن کا پیشرو ہے۔

مغربی موسیقی پر عربوں کے اثرات، نظریے اور حکمت کی بناء پر نہیں بلکہ اس لیے ہیں کہ لوگ عربی موسیقی پسند کرتے تھے۔ ایک جانب تو اندلس کے عیسائیوں نے عربوں کے لائے گیت اور شعر پسند کیے، دوسری جانب یکساں طور پر عربی غزلوں کی دُھنیں اور سر تال قبول کیے اور اس سے لطف اندوز ہوئے۔ غرناطہ کے سقوط کے بعد بھی اندلسی حکمرانوں کے درباروں میں مدت تک مسلمان مغنیوں کا دور دورہ رہا۔ عرب رقاصائیں اور تماشا گر اندلس اور پرتگال کے لوگوں کا جی بہلاتے رہے۔ اسپینی ریویرا کی تازہ تحقیقات سے اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ تیرھویں صدی اور اس کے بعد پورے جنوب مغربی یورپ کی مقبولِ عام موسیقی کا اصل اندلسی مسلمانوں کی موسیقی ہے۔ اندلس ہی سے اس کا سراغ عرب میں جا ملتا ہے۔ اگر عرب علماء ایرانی، بازنطینی اور یونانی ماخذوں، کو محفوظ نہ کر لیتے اور اپنی طبعی ذہانت کی بدولت انھیں اپنے اسلوب میں ڈھال نہ لیتے تو وہ کامل طور پر مغرب میں گم ہو چکے ہوتے۔

اسلام اور شہسواری شہسواری کو فنون میں شامل کرنا قارئین کے نزدیک ایک احمقانہ حرکت ہوگی لیکن یاد رہے کہ اندلس کے زرّیں دورِ شجاعت میں صُرف ادب، موسیقی اور مصوری کے کمال ہی کو سراہا نہ جاتا، شہسواری کے فن کا بڑے استغراق اور بڑی لگن سے مطالعہ کیا جاتا، گھڑسواری اور گھوڑوں کی پرورش میں بڑی مہارت پیدا کی جاتی۔

جان ولیم ڈریپر لکھتا ہے ــــــ

"فرانسیسیوں، جرمنوں اور انگریزوں نے عربوں سے گھوڑے کی قدر کا جذبہ لیا۔ ماہرانہ سواری پر نازاں ہونا سیکھا، انھوں نے عربوں کی اس مہارت تک پہنچنے کی سعی کی۔ جس نے اندلسی گھوڑوں کی مشہور و معروف نسل پیدا کی۔"

دیگر تفریحی فنون تفریح اور تماشے کو یقینی طور پر فنون میں شامل کرنا چاہیے (نغماتی تفریحات کے علاوہ عربوں نے داستان گوئی میں کمال کر دکھایا۔ وہ بڑی ہنر مندی اور بڑے دلفریب انداز سے سائے کا کھیل بھی دکھاتے۔ [1] گمان غالب ہے کہ وہ "سایہ بازی" کو مشرقِ بعید سے یورپ میں لائے لیکن جہاں تک سایہ بازی سے کٹھ پتلیوں کے کھیل کے پروان چڑھنے کا سوال ہے یہ یقینی طور پر عربوں کی اپج ہے۔ کٹھ پتلیوں کے کھیل جن میں مزاحیہ دانش کا عنصر ملتا، تیرھویں صدی میں مروج رہے۔ انھیں ہم بخوبی مغرب کی بعض موجودہ تفریحات کا پیشرو سمجھ سکتے ہیں۔)

فلپ ہٹی شطرنج کے رواج کے ضمن میں مغربی یورپ کو مسلمانوں کا مرہونِ منت سمجھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ عربوں نے شطرنج ایجاد نہیں کی تاہم یہ بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قوم نے کیونکر اس دلفریب، ماہرانہ کھیل کے امکانات جھٹ جان لیے جس نے دنیا کے چند عظیم ترین ریاضی دان پیدا کیے۔ اگرچہ تفریح پسندانہ زندگی کو بالیقین مہذبانہ زندگی کے مترادف قرار نہیں دے سکتے لیکن تہذیب و تمدن کی تعریف میں بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں نے کئی پہلو سے تفریحی زندگی سنوارنے سجانے میں گراں قدر کام کیا ہے۔

---

۱ SHADOW PLAY یا SHADOWGRAPH میں پردے پر کٹھ پتلیوں یا زندہ اداکاروں کا سایہ ڈالتے۔ اس طرح داستان میں ڈرامائی وصف پیدا ہو جاتا۔ (مترجم)

اِسلام اور تعلیم

اسلامی دور میں تعلیم دنیائے اسلام میں تعلیم بجلی کی سرعت سے عام ہوئی۔ایک بار رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا ـــــــ

"بچے کو تعلیم دینا خیرات میں سونا دینے سے بہتر ہے۔"

اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے عہدِ بنوامیہ کے پہلے چار خلفاء نے اس امر کو ملحوظ رکھا کہ ان کے نئے مفتوحہ علاقوں میں ابتدائی تعلیم رائج کی جائے۔چنانچہ مکہ، مدینہ، یمن، دمشق، قاہرہ، اسکندریہ، کوفہ، بغداد، بصرہ اور نیشاپور ایسی جگہوں پر درسگاہیں قائم کی گئیں۔بعد کے زمانے میں انھیں درسگاہوں کے لیے علم اور تحقیق کے عظیم مرکزوں کا مقام مقدر رتھا۔انھی پر موقوف نہیں بلکہ شام، عراق اور مصر کے دور افتادہ دیہات میں بھی مدرسے قائم کیے گئے۔

ایک بھی ایسا گاؤں، قصبہ یا شہر نہ رہا جہاں کم از کم ایک مسجد نہ بنائی گئی ہو۔ابتدائی اور ثانوی مدرسے مسجدوں کے ساتھ ساتھ بنائے گئے۔ہسپانیہ کا نامور اسکالر، پروفیسر بیلا سیترس اور اس کا ہم وطن پرفیسر ری ویرا ہمیں بتاتے ہیں کہ تقریباً تمام بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔اعلیٰ تعلیم کے لیے طلبہ کالجوں، اکادمیوں اور یونیورسٹیوں میں چلے جاتے یا پھر کسی ایک استاد سے علم حاصل کرتے۔فرماں روا، شہزادے، بادشاہ، وزیر، خوشحال لوگ، زمیندار اور رؤسا علم کی سرپرستی کرنے، اسکول اور کالج کھولنے، معمل قائم کرنے نیز شفاخانے، کتب خانے اور رصد گاہیں کھولنے کو مقدس فرض سمجھتے۔

آغاز میں اسلامی تعلیم دینی انداز کی تھی اور اعلیٰ تعلیم کے اوّلین ادارے اعلیٰ دینی مطالعے کے لیے مخصوص تھے۔۸۳۰ش میں المامون نے بغداد میں دینی درسگاہ قائم کی تھی۔

ستاروں کے مشاہدے کے لیے اس سے ملحقہ معروف رصدگاہ بنائی گئی تھی۔ ۱۰۶۵ء میں نظام الملک نے عظیم دارالعلوم نظامیہ قائم کیا جہاں ایک سے زائد علوم پڑھائے جاتے تھے۔

''نظامیہ'' کا قیام اسلامی تعلیم کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ روبین لیوی جو ۱۹۲۹ء میں کیمرج میں تالیف و تصنیف کا کام کرتا رہا ہے اپنی ''تاریخ بغداد'' میں لکھتا ہے: ''اس دارالعلوم کی کتنی ہی باتیں یورپ کی ابتدائی یونیورسٹیوں میں اختیار کی گئیں۔ ان میں سے ایک اس کا دارالاقامہ تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ نظامیہ میں لیکچرار چبوترے پر کھڑا ہوتا اور طلبہ نیچے اسٹولوں پر بیٹھتے اور اس سے لکھ کر یا زبانی سوال کرتے۔ الغزالی نے یہاں چار سال تک لیکچر دیے۔ یہیں اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تعلیم محض سبق یاد کر لینے کا نام نہیں۔ استاد اپنے طلبہ میں اخلاقی شعور بھی بیدار کرے۔ نظامیہ کے طلبہ میں معقول طور سے نظم و ضبط پایا جاتا تھا اور ان میں مل کر کام کرنے کا جذبہ بھی موجود تھا۔

''نظامیہ'' منگولوں کے حملے کے بعد بھی سلامت رہا اور پھر اسے المستنصر یہ یونیورسٹی میں مدغم کر دیا گیا۔ اس یونیورسٹی کا بڑا شاندار کتب خانہ تھا۔ یہاں کے قیام پذیر طلبہ کی ضرورت کے لئے غسل خانہ اور باورچی خانہ بھی تھا۔

اس کے علاوہ جو دوسری یونیورسٹیاں قائم ہوئیں وہ الرشیدیہ، امانیہ، ترخانیہ، خاتونیہ، شریفیہ (شام میں) رمبیہ اور صلاحیہ (مصر میں) تھیں۔ بعد کے زمانے میں نظامیہ کی طرز کے تیس دارالعلوم بغداد میں، تیس اسکندریہ میں اور چھ موصل میں قائم ہوئے۔ کم از کم ایک ایک ایسا ہی دارالعلوم نیشاپور، سمرقند، اصفہان، مرو، بلخ، حلب، غزنی اور لاہور میں قائم ہوا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے دمشق کو درسگاہوں کا شہر بنا دیا۔ مصر میں بھی کتنے ہی دارالعلوم کھولنے کا سہرا اس کے سر ہے۔

عہدِ اسلامی کے اندلس میں کئی کالج اور دینی ادارے کھولے گئے۔ تنہا قرطبہ میں کئی سو درسگاہیں تھیں جن میں دینی علوم کے علاوہ فلسفہ، ادب، تاریخ اور سائنس کی تعلیم دی جاتی۔ ان کے علاوہ اشبیلیہ، ملاقہ اور غرناطہ میں بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ ان سب کے دروازوں پر یہ الفاظ کندہ تھے ـــــ

''دنیا چار چیزوں ـــــ دانشوروں کے علم، بڑے آدمیوں کے عدل، اہل دین

کی دعاؤں اور بہادروں کی دلیری کے سہارے قائم ہے۔"

یہ الفاظ آج بھی ان اصولوں کو عیاں کرتے ہیں۔ جدید یونیورسٹیوں کے نظام میں جاری اور ساری ہیں۔ یورپ، افریقہ اور ایشیا کے طلبہ ان اسلامی یونیورسٹیوں میں ہجوم کرتے جہاں ان کا خیر مقدم کیا جاتا۔

اسلام کے ابتدائی ایام ہی سے تعلیم کی ترویج کے لیے امکان بھر سعی کرنے کی غرض سے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ مسلمانوں میں خیرات کے شاندار وصف کے پہلو بہ پہلو علم کا احترام اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اس کا نتیجہ بے شمار وظائف اور تحائف اور عطیات کی صورت میں عیاں ہوا۔ دینی درس گاہیں قائم کرنے کے علاوہ مسلمان امراء نے شفاخانوں کے قیام میں مدد دی۔ یہ شفاخانے طبی درس گاہوں اور مشاہدہ گاہوں کا کام دیتے جہاں طلباء کو ریاضی اور ہیئت کا درس دیا جاتا۔ کتب خانوں اور خاص طور پر مسجدوں کے نام لوگ اکثر روپیہ وقف کر جاتے جہاں کتنے ہی نامور علماء فخر سے درس دیتے۔

مسلمانوں کی اکثریت کے لیے مسجد ہمیشہ تعلیم و تدریس کا عظیم مرکز رہی ہے جہاں بلا امتیازِ مذہب و ملت تعلیم دی جاتی تھی۔ فراخدلانہ امداد کی بدولت مفلس ترین طلبہ کو بھی شریکِ درس ہونے کی سہولت میسر آتی۔ مسافروں کے لیے خاص عمارتیں الگ تھیں جہاں حاجت مندوں کو مفت کھانا دیا جاتا۔ اعلیٰ تعلیم پانے والوں کو عام طور پر مالی امداد دی جاتی جس سے وہ اپنی ذات کو تعلیم کے لیے وقف کر سکتے۔ مسجد کا وظیفہ امتیازی طلب کی چیز بن گیا۔ ناصر خسرو نے (گیارھویں صدی میں) لکھا تھا کہ عظیم مسجد قاہرہ ـــــ الازہر میں کوئی پانچ ہزار طالب علم پڑھتے تھے۔ انھیں مختلف مضامین میں درس دیا جاتا۔[1] عظیم مسجد قاہرہ، الازہر فاطمی خلیفہ معز (۹۶۹ تا ۹۷۰ ش) نے بنائی اور اسے عطیات سے نوازا۔ اس کے پوتے حکیم نے عطیات میں اضافہ کیا۔ المانوی مستشرق ہمیر کے بقول مزید تین مسجدوں اور دار العلوم کو بھی عطیات سے نوازا۔ اس نے ایسی مثال قائم کی جس سے ملک بھر میں عطیات و تحائف کا تانتا بندھ گیا۔

---

[1] کہتے ہیں بغداد میں نامور فقیہہ اور عالم دین مالک ابن انس بخاری کے درس میں بیس ہزار سامعین شریک ہوتے امام ابو حنیفہ کے شاگرد دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے تھے۔ (مترجم)

اسلامی اندلس میں تعلیم اسلامی دور میں جہاں جہاں تعلیم عام ہوئی وہاں غالباً سب سے زیادہ اندلس کو فائدہ پہنچا۔ الحکم الثانی المستنصر (۹۶۱ تا ۹۶۷ ش) کی سرپرستی کی بدولت اندلس میں یونیورسٹی کی تعلیم کو ترویج کی تحریک ملی۔

الحکم الثانی المستنصر خود عالم تھا۔ علم وفن پر اس کا بڑا اعتقاد تھا۔ بدیں سبب اس نے طلبہ پر بڑی فیاضی سے اپنی عنایات کے دروازے کھول دیے اور دارالخلافہ میں ایسی درسگاہیں قائم کیں جہاں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ عبدالرحمان ثالث نے جامع مسجد میں جو جامعہ قرطبہ قاہرہ کے الازہر اور بغداد کے نظامیہ پر بھی سبقت لے گیا، اس میں نہ فقط اندلس بلکہ یورپ افریقہ کے طلبہ مسلمان اور عیسائی دونوں کھنچ آئے۔ الحکم نے یونیورسٹی کو وسعت دی اور اس کی آرائش کی۔ اس نے مشرق سے علماء بلوائے اور اپنی ذاتی املاک میں سے ان کے مشاہرے کی رقم الگ کی۔ مورخ ابن القطیہ اور عالم لسانیات ابوعلی القالی یہاں کے اعلیٰ معلم تھے۔ الحکم کتابوں کا دیوانہ تھا۔ اس کے کارندوں نے بغداد، اسکندریہ اور دمشق کے کتب فروشوں کو لوٹ لیا۔ انھوں نے قرطبہ کے کتب خانے کے لیے کتابیں خریدیں اور مسودے نقل کیے۔ اس طرح جو کتابیں اکٹھی کی گئیں ان کی تعداد چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ ان کی فہرست چوالیس جلدوں میں تیار ہوئی، ہر جلد میں بیس ورق صرف شعروسخن کی کتابوں کے لیے رکھے گئے۔ غالباً الحکم خلفائے اسلام میں سب سے بڑا عالم تھا۔ اس نے بعض مسودوں پر جو حاشیے لکھے تھے بعد کے زمانے کے علماء نے ان کی بڑی قدر کی۔

اندلس میں صرف یونیورسٹی کی سطح پر ہی تعلیم عام نہیں ہوئی۔ الحکم ثانی نے عظیم مسجد قرطبہ کی تعمیر کے بعد اپنی توجہ ابتدائی تعلیم کی جانب مبذول کی۔ اپنی زمین کا چوتھائی حصہ اس کے لیے وقف کیا۔ یہ بھی ہدایت کی کہ سالانہ آمدنی اندلس کے غرباء میں تقسیم کی جائے۔ اس شہزادے کا ایک اور ادارہ توجہ طلب ہے۔ اس کے عہد میں پرائمری اسکول اچھی حالت میں تھے اور بہ کثرت تھے۔ اندلس میں قریب قریب ہر شخص لکھ پڑھ سکتا تھا جبکہ یورپ کی یہ حالت تھی کہ صرف اعلیٰ رتبے کے لوگ ——— بشرطیکہ وہ کلیسا سے وابستہ ہوتے تعلیم پاتے بہرحال الحکم کا خیال تھا کہ تعلیم اس قدر عام نہیں جس قدر اسے ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رہے کہ اسے غریب طبقے سے جو محبت تھی اس کی بناء پر اس نے دارالخلافہ میں ایسی ستائیس درسگاہیں کھولیں جن میں غریبوں کے لڑکے مفت پڑھتے۔ استادوں کو خلیفہ کی جیب خاص سے مشاہرہ ملتا۔[1]

---

[1] ڈوزی کی تالیف ص ۵۳۵ الازہری جلد دوم صفحہ ۲۵۶

کیمبرج یونیورسٹی کے جے۔بی۔ٹرینڈ نے اندلس میں تعلیم میں مسلمانوں کے حصے کا خلاصہ بدیں الفاظ پیش کیا ہے ——

"اسلام کے عہدِ زرّیں میں مشرق وسطیٰ عربوں کے اندلس اور پرتگال میں شاندار درسگاہیں قائم کی گئیں۔لائبریریاں کتابوں سے بھری گئیں۔پوری مسیحی دنیا سے طلبہ کھنچ کھنچ کر اسلامی درسگاہوں میں آتے۔ طلیطلہ کی درسگاہوں میں جن نامور عیسائی شخصیتوں نے تعلیم پائی ان میں مائیکل اسکاٹ، ڈینیل، مورلے، ایڈیلارڈ آف باتھ اور قرآن کا پہلا مترجم روبرٹس انگلیکس شامل ہے۔"

ہندوستان میں مسلمانوں کا تعلیمی کارنامہ ہمارا یہ برِ اعظم (پاکستان اور ہندوستان) بیشتر بڑی بڑی تعلیمی درسگاہوں کے لیے مسلمانوں کا مرہونِ منّت ہے۔سلطان نصیر الدّین [1] علم و فن کا مربیِ اعظم تھا۔۱۲۱۱ء میں اس نے دہلی میں پہلا مدرسہ قائم کیا۔اس کا نام نصیریہ تھا۔اس کا جانشین بلبن بھی علماء پر نظرِ کرم رکھتا۔جب وسطی ایشیا پر ظالم منگولوں نے حملہ کیا تو بہتیرے علماء نے بھاگ کر اسی کے دربار میں پناہ لی۔بلبن نے انھیں اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں جاگیریں عطا کیں اور انھوں نے درسگاہیں کھول لیں۔فیروز آباد بین الاقوامی مرکز علم وفن بن گیا اور اس نے تیزی سے وہی شہرت حاصل کر لی جو قبل ازیں سمرقند اور بخارا کو حاصل تھی۔

بہر حال خلجیوں کے زمانے میں اسلامی علوم وفنون کی تعلیم ہندوستان میں نقطۂ عروج کو پہنچی۔ضیاء الدین برنی ہمیں بتاتا ہے کہ ——

"لوگوں نے علاؤالدّین خلجی کے عہد میں جو سب سے حیرت خیز بات دیکھی وہ یہ تھی کہ ہر قومیت کے اکابر دارالحکومت (دہلی) میں جمع تھے —— ان میں علماء، شاعر، سائنسدان، طبیب، اور فن کار وغیرہ شامل تھے۔ ذہانت کے اس تنوع اور اہلِ علم وفن کی بدولت

---

[1] بادشاہ نصیر الدین قرآن مجید لکھتا اور اس کی آمدنی سے اپنا گزارہ کرتا۔مورخ فرشتہ کے بیان کی رُو سے بادشاہ نے اپنے کتب فروشوں سے کہہ رکھا تھا کہ وہ خریداروں کو قرآن مجید کے لکھنے والے کا نام نہ بتائیں مبادا اس کا نام قیمت میں اضافے کا موجب بنے۔

بغداد بھی دِلّی پر رشک کرنے لگا جو قاہرہ کا حریف اور قسطنطنیہ کا ہمسر ہو گیا تھا۔ دِلّی کا عالم حکمران محمد تغلق فاضلِ اجل اور شاعر تھا۔ وہ دربار میں مختلف موضوعات پر مباحثے اور مذاکرے کرواتا، علم وفن کا بڑا سرپرست تھا۔ نیز علم کے فروغ اور تعلیم کی توسیع پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتا ...... صرف دلی میں کوئی ایک ہزار درسگاہیں تھیں اور ایسا کوئی معلوم موضوع یا مضمون نہ تھا جس کی ان درسگاہوں میں تعلیم نہ دی جاتی۔"

محمد تغلق کے جانشین فیروز شاہ تغلق نے تعلیم کے معاملے میں اور بھی زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ کیا۔ اس نے فلاحِ عامہ اور تعلیم پر ایک کروڑ چھتیس لاکھ روپے صرف کیے۔ صرف دلی میں اعلیٰ پائے کی چھتیس درسگاہیں کھولیں اور ایک اقامتی یونیورسٹی قائم کی جہاں طلبہ اور معلمین دونوں کے اخراجات حکومت پورے کرتی۔ سلطان فیروز تغلق نے بہ نفسِ نفیس اپنے عہد کی تاریخ لکھی جس کا نام "فتوح الفیروزی" تھا جس نے بڑی شہرت پائی۔ اس میں لکھا ہے ــــــ

"میں نے اسے اپنا فرض سمجھا کہ کارواں سراؤں، مسجدوں، کنوؤں، آبی ذخیروں، نہروں محتاج خانوں اور مدرسوں ایسی رفاہِ عامہ کی تعمیرات... مرمت کرواؤں جنھیں میرے پیشروؤں نے بنوایا تھا اور اس مقصد کے لیے آمدنی کا خاصا حصہ مخصوص کیا۔"

فیروز شاہ نے جو مدرسہ قائم کیا اور جلال الدین جس کے رئیس الاساتذہ مقرر ہوئے مشرق میں اسلامی علوم وفنون کا ایک اور مرکز بن گیا اور برِ اعظم ہند کے ہر گوشے سے لوگ کھنچ کھنچ کر اس میں آئے۔ رعایا کو مختلف پیشوں اور کاموں کی تربیت دینے کے لیے فنی سکول کھولے اور بے روزگاری کا مسئلہ حل کرنے کے لیے دفترِ روزگار قائم کیا۔ اس نے سنسکرت کی متعدد کتابیں فارسی میں منتقل کروائیں۔ سخت گیر نادر شاہ تک کتابوں کا عاشق تھا چنانچہ دلی کے کتب خانے میں تیمور لنگ نے جو کتابیں چھوڑیں تھیں وہ انھیں اپنے کتب خانے کے لیے ایران لے گیا۔ تیمور لنگ کو بھی کتابوں سے بڑا عشق تھا۔

جو مسلمان حکمران دلّی کی سلطنت سے علاحدہ ہو گئے انھوں نے بھی اپنی اپنی مملکت

میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے بہت کچھ کیا۔ دکن کے بہمنی سلاطین نے گاؤں گاؤں تعلیم عام کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے دیہی مسجدوں اور درس گاہوں کو بڑی فیاضی سے عطیات دیے۔ لگاتار تین بہمنی سلاطین کے عالم و فاضل وزیر محمود گاواں نے بیدر میں بہت بڑا کالج کھولا۔ اس کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں جن سے تعلیم پھیلانے کے لیے بہمنی سلاطین کے جذبے کا سراغ ملتا ہے۔ گولکنڈہ کے سلطان قطب نے کالج اور عوامی دارالعلوم کھول کر علم و فن کی اشاعت میں ہاتھ بٹایا۔ بنگال کے سلطان حسین نے اپنے مربی، بزرگ قطب عالم کی یاد میں بہت بڑا کالج بنوایا۔

دِلّی میں درس و تدریس کی سرگرمیاں بدستور ترقی پر رہیں۔ دِلّی کے تمام مغل سلاطین علم و فن کے بڑے عاشق تھے اور انھوں نے ہر پہلو پر تعلیم کو فروغ دیا۔ سلطان ظہیرالدین بابر کا وزیر اور مورّخ سیّد مقدر اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ سلطان کے دور میں رفاہِ عامہ کے شعبے کا ایک کام چھوٹی بڑی پرانی درسگاہوں کی دیکھ بھال کرنا اور نئی درسگاہیں کھولنا تھا۔ جب سلطان نے دوبارہ تختِ دہلی حاصل کیا تو اس نے وہاں ایک کالج قائم کیا اور شیر شاہ نے جو عشرت محل تعمیر کیا تھا اسے ایک نفیس لائبریری میں منتقل کر دیا۔

شہنشاہ اکبر نے کتنے ہی سکول اور کالج کھولے جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک سی تعلیم دی جاتی۔ اکبر کے عہد میں بلوکمان نامی ایک یورپی اسکالر دلی میں آیا تو فتح پور سیکری میں بھی گیا جہاں اس نے اکبر کا قائم کیا ہوا ایسا عظیم تعلیمی ادارہ دیکھا۔ شاید ہی کوئی سیاح اس کے پایے کے کسی ادارے کا نام لے سکے۔ اکبر نے نادر کتابوں کی ایک بہت بڑی لائبریری بھی قائم کی۔ ملا پیر محمد کو اس کا ہمہ وقتی نگران مقرر کیا۔ اکبر نے آگرہ، دہلی، الہ آباد اور کتنے ہی دوسرے شہروں میں چھوٹی بڑی متعدد درسگاہیں کھولیں۔ ہر قومیت کے لوگ ان میں داخل ہوتے اور اعلیٰ تعلیم پاتے۔ یہ اقامتی درسگاہیں تھیں اور سرکار ان کی دیکھ بھال کے لیے فراخدلی سے مالی امداد دیتی۔ سرکاری درسگاہوں کے علاوہ دلی دربار، دوسرے مقامات اور دوسرے درباروں کے امراء و رؤساء نے کئی نجی درسگاہیں اور دارالعلوم قائم کیے، وہی ان کی دیکھ بھال کرتے۔ ۱۵۱۶ء میں اکبر کی دایہ ماہم انگہ نے دلی میں دارالعلوم کھولا۔

اکبر کا بیٹا اور ''تاریخ جامِ جشن'' کا مصنف جہانگیر لکھتا ہے کہ اس نے تمام مکتبوں مدرسوں اور کالجوں کی مرمت کی۔ ان میں ایسی درسگاہیں بھی تھیں جنہیں پچھلے تیس سال سے

نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ انھیں طالب علموں اور معلموں سے معمور کیا اور روپے پیسے سے ان کی مخیرانہ مدد کی۔ شاہجہان کو بھی تعلیمی سرگرمیوں سے لگن تھی۔ اس نے دلی کی جامع مسجد کے قریب ایک دارالعلوم قائم کیا اور اس کی دیکھ بھال کی۔ اس کے زمانے میں ایک یورپی سیاح جو دلی آیا تھا اس نے ۱۶۴۲ء میں شاہی کتب خانے میں چوبیس ہزار کتابیں پائیں۔

اورنگ زیب نے اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کے معاملے میں غیر معمولی جذبے کا اظہار کیا۔ اس نے اپنی سلطنت کے تمام صوبائی گورنروں کے نام فرمان جاری کیا کہ وہ وظیفے مقرر کر کے غریب طلبہ کو مدد دیں۔ اس نے گجرات کے بوہروں کے لیے تعلیم لازم قرار دی اور اس سلسلے میں غفلت برتنے والوں کے لیے سخت سزائیں نافذ کیں۔ لکھنؤ میں اس نے ایک ولندیزی کاروباری مرکز کو بڑے مدرسے میں تبدیل کر دیا۔ شہنشاہ کے اس اقدام سے تحریک پا کر قاضی رفیع الدین ایسے کتنے ہی اصحاب نے دارالعلوم قائم کیے۔ ایسا ہی ایک دارالعلوم مولانا اکرم الدین نے ۱۶۹۷ء میں ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے سے لکھنؤ میں قائم کیا۔ مولوی عبدالحکیم نے سیالکوٹ کا معروف مدرسہ قائم کیا۔

بہادر شاہ اور محمد شاہ کے عہدِ حکومت میں بھی درسگاہوں کا قیام عمل میں آتا رہا شہزادوں اور عمائدِ سلطنت نے بھی درسگاہیں کھولیں جیسے غازی الدین اور فیروز جنگ کے دارالعلوم۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کے کمزور جانشینوں تک نے تعلیم کی اشاعت میں رکاوٹ نہ ڈالی۔ لاریب آخری زمانے کے مغل تاجداروں کے عہد میں تعلیمی ترقی نصف النہار پر پہنچی۔ اس دور میں چند بہترین شاعر، متعدد عالم اور خطاط پیدا ہوئے۔ اودھ کا فرماں روا نظام الملک سعادت خاں، بنگال کا حکمران علی وردی خاں اور میسور کا سلطان ٹیپو یہ سب تعلیم یافتہ اور عوامی تعلیم کے دلدادہ تھے جس میں عورتوں کی تعلیم شامل تھی۔

ہند میں مسلمانوں کا دورِ حکومت اس لیے بھی یادگار ہے کہ اس میں کتنی ہی فاضل عورتیں ہو گزری ہیں۔ سلطانہ رضیہ بڑی باکمال عورت تھی۔ یہ شہزادی سیاست میں مہارت رکھتی تھی۔ خواجہ معین الدین اجمیری علیہ الرحمتہ کی صاحبزادی حفیظ جمال نے تعلیم عام کرنے میں جان و دل سے کوشش کی۔ نامور مورخ اسٹینلے لین پول لکھتا ہے کہ شہنشاہ بابر نے والدہ ماجدہ قتلک نگار خانم سے تعلیم پائی۔ بابر کی بیٹی گلبدن خانم اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ یہی شاہزادی "ہمایوں نامہ" کی مصنف ہے۔ بابر کی

دوسری بیٹی گل رخ خاں فارسی اور ترکی ادب میں بڑا تجر رکھتی تھی۔ شہنشاہ ہمایوں کی بھانجی سلیمہ سلطانہ نفیس شاعرہ تھی۔ اکبر کی دایہ ماہم انگہ کا ایک درسگاہ کے قیام کے سلسلے میں اوپر ذکر آیا ہے۔ وہ عوام کی تعلیم میں علمبردار کا مقام رکھتی ہے۔ سلطانہ، چاند بی بی، نور جہاں، ممتاز محل، شاہجہان کی معلمہ رقیہ بیگم، دارشکوہ کی بیوی نادرہ بیگم، شہزادی زیب النسا، جہاں آرا اور روشن آرا جو علی الترتیب شہنشاہ اورنگ زیب کی بیٹی اور بہنیں تھیں ——— سب کی سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باکمال خواتین تھیں۔

دنیا میں مسلمانوں کی تعلیم کے پھیلاؤ کے اسباب جوزف ہیلی اپنی مشہور کتاب "عربوں کی تہذیب" میں اس بات کی تشریح کرتا ہے کہ کیوں جہاں جہاں اسلام پھیلا وہاں وہاں لازمی طور پر تعلیم بھی عام ہوئی۔ وہ لکھتا ہے ———

"اسلام حصولِ علم کے ذی قدر جذبے، علم کی آرزو، رواداری کے جذبے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ علم کی سرحدوں کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لیے بیقراری کا ایسا جذبہ تھا جو مسلمانوں کی ذہنیت کی امتیازی خصوصیت ظاہر کرتا ہے اور بلند مقصد کے لیے محرک ہوتا ہے۔"

مورخ کرافورڈ اپنی کتاب کی دوسری جلد میں علم سکھانے والوں کی حیثیت سے مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی کے اسباب کی مزید تشریح کرتا ہے ———

"وہ (یعنی مسلمان) سولہویں صدی میں ہسپانیوں کی طرح فاتح بن کر نہیں آئے۔ انہوں نے تلوار کو مذہب میں تبدیل کروانے کے لیے بطورِ حربہ استعمال نہیں کیا ——— انہوں نے اعلیٰ اور مقتدر نسل ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا جس سے وہ مفتوحہ علاقے کے اصل باشندوں کو ذلیل وخوار کر سکتے اور انہیں کچل سکتے۔ وہ تو سیدھے سادھے معلموں کی حیثیت سے آئے اور انہوں نے اپنی اعلیٰ ذہانت اور تہذیب وثقافت کو اپنے مذہب کی خدمت کے لیے وقف کیا۔ اسے انہوں نے اپنا الو سیدھا کرنے اور دولت سمیٹنے کا ذریعہ نہیں بنایا۔"[1]

---

[1] کرافورڈ کی کتاب، جلد دوم ص ۲۶۳

اسلام میں تعلیم کی بنیادیں مسلمان بچے کی تعلیم گھر سے شروع ہوتی ہے اور یہ اس کے باپ کا فرض ہے کہ اُسے "کلمہ" سکھائے۔ چھ سال کی عمر میں اس پر نماز فرض ہو جاتی ہے اور اب وہ سب سے قریبی مسجد میں رسمی تعلیم پانے لگتا ہے۔

یہاں وہ ابتدائی مرحلے پر لکھنے پڑھنے پر توجہ مرکوز کرے گا۔ قرآن اس کے نصاب کی کتاب ہے اور اس کی منزل یہ ہے کہ پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرے اور پھر غالباً وہ ایک دن اسے دوسروں کے لیے نقل کرے گا۔ حضرت علیؓ کا ایک قول ——

"میں اس کا غلام ہوں جس نے صرف ایک ہی لفظ سکھایا۔"

یہ ظاہر کرتا ہے کہ استاد کے کس قدر احترام کی ضرورت تھی۔

ابتدائی تعلیم میں حفظِ قرآن نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ویسے قرآن کے ساتھ ساتھ دوسرے مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ سادہ حساب اور غالباً کچھ نظمیں پڑھائی جاتیں۔[1] اس مرحلے پر لڑکوں کے پہلو بہ پہلو لڑکیاں بھی عموماً مدرسے جاتیں لیکن اعلیٰ تعلیم شاذ ہی حاصل کرتیں۔

دینی مدرسے یا یونیورسٹی میں جانے کے لیے خود پیغمبرِ اسلام کے ان الفاظ سے طالب علموں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے ——

"جو علم حاصل کرنے گھر سے نکلے وہ گھر لوٹ آنے تک خدا کے راستے پر چلتا ہے۔"

پھر یہ حدیث ہے ——

"جو علم کی خاطر سفر کرتا ہے خدا اس کے لیے جنت کی راہ ہموار کرتا ہے۔"

اچھے مسلمان سے توقع رکھی جاتی کہ کبھی حصول علم کی جدوجہد ترک نہیں کرے گا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——

"مہد سے لحد تک علم حاصل کرو!"

آپ نے حصول علم کی کوشش کو "جہادِ اکبر" فرمایا اور کہا ——

---

[1] طلبہ کو شروع ہی میں سعدی علیہ الرحمت کا وہ پند نامہ ازبر کروایا جاتا جس کا پہلا شعر ہے۔
کریما ببخشائے بر حالِ ما   کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا

"جہالت دور کرنے کے لیے طالب علم کی مساعی اور علم میں کمال پانے کی کوشش سب سے بڑا اجہاد ہے۔"

اس سلسلے میں رسول اکرمؐ عالم کی روشنائی کو شہیدوں کے خون سے مقدس تر سمجھتے ہیں۔

یہ ہے وہ ماحول جس میں مسلمان نوجوان پروان چڑھے علم کے حصول پر ایمان رکھتے اور جس میں ہر شخص کو حصول علم کی آزادی بخشی گئی۔ آزادی کے اس تصور میں اسلام نے علم سکھانے کی آزادی بھی عطا کی۔ جو شخص چاہتا معلّم بن جاتا۔ اگرچہ امتحان کا رواج نہ تھا تاہم اس نظام میں عوامی کردار اس امر کی ضمانت دیتا تھا کہ تمام معلّم معقول استعداد پیدا کریں۔

پڑھنے اور پڑھانے کی آزادی یہ درست ہے کہ مسلمان نوجوان کو بیشتر دینی تعلیم دی جاتی لیکن اصول علم کی تعلیم کا طریقہ میکانکی تھا نہ بلا حیل و حجت اسلامی تعلیمات کے حصول کی پابندی تھی۔ قرآن کی آیت کریمہ "اے میرے اللہ! میرا علم زیادہ کر!" اسے بجا طور پر اس رجحان کا پتا چلتا ہے جو آدمی کو اپنے مذہب کے بارے میں رکھنا چاہیے۔ لفظ "زیادہ کر" کو دیکھیے۔ یہ تنگدلانہ اور محدود اصول نہیں بلکہ تعلیم کا وسعت پذیر، پھیلتا ہوا اور محرک اصول ہے۔ نامور ماہر تعلیم ڈاکٹر بلگرامی اپنے کتابچے "تعلیم کے چند پہلو" میں اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

> "اسلام کا نظامِ تعلیم نہ صرف طویل المیعاد نظریہ حیات بلکہ وسیع تر اور ارفع نظریہ حیات تسلیم کرتا ہے۔ اس میں جسم، ذہن اور روح کی موزوں ترقی کی کاملاً اجازت ہی نہیں بلکہ اس سے مقصدِ حیات کا پتا چلتا ہے جس سے "کل" تابناک ہو جاتا ہے۔ یہ مرکزی نقطہ ہے، سرچشمہ ہے، تعلیم کا بڑا مقصد ہے۔ یہ توحید کا مثالی اسلامی نظریہ ہے۔ اسے منزل قرار دینا چاہیے اور اپنی ذات میں الوہی صفات پیدا کرنے، انھیں اپنے اعمال میں عیاں کرنے کے لیے مثالی حیثیت دینا چاہیے تاکہ جب تک وہ اس دنیا میں رہے گمراہ نہ ہو پائے۔"

امام ابوحنیفہؒ نے اسلام میں تعلیم کے مقصد کی تعریف کرتے ہوئے اسے "تقویٰ" یا ایسے "پاکیزہ کردار" کے حصول کا ذریعہ بتایا ہے جو ہر مسلمان شہری کا ضروری وصف ہے۔ ان کے خیال میں ——

"یہ ایسا شعور ہے جو روح کی اصلاح کرتا یا اُسے بگاڑتا ہے، طاقت اسی سے حاصل ہوتی ہے، اس سے دنیا اور آخرت کے لیے غلط اور صحیح نیز نیک و بد میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ پھر صحیح کردار کے انتخاب کا بھی صحیح شعور پیدا ہوتا ہے تاکہ جہالت کے باعث آدمی گمراہ نہ ہو جائے۔"

امام صاحب کی رائے کے بموجب عمل اور استعمال کے بغیر علم بے معنی ہے۔

لفظ "تقویٰ" میں بھی کچھ آ جاتا ہے۔ لغوی اعتبار سے اس کا مطلب چوٹ سے بچنا ہے اور قانونِ شریعت کی رو سے ان تمام باتوں سے گریز کرنا ہے جو آدمی کے جسم اور اس کی روح کے لیے نقصان دہ ہوں۔

تعلیم کے باب میں اقبال علیہ الرحمۃ کی سوچ توحید کے انداز میں ہے۔ ان کے نزدیک اس کا مطلب اسلام کے معاشرتی نظام میں مساوات، استحکام اور آزادی ہے۔ ان کی نظر میں یہ ایسا نورِ بصیرت ہے جو مادی دنیا سے ماوراء ہے لیکن اسے تابناک کرتا ہے۔ یہ ایسا روحانی وصف ہے جو زندگی کا شعور بخشتا ہے —— ایسی زندگی کو جسے فرد مادی اشیاء کے درمیان گزارتا ہے۔ بیک وقت ابھارنے اور ہدایت پانے کے لیے قوتِ متحرکہ ہے۔

اشتمالیت، عیسائیت اور اسلام

اشتراکی کیلئے تعلیم "معاشرے میں کمیونزم کو تحریک دینے کا حربہ ہے۔" اسکے خلاف عیسائیت کا نظریہ ہے جو فرد کی قدر و منزلت پر زور دیتا ہے اور بشرطِ ضرورت انفرادیت کو معاشرے پر بھی فضیلت بخشتا ہے جس سے اظہارِ ذات اور نظم و ضبط کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس سے جمہوریت کے ڈھیلے ڈھالے ڈھانچے میں معاشرتی شعور پیدا کرنا مقصود ہے۔ ان دونوں تعلیمی نظریوں سے دو ایسے مختلف قسم کے افراد جنم لیتے ہیں جن کے مختلف مقاصد و عزائم ہوتے ہیں۔

اسلام بھی ایک امتیازی طرز کا انسان پیدا کرتا ہے لیکن وہ ان دونوں سے زیادہ متوازن ہوتا ہے۔ اسلام روحانی و مادی دنیا، فرد اور معاشرے میں مطابقت اور موافقت پیدا کرتا ہے۔ قرآن مجید میں تعلیم کے جس مقصد کا انکشاف کیا گیا ہے وہ دوسرے انسانوں سے فرد کے کثیر اور مختلف التوع رشتے عیاں کرتا ہے —— گویہ اسلامی تعلیم کا ایک اہم جزو ہے تاہم اسی پر بس نہیں بلکہ نیچر یعنی گرد و پیش کی دنیا اور اللہ سے فرد کے رشتے کا اظہار مقصود ہے —— روزمرہ کی زندگی میں حقیقت کاملہ کا اقدام ہے۔

ہر مسلمان، معلم ہو یا طالب علم ان شرائط پر علم کے ہر معلوم شعبے کو جاننے میں آزاد ہے۔

قرآنِ پاک اور علم علم کی شدید لگن جو اسلام کی خصوصیت ہے بدیں الفاظ قرآنِ پاک میں مذکور ہے ——

"اے میرے اللہ! میرا علم بڑھا!"

"رَبِّ زِدنِی عِلمًا"

قرآنِ پاک میں علم حاصل کرنے کی اس ضرورت کا بار بار ذکر آیا ہے جس کی ابتدا رسولِ اکرم ﷺ پر پہلی وحی کے نزول سے یوں ہوا ——

"اس رب کے نام سے پڑھ جو خالق ہے۔"[1]

پس اس نے علم سے آغاز کیا اور چونکہ اہلِ علم پیغمبر کے جانشین ہیں۔ جنھوں نے علم کا ترکہ چھوڑا، اس لیے جو شخص اس میں سے پورا حصہ لیتا اور علم کے حصول کا راستہ اختیار کرتا ہے اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ ہموار کرتا ہے اور اللہ فرماتا ہے ——

"وہی فرماں بردار لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔"[2]

اور اللہ نے فرمایا ہے ——

"عالم کے سوا انہیں کوئی نہیں سمجھتا۔"[3]

اور یہ بھی فرمایا ہے ——

"کیا جاننے والا اور نہ جاننے والا ایک برابر ہیں؟"[4]

حدیثِ نبوی اور علم حدیثوں میں علم کی روحانی قدر و منزلت اور مسلمانوں کے لیے ہر طرح اشاعتِ علم کی ضرورت پر یکساں زور دیا گیا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے ——

"جو شخص دنیا کی آرزو رکھتا ہے اس پر لازم ہے کہ علم کے ذریعے اسے پائے اور جو آخرت کی آرزو رکھتا ہے اس پر لازم ہے کہ عبادت کے ذریعے اسے پائے۔"

نیز ——

"علم و فضل والے پیغمبر کے جانشین ہیں۔"

"علم حاصل کر کہ علم آدمیوں کو خدا سے ڈرنا سکھاتا ہے۔"

1۔ پارۃ ۳۰،۵ سورہ ۹۶ آیت
2۔ قرآن حکیم ۳۵:۲۸
3۔ قرآن حکیم ۲۹:۴۳
4۔ قرآن حکیم ۳۹:۹

پھر ہم یہ بھی پڑھتے ہیں ـــــــ

''علم آدمی کے لیے اس کی تنہائی کا ساتھی ہے، پردیس میں اس کا دوست ہے، خوشی اور غم میں اس کا رہنما ہے، یہ ایسا ہتھیار ہے جسے وہ دشمن کے خلاف استعمال کر سکتا ہے اور ایسی زینت ہے جس کی دوستوں میں نمائش کر سکتا ہے۔''

''علم کے ذریعے اللہ ایک قوم کو رفعت بخشتا ہے اور انہیں ایسا رہبر بناتا ہے جس کے راستے پر دوسرے چلتے اور جس کی مثالوں پر دوسرے عمل کرتے ہیں۔''

یہ بھی ارشاد نبوی ہے ـــــــ

''اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے اسے شعور دیتا ہے۔ ایمان اور آگاہی علم سے حاصل ہوتی ہے۔''

''جو علم پاتا ہے وہ مرتا نہیں۔''

''عالموں کی باتیں سننا اور دوسروں کو علم سکھانا مذہبی عبادات سے افضل ہے۔''

''جو عالموں کا احترام کرتا ہے وہ میرا احترام کرتا ہے۔''

''عالم کی روشنائی شہید کے لہو سے مقدس تر ہے۔''

''علم حاصل کرو خواہ چین ہی میں کیوں نہ ہو۔''

عورتوں کو علم کے حصول سے الگ تھلگ نہیں رکھا گیا۔ رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں ـــــــ

''علم کی طلب ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔''

دراصل تمام مسلمانوں کے لیے ''علم ذہن کے لیے سرمایۂ زندگی ہے اور ایسا تاباں چراغ ہے جو تاریکی سے دور رکھتا ہے۔''

اس اسپرٹ میں اور ان الفاظ کی حوصلہ افزائی سے عربوں نے یورپ میں از سرِ نو علم کی مشعل روشن کی اور اسے بلند کر کے وہ تمام کچھ روشن کر دیا جس کے بغیر مغرب میں عہد تاریک ہی رہتا۔ اسلام کی تحریک سے تعلیم نے ان مقامات پر روشنی پھیلائی جہاں پہلے اندھیرا تھا۔

اسلامی عہد میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی ترقی

فوجی امور میں مسلمانوں کی کارگزاری

نظم وضبط اور انسان دوستی قرونِ اولیٰ کی اسلامی فتوحات میں جس تیز رفتار، داؤ پیچ اور کامیابی کا پتا ملتا ہے وہ داستان معلوم ہوتی ہے اور یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ لاتھروپ سٹوڈرڈ اپنی معروف کتاب ''اسلام کی نئی دنیا'' میں مسلمانوں کے فوجی کارناموں اور استحکام کی قوتوں کا شاندار انداز سے خلاصہ پیش کرتا ہے۔

> ''دوسرے بڑے بڑے مذاہب کو آہستہ آہستہ اذیت بخش جدوجہد سے کامیابی کے لیے راستہ ملا اور جب طاقتور فرماں رواؤں نے نیا مذہب قبول کیا تو ان کی مدد سے انجام کار کامیابی نصیب ہوئی۔ عیسائیت کو شاہ قسطنطین، بدھ مت کو راجہ اشوک اور زرتشتی مذہب کو سیروس مل گیا۔ ان سب نے اپنے منتخب مذہب کی اشاعت پر وہ زبردست قوت صرف کی جو انہیں اپنی غیر مذہبی حیثیت سے حاصل تھی۔ اسلام کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ اسلام ایک ریگستانی علاقے میں ابھرا جو بہت کم آباد تھا اور انسان کی تاریخ میں جس نے پہلے کوئی نمایاں کام نہیں کیا تھا۔ پھر یہ اس حالت میں زقند پر زقند لگاتا عظیم مہمات کے لیے میدان میں نکلا کہ انسانوں کی خفیف ترین حمایت اسے حاصل نہ تھی

اور ہر قسم کی دشواریاں موجود تھیں۔ اس پر بھی معجزانہ سہل طریقے سے کامیاب ہوا۔ دو ہی نسلیں گزریں کہ اسلام کا ہلالی پرچم جبل الابواب (فرانس اور ہسپانیہ کے درمیان کوہستانی علاقے) ہمالیہ تک اور وسطی ایشیا سے افریقہ کے صحراؤں تک لہرانے لگا۔"

یہی مصنف اپنی کتاب میں دوسری جگہ یہ لکھتا ہے ـــــ

"عربوں کی باری آئی تو وہ اپنی فتوحات کو مستحکم کرنے کا گر جانتے تھے۔ وہ کوئی خونخوار وحشی نہ تھے کہ لوٹ مار اور تباہی پر تلے ہوتے بلکہ وہ تو بڑے اوصاف کے مالک تھے اور پرانی تہذیبوں سے علم حاصل کرنے کے دلدادہ اور ان کی خوبیوں کے قدردان تھے۔ آپس میں آزادی سے شادی بیاہ کرنے اور مشترکہ زاویہ نظر رکھنے کے باعث فاتح اور مفتوح دونوں جھٹ گھل مل گئے اور اس باہمی اختلاط سے ایک نئی تہذیب اُبھری ـــــ ساراسینی تہذیب، عربوں کی ذہانت اور اسلام کی روح نے یونان، روما اور ایران کی پرانی تہذیبوں کو نئے انداز سے زندگی بخشی۔"

جنھیں قرونِ اولیٰ کے مسلمان سپاہیوں کو جنونیوں کا غول سمجھنے کی تربیت ملی ہے ان کے لیے یہ بات بلاشبہ حیران کن ثابت ہوگی کہ اسلام کے عہد آغاز تک میں جنگ میں مسلمان بڑے نظم وضبط سے کام لیتے تھے اور ان کا رجحان انسانیت دوستی کا تھا۔[1] عین نظم وضبط کے معاملے میں اسلام نے فوجی امور میں سب سے گراں قدر کام سرانجام دیے۔ جنگ کے دوران میں اور جنگ جیت لینے کے بعد سخت ڈسپلن کا مظاہرہ کیا جاتا۔ مفتوح سے جو سلوک کیا جاتا اس میں بھی، نیز مالِ غنیمت کی تقسیم اور معاہدوں کی پابندی میں بھی بڑی احتیاط برتی جاتی۔ سب سے پہلی فوجی عدالت حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں قائم ہوئی۔ آپ ہی نے فوجی جج مقرر کیا۔ یہ عدالت ایک طرف تو زمین اور سمندر سے حاصل کیے ہوئے مالِ غنیمت کے باب میں قومی اور بین الاقوامی امور کا تصفیہ کرتی اور دوسری طرف موجودہ "کورٹ مارشل" کا کام کرتی۔

---

1. اس کی مثالیں حصہ دوم کے باب "مذہبی رواداری" میں ملیں گی۔

سپاہیوں اور منصب داروں کے نظم و نسق کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں۔ جب زید نامی غلام کے پسر اُسامہ کو شام میں رؤساء کے فرزندوں اور جہاندیدہ سپاہیوں پر عرب فوج کا سالار مقرر کیا گیا تو اس کے خلاف کسی کے لب نہ ہلے۔ جب عظیم ترین سپہ سالار خالدؓ بن ولید کو حضرت عمرؓ نے عہدے سے معزول کیا تو انھوں نے اپنے سے افضل کا حکم تسلیم کیا۔ جب گورنر موسیٰ نے اندلس میں طارق کی فتوحات سے جل کر عظیم سپہ سالار کو کوڑے مارے اور پابہ زنجیر کیا تو اس نے یہ کہہ کر اپنے شاندار لشکر کو موسیٰ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی اجازت نہ دی ——

''میں علمِ بغاوت بلند کرنے اور اسلام میں بدنظمی اور اطاعت شکنی کی مثال قائم کرنے میں آخری آدمی ہوں گا۔''

تعلیماتِ قرآنی کی رو سے ادنیٰ سے اعلیٰ ہر مسلمان سپاہی میں نظم و نسق کی یہ روح پیدا کی جاتی تھی۔ مورخ ڈیوش کی رائے کے بموجب اسلام کی تمام حیرت خیز فتوحات کا سبب قرآن تھا۔

ڈیوش کہتا ہے ——

''قرآن ایسی کتاب ہے جس کی مدد سے عربوں نے چند سالوں میں سکندرِ اعظم اور روما سے بھی بڑی دنیا فتح کر لی جبکہ انہیں اسے فتح کرنے میں کئی سو سال لگ جاتے —— اسی کی مدد سے یہ فرماں روا بن کر یورپ میں آئے جہاں چاروں طرف اندھیرا تھا اور انہوں نے بنی نوع انسان کے لیے مشعل ہاتھ میں رکھی تھی۔''

قرآن میں ہمیں مسلمانوں کے اعلیٰ فوجی مقصد کی کئی مثالیں ملیں گی۔ مثلاً یہی ایک آیت کریمہ ہے ——

''بے شک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ ایسی صفیں بناتے ہیں جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

یہ امرِ واقع ہے کہ مسلمان ذلت سے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اپنے دین کی خاطر مرنا قبول کرتے۔ انھوں نے ''سیسے کی دیواریں'' تعمیر کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ غرناطہ کے محاصرے میں موسیٰ کے یہ الفاظ اس روح کی ترجمانی کرتے ہیں ——

"میں لوگوں کا جذبہ اس قدر شکستہ دیکھتا ہوں کہ اب سلطنت کو بچانا ممکن نہیں تاہم ارفع انسانوں کے لیے اب بھی متبادل راستہ موجود ہے ـــــــــ عظیم الشان موت کا راستہ۔ آؤ اپنی آزادی کی حفاظت کرتے ہوئے اور غرناطہ کے الم کا بدلہ لیتے ہوئے ہم جان دے دیں۔ مادرِ ارض اپنے بچوں کو آغوش میں لے لے گی۔ اگر کسی کی لاش چھپانے کو قبر نہ ملے تو پھر آسمان کی بھی ضرورت نہ پڑے گی کہ اسے چھپائے۔ خدا نہ کرے، یہ کہا جائے کہ غرناطہ کے عالی مرتبہ لوگ اس کے وفاع کی خاطر مرنے سے ڈرتے رہے۔"

اپنا ملک بچانے کے لیے بخوشی جان دینا اس تقدیر پرستی سے بہت مختلف ہے جو قرآن سے بے خبر لوگ بالعموم مسلمان غازیوں کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے رضائے الٰہی کے سامنے جو سرِ تسلیم خم کیا اس کے لیے تقدیر پرستی کی بجائے نظم وضبط کا لفظ بہتر ہے۔

غازیانِ اسلام کے لیے جو رویہ فرض کیا گیا ہے اس کے لیے اتنے پروقار کلمات پاک سیرت خلیفہ اول، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تقریر کے سوا کہیں نہیں ملتے ـــــــــ

"یاد رکھو! تم ہمیشہ خدا کے حضور میں ہو ـــــــــ بوقتِ مرگ بھی، یومِ حشر پر یقین اور جنت کی امید رکھتے ہوئے بھی۔ ناانصافی اور ظلم سے بچو! اپنے بھائیوں سے مشورہ کرلو اور اپنے لشکر سے محبت کرنے اور ان پر اعتماد رکھنے کی سعی کرو! جب تم کوئی معاہدہ یا سمجھوتہ کرو تو اس پر عمل کرو اور جتنے بھلے اس کے لفظ ہوں اتنے ہی بھلے تم بھی نکلو!"

معاہدوں اور عہد و پیمان کے باب میں قرآن میں بہت کچھ مرقوم ہے۔ ایک خاص حکم یہ ہے ـــــــــ

"جب تم خدا کے نام پر معاہدہ کرو تو اس پر عمل کرو اور جب تم کسی حلف کی توثیق کر چکو تو اُسے توڑو نہیں اور اس کے لیے اللہ کو ضامن بناؤ!"

اس حوالے سے اس جذبے کا پتا چلتا ہے جس کی فریقین کے درمیان مسلمانوں سے

توقع کی گئی۔ غالب اور مغلوب کے مابین ہونے والے معاہدوں کی نوعیت سے متعلق اور بھی کئی احکام ہیں۔ ان سب کی غایت ممکن حد تک جنگ وجدل کو (وحشت اور بربریت کی بجائے) انسان دوستی کے قریب لانا تھا۔

جنگ میں انسان دوستی کا رویہ کم لوگ یہ بات سمجھتے ہیں کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان فاتحین کے لیے جنگ ہمیشہ آخری حُجت رہی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے ——

"اگر وہ امن پر مائل ہوں تو تم بھی امن پر مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو!"

پھر یہ بھی کہا ہے ——

"پس تذبذب میں نہ پڑو اور جب کامل طور پر حاوی ہو جاؤ تو صلح کی دعوت دو!"

اگر جنگ ناگزیر ہوئی تو سپاہیوں اور سالاروں کے لیے یہ ضابطۂ اخلاق مقرر کیا گیا۔

(۱) غیر ضروری طور پر ظالمانہ طریقوں سے قتل کرنے اور دشمن کو اذیت دینے سے منع کیا گیا۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا: "اللہ نے ہر معاملے میں عدل کی ہدایت کی ہے۔ پس اگر تم قتل کرو تو انصاف سے کام لو!"

(۲) ان عام لوگوں، عورتوں، بچوں، خادموں اور غلاموں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے جو شریکِ جنگ نہیں۔ اندھوں، راہبوں، گوشہ نشین فقیروں، ضعیفوں اور ان لوگوں کے قتل کی اجازت بھی نہیں دی جو جسمانی لحاظ سے معذور ہوں اور لڑنے کے ناقابل۔

(۳) جنگی قیدیوں کو ناکارہ کرنے سے باز رکھا گیا۔

(۴) آدمیوں اور حیوانوں کے اعضا کاٹنے سے منع کیا گیا۔

(۵) ظلم و تشدد اور خلافِ دین اقدامات ممنوع قرار دیے گیے۔

(۶) زمین پامال کرنے، فصلیں اُجاڑنے اور بلاوجہ درخت کاٹنے سے منع کیا گیا۔

(۷) غذائی ضرورت کے علاوہ جانور ذبح کرنا ممنوع قرار پایا۔

(۸) ہر قسم کی زیادتی سے منع کیا گیا۔

(۹) عورتوں یہاں تک کہ قیدی عورتوں سے زنا منع کیا گیا۔ حکم عدولی کرنے والوں کو سنگسار کیا جاتا یا انھیں دُرّے لگائے جاتے۔

(۱۰) جو لوگ یرغمال کے طور پر دشمن کی تحویل میں ہوں انھیں ہلاک کرنے سے روکا گیا۔ ان میں حکومت کے ایسے لوگ شامل ہیں جنھوں نے معاہدہ شکنی کی اور ان مسلمانوں کو ہلاک کیا جو یرغمال کے طور پر دیے گئے تھے۔

(۱۱) خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم پر مقتول دشمن کا سر کاٹنے اور مسلمان حاکمِ اعلیٰ کے پاس بھیجنے سے منع کیا گیا۔

(۱۲) فتح پانے کے بعد قتل و غارت کرنے والے کے لیے معافی نہ تھی۔ اس سلسلے میں نبی اکرم صلعم نے تابناک مثال قائم کی۔ آپ نے فتحِ مکہ کے بعد سب کو معاف فرمایا۔

(۱۳) نہ لڑنے والے کسانوں، تاجروں، کاروباری لوگوں اور ٹھیکیداروں کے قتل سے منع کیا گیا۔

(۱۴) قیدی آدمی یا جانور کو جلانا منع تھا۔

(۱۵) دشمن کے قیدیوں کی آڑ لینے اور انھیں انھی کی فوج سے لڑنے پر مجبور کرنے سے روکا گیا۔

(۱۶) معاہدوں کی رو سے جو کام ممنوع قرار دیے گئے انہیں کرنے سے روکا گیا اور اس وقت تک روکا گیا جب تک معاہدے قائم رہیں۔ [1]

سائنسی طرز کی جنگ بعد کی مہمات میں مسلمانوں نے سائنسی ایجادات کو جنگ میں شریک کرلیا کیونکہ ان میں متعدد ممتاز سائنسدان پیدا ہوئے۔ پروفیسر ہیل نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے ——

> ''عین اسی طرح جس طرح ہمارے زمانے میں ہے، سائنس کو جنگ وجدل میں داخل کیا گیا۔ تیراندازوں کی ہر جمعیت کے ہمراہ آگ لگانے

---

[1] جنگ کے ضابطۂ اخلاق کی یہ سولہ شقیں ترمذی، بخاری، موردی اور سرخسی میں ملتی ہیں۔

والوں کی ایک ٹولی ہوتی جن کے پاس تیل ہوتا۔ یہ روغن بردار آتش باز ایسے
کپڑے پہنے رہتے جو آگ نہ پکڑتے اور دشمن کے قلعوں کے جلتے ہوئے
کھنڈروں میں چلے جاتے۔ جدھر دیکھیں ہمیں ایسی سرگرمیاں ملتی ہیں جنھیں
ہم بڑے مزے سے اپنے جدید عہد کی ایجادات اور فتوحات سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں نے مُہلک گیسیں اور بدبودار سیال کیمیائی مرکبات بھی
معلوم کر لیے تھے۔ مہلک گیس "دشمن کو خوفزدہ کرنے" اور "قلعے فتح
کرنے" کے لیے استعمال کی جا سکتی تھی۔[1]

برہان الدین مرغنانی نے کیمیائی دھوئیں سے حملے کرنے کا ذکر کیا ہے۔ زہریلی گیسیں تیار کرنے کے کتنے ہی طریقے عربی کے قدیم نسخوں میں پائے جاتے ہیں تاہم انہیں اندھا دھند استعمال کرنے کی سفارش کی گئی نہ اجازت دی گئی۔

توپ اور بحری سرنگ کی ایجاد ایس۔ پی۔ اسکاٹ اپنی تاریخ[2] کی تیسری جلد میں رقمطراز ہے کہ اندلس میں مسلمان ایک معمولی قسم کی توپ کام لاتے تھے۔ لارنس اپنی تالیف "بین الاقوامی قانون کے اصول" میں بتاتا ہے کہ انہوں نے معمولی قسم کی بحری سرنگ بھی ایجاد کر لی تھی۔

ایمبولنس اور جنگی شفاخانے مسلمان سپہ سالار میدانِ جنگ میں جھٹ پٹ طبی سروس اور بنیادی شفاخانے قائم اور زنانہ نرسنگ سروس کا انتظام کر لیتے۔ (دیکھو باب الطب)

مسلمانوں کے لشکر میں بیماری کا فقدان وبا یا بیماری کبھی مسلمانوں کے لشکر میں بہ شدت نہ پھیلتی۔ حالانکہ ابتدائی ایام میں اس کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ اس کا سبب وہ انفرادی صفائی اور ذاتی طور پر حفظانِ صحت کا عمل تھا جس کے لیے قرآن نے ہر مسلمان کو تاکید کی ہے۔ اس معاملے میں اسلامی لشکر کو بعد کے زمانے میں بھی مغربی فوجوں پر فوقیت حاصل رہی۔ لارڈ ایور سلے اناطولیہ کے ترکوں کی نسبت کہتا ہے ـــــ

---

[1] ارزوئے "رسالۃ فی الحرب" اور "والمرتدین"۔ مسودات، قاہرہ۔ فقہ حنفی نمبر ۱۰۸۰، باب ۲۷۔

[2] HSITROY OF THE MOORISH EMPIRE ص ۱۲۳

"سپاہی کی حیثیت سے ترک بڑی نادر خوبیوں کے مالک تھے۔
ماضی کی طرح آج بھی وہ جری، سخت جان، سنجیدہ، کفایت شعار اور صفائی
ستھرائی کی عادتیں رکھنے والے ہیں جیسا کہ ان کے مذہب نے انہیں سکھایا
ہے۔ یہ زبردست بات اس لیے بھی ان کے حق میں جاتی ہے کہ دوسری
افواج میں صفائی ستھرائی کے انتظامات نظر انداز کیے جاتے رہے۔"

اسلامی لشکر کے بارے میں ہمعصروں کی دورائیں اپنے ہمعصروں کے نزدیک اسلامی لشکر نہ صرف تعداد کے لحاظ سے بلکہ معین مقصد کے شعور اور انتظامی امور میں نظم وضبط برقرار رکھنے کے معاملے میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ رسد کے معاملے میں جو مستعدی پائی اور مواصلات میں جو رفتار برقرار رکھی جاتی اس پر بڑی اچھی طرح پورا باب قلمبند کیا جاسکتا ہے۔ دانشمند شاہ لیو ہشتم (۸۸۶تا۹۱۲ش) کی جنگی چالوں کے بارے میں جو رسالہ لکھا گیا ہے اس میں رسد اور مواصلات کی نسبت مسلمانوں کی فوجی قوت کا ذکر بھی مختصراً کیا گیا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے ــــــ

"تمام قوموں میں سے وہ (یعنی عرب مسلمان) فوجی کاروائیوں
میں سب سے بڑھ کر تربیت یافتہ اور محتاط ہوتے ہیں۔"

شہنشاہ کونسٹنٹائن پورفیرو جینیٹس (۹۱۳ تا ۹۵۹ش) کے یہ الفاظ اس یقین محکم کا پتا دیتے ہیں جس کا تاثر عربوں نے اپنے بازنطینی دشمنوں کو دیا ــــــ

"وہ قوی اور جنگجو ہیں ان میں سے اگر صرف ایک ہزار کسی کیمپ پر
قابض ہوجائیں تو ان سے قبضہ لینا ناممکن ہوتا ہے۔"

اسلامی بحریے کی فوقیت مسلمانوں کی فوجی فتوحات جس سرعت سے وسیع علاقوں پر ہورہی تھیں اور ان کے نتیجے میں کاروبار اور تجارت کا دھندا بڑھتا پھیلتا ہی چلا جارہا تھا اس کا یہ تقاضا تھا کہ اسلامی بحری قوت اس سے ہم آہنگ اور ہم قدم رہے۔ شروع ہی میں حضرت عمرؓ کے زمانے سے مسلمان بحری قوت بڑھانے لگے تھے اور تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کو تو مسلمانوں کے پہلے بحری بیڑے کا ناظم قرار دے سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ کے حکم سے جنگی جہاز اسکندریہ کی بندرگاہ سے نکل کر بازنطینیوں کے خلاف حضرت معاویہؓ کے لشکر سے آملے جو شام میں مقیم تھا۔ ۶۴۹ ش

میں حضرت معاویہؓ نے قبرص (سائپرس) چھین لیا جو بازنطینیوں کا بحری مرکز تھا۔ اسلام کی یہ پہلی بحری فتح تھی اور پہلی بار ایک جزیرہ مسلمانوں کی مملکت میں شامل کیا گیا۔

۶۵۵ ش میں حضرت معاویہؓ اور حضرت عبداللہ کے تحت شام اور مصر کے مشترکہ بحری بیڑے نے فینکس کے قریب ساحل الائیسیا سے دور بازنطینی بحریہ کے کوئی پانسو جہاز تباہ کر دیے۔ شہنشاہ کونستاس دوم جو جنگ میں قیادت کر رہا تھا بہ مشکل جان بچا کر بھاگا۔[1] اس جنگ کو "مستولوں کی جنگ" کہتے ہیں۔ اس نے بازنطینیوں کی بحری قوت ختم کر کے ان کی قسمت پر مہر لگادی۔ اس موقع پر مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ اپنے فتح و نصرت کے پرچم قسطنطنیہ تک نہ لے جا سکے۔

۶۶۸ ش یا ۶۶۹ ش میں اسکندریہ سے دو سو جہازوں کا بیڑہ چلا اور صقلیہ (سسلی) تک جا پہنچا۔

حضرت عمرؓ اور اموی خلفاء کے زمانے تک مسلمانوں کا بحری بیڑہ بہت بڑا ہو چکا تھا۔ شام اور مصر کی بندرگاہیں خوب کام دیتی تھیں۔ پھر جب جنوبی اطالیہ (اٹلی) سے ادھر کے جزیرے مسلمانوں کے زیرِ اقتدار آئے تو بندرگاہ پر بندرگاہ ملتی گئی۔ کریت، ساردینیہ اور کورسیکا فتح کر لیے گئے۔ صقلیہ میں اسلامی ریاست قائم ہوگئی جو دو سو سال تک زرعی اور صنعتی مرکز کے طور پر پھیلی پھولی۔

نویں صدی میں بحریے کے کتنے ہی مسلمان سپاہیوں اور افسروں نے امتیازی حیثیت پائی۔ انھی میں ابوحفیہ عمر بلوطی کا نام آتا ہے۔ عرب مؤرخ ابنِ خلدون اس عہد کے بارے میں رقمطراز ہے ——

> "اپنے عہدِ اقتدار میں مسلمان سمندر کے آقا تھے۔ دریا، سمندر، خلیج کہیں بھی عیسائی قومیں مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکتیں۔ اپنے تسلط کے زمانے میں مدتوں مسلمان فتح و نصرت کے پرچم لہراتے، سمندروں کی منہ زور لہروں کو روندتے رہے۔"

---

[1] خلاف ازیں مسلمان سپہ سالار اپنے سپاہیوں کے دوش بدوش محاذِ جنگ پر آخری دم تک لڑتے۔ ان کے بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ وہ تو اپنی فوج کے ہمراہ کٹ مرتے۔ ستمبر ۶۵ء میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو ہمارے افسر اسی بے جگری سے لڑے جس بے جگری سے سپاہی لڑے۔ ایک موقعے پر بھی ہمارے کمانڈروں (اور سپاہیوں) نے بھاگنے کی روایت قائم نہیں کی۔ خلاف ازیں بھارتی کمانڈر نہایت آسانی سے سپاہیوں کو تنہا چھوڑ کر میدان سے بھاگ جاتے یا پھر ہتھیار ڈال کر قید ہو جاتے۔ میجر جنرل نرنجن پرشاد اپنی جیپ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ (مترجم)

پوری دسویں صدی میں بحیرۂ روم مسلمانوں کے بحریے کا مرکزِ سیر و سیاحت تھا۔ شمالی افریقہ کی سب سے بڑی بندرگاہ "مہدیہ" ۹۱۶ش (یعنی دسویں صدی) میں بنائی گئی تھی۔ یہاں بڑی مضبوط ساحلی دیوار تھی اور گودی کی حد بندی کے لیے آہنی پھاٹک نصب کیے گئے۔ بندرگاہ کے احاطے میں بڑے بڑے حوض تھے اور زمین تلے مال گودام تھے اس کی گودی سخت چٹان تراش کر بنائی گئی تھی اور اتنی بڑی تھی کہ اس میں بیک وقت تیس جہاز سما سکتے تھے۔ بندرگاہ کے دونوں جانب لمبی لمبی زنجیریں بندھی ہوتیں۔ انہیں کھول دیا جاتا اور جہاز اندر بڑھ آتے۔ یہیں مہدیہ سے امیر البحر[1] حسن خلیلی اور امیر البحر یعقوب بن اسحاق ——— بحریہ کے ایسے نامور قائدین جنگی مہموں پر روانہ ہوئے۔ یہیں سے قسطنطنیہ اور فرینکس کے ساحلوں پر روما کے بحریہ کو نیست و نابود کرنے کی غرض سے جہاز بھیجے گئے۔

فرینکس فتح کر لینے کے بعد مسلمانوں کے بحری جہاز بحیرۂ روم کی دوسری جانب مرسائی علی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے لگے جسے اب مارسیلز کہتے ہیں۔

تیونس اور صقلیہ (سسلی) میں اسلامی بحریہ کے لیے جہاز سازی کے کارخانے کھولے گئے جہاں اس زمانے کے اعتبار سے بڑے بڑے جہاز بنائے جاتے۔ ناصر خسرو نے ۱۰۴۷ش میں چند جہاز دیکھے جن میں ہر جہاز ۲۷۵ فٹ لمبا اور ۱۱۰ فٹ چوڑا تھا۔

فاطمی خلفاء نے تجارتی بحری سروس کی ترقی کے لیے بہت کچھ کیا۔ لین پول اپنی "تاریخِ مصر" میں ان کے بارے میں رقمطراز ہے ———

"ان کے جہاز بحیرۂ احمر اور بحرِ ہند بلکہ غربی افریقہ کے ساحل اور آبنائے جبل الطارق[2] تک پہنچتے۔"

مملوکوں[3] کے لیے بحیرۂ احمر درحقیقت ان کا اپنا ہی سمندر تھا۔ امیر البحر رئیس سلیمان وہی مملوک ہے جس نے پچہتر جہازوں والے اس شاندار ترکی بحری بیڑے کی کمان سنبھالی

۱۔ انگریزی زبان کا لفظ ایڈمرل اسی امیر البحر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس سے مسلمانوں کے بحریہ کی عظمت اور قوت واضح ہے۔ (مترجم)

۲۔ جبرالٹر اسی جبل الطارق کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ (مترجم)

۳۔ اسلامی مساوات کا جادو دیکھیے کہ مملوک جو غلام کے طور پر خریدے گئے، حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تو ان پر اسی آن غلامی حرام ہوئی اور زندگی کی تمام راہیں کھل گئیں۔ پھر انھوں نے مصر میں سیاسی اقتدار سے بڑا اقتدار پایا (مترجم) جب ہلاکو نے خلیفہ معتصم باللہ کو ۱۲۵۸ء میں قتل کر کے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا، بغداد میں ساٹھ ہزار انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو اس مصر کے مملوک حکمران ہی نے اسکے ناقابلِ تسخیر لشکر کو تباہ و برباد کیا اور از سرِ نو اسلامی سلطنت بحال کی۔ (مترجم)

جونز کی سلطان سلیمان کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

۸۳۹ء ش میں سلیمان نے بحیرۂ عرب سے بحیرۂ روم کے دو مختلف بحری راستوں کا ذکر کیا۔ اس کے بیان کی رو سے پہلا راستہ یہ ہے ——— بحیرۂ عرب سے بحیرۂ چین اور شمال میں بحرالکاہل میں آتے ہیں۔ پھر لوٹ کر آبنائے بیرنگ کو قطع کر کے بحرِ شمالی میں سے گزرتے ہیں اور بحرِ اوقیانوس میں داخل ہوتے ہیں اور آبنائے جبل الطارق میں سے ہو کر بحیرۂ روم میں آ جاتے ہیں۔ دوسرا راستہ جس کا حال اس نے سفرنامے میں لکھا ہے جنوب کا ہے۔ بحیرۂ عرب سے نکلتے ہیں تو سیدھے آبنائے موزنبیق میں پہنچتے ہیں، پھر راس امید کا چکر کاٹ کر افریقی ساحل پر سے گزرتے ہیں اور آخر کار اسی طرح جبل الطارق میں سے ہو کر بحیرۂ روم میں پہنچ جاتے ہیں۔

اس زمانے میں مسلمانوں کی بحری سرگرمیاں پورے بحرِ اوقیانوس میں ——— شمالی امریکہ کے ساحل تک جاری تھیں۔ نامور سیاح البیرونی اور نصیر الدین طوسی اپنی تالیفات میں خصوصیت سے قطب شمالی اور الاسکا کا ذکر کرتے ہیں۔ پروفیسر شمستری نے مسلمانوں کی بحری مہمات کے باب میں لکھا ہے ———

"بعض بحری مہم جو جہاز ران کولمبس سے چھ سو سال قبل امریکی ساحل تک پہنچ گئے تھے۔"

حصہ اول میں پہلے ہی مسلمان کی دریافتیں بیان کی جا چکی ہیں۔ یہ بیان ان صفحوں میں ملے گا جو جغرافیے، نقشہ کشی اور جہاز رانی کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ مسلمان جہاز راں قطب نما کی ایجاد کے لیے عربوں اور مسلمان ہیئت دانوں کے بڑے ممنون ہیں۔ چلتے چلتے ہم یہ بھی بتا دیں کہ سمندروں میں روشنی کے میناروں کا سلسلہ سب سے پہلے مسلمانوں نے قائم کیا۔

جب شاہ فلپ سوم نے ہسپانیہ میں سے مسلمانوں کو نکال دیا تو انھوں نے ۱۶۶۱ ش میں مراکش میں "مسلم بحری تربیت گاہ" قائم کی۔ رباط [1] میں اسلامی وفاق کو قیام بخشا گیا اور یہیں مہاجروں نے تربیت گاہ قائم کی جہاں رہبر ملاحوں کو جدید خطوط پر تربیت دی جاتی اور انہیں چھوٹی چھوٹی کشتیوں کا بیڑہ مرتب و منظم کرنے کا کام سکھایا جاتا۔

---

[1] ۱۹۶۹ء کے نصف آخر میں رباط ہی کے مقام پر اسلامی ملکوں کے مندوبین کی تاریخی کانفرنس ہوئی جس میں پاکستان نے بھی شرکت کی اور اسرائیل سے عربوں کے علاقے واپس لینے کے بارے میں فیصلے کیے گئے۔ اسی کانفرنس سے بھارت کے سکھ نمائندے کو پاکستان کے صدر آغا محمد یحییٰ کے احتجاج پر باہر نکالا گیا۔ (مترجم)

مسلمانوں کی بحری قوت اور یورپ پر اسلام کے احسان کی نسبت پروفیسر ہیل لکھتا ہے ——

"بحریہ مسلمانوں کی سرگرمیوں کی ایک اور نمایاں شق ہے۔ ابتدا ہی کی بات ہے کہ ۴۹ ہجری میں ہم قبرص (سائپرس) کی فتح اور بازنطینی مہم کا حال سنتے ہیں۔ تب سے بار بار ایسی مہموں کا ذکر ملتا ہے جو بحریے کی سمت اشارہ کرتی ہیں۔ بلاشبہ اس شعبے میں یورپ عربوں کا مرہونِ منت ہے۔ ان متعدد بحریاتی اصطلاحات اور الفاظ کو دیکھیے جو مغرب نے عربوں سے لیے اور آج تک محفوظ رکھے۔ بحیرۂ روم کے ساحل پر رہنے والوں پر عربوں کا اثر بہت زیادہ تھا۔ وان کریمر کہتا ہے کہ عیسائی ملکوں کے لیے کئی لحاظ سے عربوں کا بحری بیڑہ ایک نمونہ تھا۔ اس کا ثبوت عربوں کی ان متعدد بحریاتی اصطلاحات سے ملتا ہے جو جنوبی یورپ کی زبانوں میں موجود ہیں چنانچہ کیبل عربی کے حَبل [1] آرسنل اطالوی دارسوٹل) عربی کے دارالسلاح [2] اور کورویٹ (CORVETTE) عربی کے غراب (کوّے) سے بنا ہے۔

<u>ڈاک خانے کا نظام</u> جب اسلام کی فوجی اور بحری قوت بڑھنے سے تمام معلوم دنیا تک سلطنت پھیل گئی تو مواصلات کی مشکل میں بھی اضافہ ہوا۔ نئے تقاضوں ہی نے ڈاک کے نظام کو جنم دیا جو اپنی بہترین عملی شکل میں اسلامی ذہانت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ پہلے خلیفہ تھے جنھوں نے دارالخلافہ میں خبریں اور مالِ غنیمت لانے کے مسئلے پر خاص طور پر توجہ دی۔ خلفائے بنوامیہ میں امیر معاویہ نے سب سے پہلے ڈاک کے نظام میں دلچسپی لی اور الولید نے اپنے تعمیراتی پروگرام سے باخبر رہنے کے لیے اسے وسعت دی۔ مورخین خلیفہ ہارون الرشید کو اس امر پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ اس نے اپنے وزیر یحییٰ برمکی کے ذریعے ڈاک کے پورے نظام کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ عباسیوں کے عہد میں پوسٹ ماسٹر جنرل مقرر کیا گیا۔ یہ عہدہ ہمیشہ نہایت ممتاز اور عالم شخص کو دیا جاتا اور اسے "صاحب البرید" کہا جاتا۔

---

[1] حبل بمعنی رسی

[2] سلاح۔ ہتھیار

ابتدائی طور پر ڈاک کا محکمہ مملکت کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بنایا گیا۔اس مقصد کے لیے ہر صوبائی صدر مقام میں ڈاک خانے قائم کیے گئے اور تمام بڑے بڑے تجارتی راستے ان سے پاٹ دیے گئے تھے۔ ایران میں گھوڑوں اور خچروں کے قافلے مراسلات لے جاتے اور شام میں اونٹ۔ فلپ حتی بتاتا ہے ـــــــ

"بغداد کے ڈاک خانے میں پوری سلطنت کی شاہراہوں کی تفصیلات موجود تھیں جن سے مختلف مرکزوں اور ان کے درمیانی فاصلوں کا پتا چلتا۔ ان سے سیاحوں سوداگروں اور حاجیوں کو مدد ملتی۔ انھی نے بعد کے زمانے میں جغرافیائی تحقیقات کے لیے بنیاد کا کام دیا۔"

حتی یہ بھی بتاتا ہے کہ عراق میں ڈاک کے موجودہ راستے وہی پرانے زمانے کے راستے ہیں۔

ڈاک اور پیغامات لے جانے کے لیے صوبائی ڈاک افسر سدھائے ہوئے قاصد کبوتر بھی استعمال کرتے۔ اہلِ شہر معقول معاوضہ ادا کر کے برید (ڈاک) کی مختلف خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

پوسٹ ماسٹر جنرل فوج کے محکمہ جاسوسی کا سربراہ بھی ہوتا۔ صوبائی پوسٹ ماسٹر اپنے اپنے صوبوں کے نظم و نسق سے تعلق رکھنے والے معاملات کی نسبت اسے براہ راست رپورٹ بھیجتے۔

سول سروس کا قیام عباسیوں کے دورِ حکومت میں کتنے ہی محکمے قائم ہوئے۔ المہدی نے دفترِ حسابات کی بنیاد رکھی۔ محافظ خانہ بنایا۔ شکایت کے معائینے کے لیے بورڈ قائم کیا تاکہ عدل و انصاف میں خرابی ہو تو اسے رفع کیا جائے۔ اس کا نام "دِیوَانُ النَّاظِرِ فِي الْمَنَاظِر" تھا۔ اس کی ابتداء صقلیہ (سسلی) "دیوان الخراج" میں ہوئی اور پھر یورپ کی سرزمین میں اسے نے جڑ پکڑلی۔

ان سرکاری محکموں میں دیوان الخراج کا محصولات کا بیورو سب سے بڑا تھا جو زکوٰۃ، غیر مسلموں کا ٹیکس (جزیہ) اور مالیہ (خراج ـــــــ زمینی ٹیکس) وصول کرتا[1]۔

---

[1] فلپ حتی کی HISTORY OF THE ARABS ص ۳۱۹

پولیس کے محکمے کا قیام عباسیوں نے پولیس کا نظام بھی قائم کیا جس کا سربراہ اعلیٰ عہدیدار ہوتا۔ اسی کے تحت شاہی باڈی گارڈ بھی ہوتا۔ ہر بڑے شہر میں پولیس ہوتی اور عام طور پر اس کا مشاہرہ بڑا اچھا ہوتا۔ اس بلدیاتی جمعیت کے حاکم کو محتسب کہتے۔ یہ منڈیوں اور لوگوں کے اخلاق کا نگہبان ہوتا۔ وہ دیکھتا کہ کاروبار میں صحیح باٹ اور پیمانے برتے جاتے ہیں اور خوراک میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں کی جاتی۔ وہ اس امر پر بھی مامور تھا کہ جوابازی، شراب خوری اور مرد و زن میں حرام کاری کا انسداد کرے۔ اسے ان عمر رسیدہ لوگوں کو کوڑے مارنے کا اختیار تھا جو عورتوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور انھیں بہکانے کی نیت سے داڑھیاں سیاہ کر لیتے در حقیقت اس کے فرائض کا دائرہ بڑا وسیع تھا اور وہ متنوع بھی تھے۔ اس کے تقرر کی وجہ یہ خواہش تھی کہ فوری اور بے نظیر خوشحالی کے دور میں زندگی کے ہر شعبے میں قانون اور نظم و ضبط کی پابندی کی جائے۔

بغداد ــــ دور عباسیہ میں یہ جاننے کے لیے کہ ان ایجادات و اختراعات کے تحت عباسیوں کے شہر بغداد نے کس طور ترقی کی آیئے! اس کی شکل کھینچیں اور دیکھیں کہ عظیم ہارون الرشید کے عہد میں یہ کیسا تھا۔ الف لیلےٰ کا یہ ہیرو ایک وسیع المشرب شہزادہ، قابل سپاہی اور علوم و فن کا قدردان تھا ــــ اور عقلمند منتظم تھا۔

اس کے زمانے میں بغداد عظیم الشان تجارتی شہر تھا جو بہت بڑے انتظامی قلعے کے اردگرد تعمیر کیا گیا تھا جہاں مملکت کے ہر محکمے کا سرکاری دفتر تھا جس کا نظم و نسق نہایت عمدہ تھا۔ اس شہر میں مدرسوں اور کالجوں کی بھرمار تھی۔ دنیا کے تمام حصوں سے فلسفی، طالب علم، طبیب، شاعر اور علمائے دین ہجوم کر آئے تھے۔ گرد و پیش کے صوبوں میں امن و امان تھا اور نظام حکومت عمدہ تھا۔ ہر قسم کے محصولات بغیر دقت کے وصول ہو جاتے۔ صوبائی دارالحکومت شاندار سرکاری عمارتوں سے عبارت تھے جو ڈاک اور کاروانوں کی موثر اور سرعت سے کام کرنے والی سروس سے باہم مربوط تھے۔ سرحدیں محفوظ تھیں اور ان کا انتظام خوب تھا۔ فوج وفادار تھی۔ صقلیہ (سسلی) سے عدن تک اور مصر سے وسطی ایشیا تک یکساں قوت اور پورے کنٹرول سے سلطنت برقرار تھی۔ مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر عیسائی، کافر اور یہودی ــــ اور انھی کے ساتھ مسلمان سرکاری دفاتر میں ملازم تھے۔ آمد و رفت کی کثرت اور دولت کی بہتات نے انقلاب اور قحط کو تمام

کردیا۔ جرائم پیشہ قصبوں میں بڑے احتیاط سے پولیس متعین کی گئی اور نظم وضبط روا رکھا گیا۔ وبائی اور دوسری بیماریوں کا علاج شاہی شفاخانوں میں کیا جاتا جہاں سرکاری طبیب متعین تھے۔ اس وسیع وعریض سلطنت میں کہیں بھی بغاوت یا بدنظمی نہ تھی۔

<u>مالیات</u> اسلام کے مالیاتی نظام کا بنیادی ذریعۂ آمدنی زکوٰۃ تھا۔ یہی ایک ٹیکس ہر مسلمان پر فرض تھا۔ سرکاری ملازم مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرتے۔ اس کے بعد مرکزی خزانے کی وساطت سے ضرورت مند مسلمانوں میں اسے تقسیم کیا جاتا۔ زکوٰۃ جنس اور رقم دونوں شکلوں میں وصول کی جاتی۔

نظامِ زکوٰۃ کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ تھا دولت کی ذخیرہ اندوزی (ارتکازِ زر) کا انسداد ہو گیا کیونکہ سب سے پہلی چیز جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی وہ جمع شدہ دولت تھی۔ پس تجارت اور صنعت میں روپیہ لگانے کے لیے دولت مندوں کی ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا کاروبار پھیلا اور سلطنت کے طول وعرض میں خوشحالی کا عام معیار بلند ہوا۔

اس طور زکوٰۃ سے قرآن مجید کی تعلیم کو تقویت پہنچی جس میں آیا ہے ——

"وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں سخت عذاب کی خبر دی جائے۔ یہ عذاب اس دن نازل ہوگا جب دوزخ کی آگ میں ان کی دولت سے حرارت پیدا کی جائے گی اور اس سے ان کے ماتھے، پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے مدفون کیا تھا۔ پس اپنے دفینے کا مزا چکھ لو۔"[1]

لغوی طور پر زکوٰۃ کے معنی تطہیر (پاک ہونے) کے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اہلِ ایمان کی تین طرح سے تطہیر کی —— اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے صحیح رقم کا فیصلہ مومن کے ضمیر پر چھوڑ دیا گیا اور اس حقیقت نے اسے ایمان کا ایک اہم تقاضا پورا کرنے میں مدد دی کہ زکوٰۃ کی رقم خیر کے کاموں پر صرف ہوتی۔ قرآن میں مذکور ہے۔

---

[1] یہ پارہ دس، رکوع ۹ کی چونتیسویں آیت کے ایک حصے اور پینتیسویں آیت کا ترجمہ ہے۔

"جب تک تم اللہ کی راہ میں وہ شے (فراخدلی سے) نہ دو جس سے
تمہیں محبت ہو تب تک تم کسی طور راستی نہ پاؤ گے اور تمھیں جس شے سے
محبت ہے اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں دیتے ہو اس سے وہ واقف ہے۔"

ستائیس ایسی آیتیں ہیں جن میں نماز اور زکواۃ کا ایک ساتھ ذکر آتا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے زکوٰۃ کا صرف یہی مطلب نہیں تھا کہ دولت کو پھیلا دیا جائے بلکہ اس سے مفلسوں کی مدد بھی مقصود تھی اور معاشرتی انداز میں اس سے تمام مسلمانوں میں مساوات قائم کرنے کے مثالی مقصد کو تقویت ملتی تھی۔

اسلامی ریاست کے مالی نظام کا واحد مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدے کی ضمانت ملے اور یہ طریقِ کار مسلسل اور بے لچک ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ——

"انسانی حقوق کے معاملے میں سب برابر ہیں۔"

اسلام کے اولین ایام میں پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مرکزی خزانے سے ہر آدمی کو مساوی حصہ دینے کی کوشش کی۔ حضرت علیؓ نے اس اصول کی پیروی کی اور بڑی دانشمندی سے غرباء کے حقوق کی یوں تعریف کی ——

"دولت مندوں کے مال میں غرباء کا اتنا ہی حصہ ہے جس سے ان
سب کی ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ پس اگر غرباء بھوکے ہیں یا انھیں
چیتھڑے لگے ہیں تو اس کا سبب امراء کی غفلت ہے۔"

بہر حال دولت مندوں کے مال کی لوٹ کھسوٹ نہیں کی گئی۔ اس بات کی احتیاط کی گئی کہ ان پر اس حد تک ٹیکس نہ لگایا جائے جس سے وہ بوجھ بن جائے اور نجی کاروبار یا صنعت میں روپیہ لگانا سود مند نہ رہے۔ پورا نظامِ محصولات جان بوجھ کر لچکدار رکھا گیا۔ کوئی ہنگامی ضرورت آپڑتی تو عارضی طور پر نیا ٹیکس لگا دیا جاتا۔ کساد بازاری کے زمانے میں ٹیکس معاف کر دیا جاتا۔

اسلامی دور میں بینکاری کو جو نظام شکل پذیر ہوا اس کے خدوخال ایسے تراشے گئے کہ ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ روپیہ گردش میں آئے اور انفرادی سرمایہ کاری اور کاروبار پر کم سے کم

پابندی لگائی جائے۔قرآن نے ہر صورت میں ربا (سود) حرام کیا ہے اور پولیس اس کی روک تھام کرتی۔ یہ بھی ایک انسدادی اقدام تھا کہ مرکزی بنک بلاسود قرض دیں۔ البتہ قرضدار پر لازم تھا کہ بنک کو مساوی طور پر نفع اور نقصان میں شریک کرے۔ درحقیقت جس طرح وہ بنک کا حصہ دار تھا اسی طرح بنک اس کے کاروبار میں شامل تھا۔

بیت المال کا اسلامی ادارہ درحقیقت حکومت کے موجودہ مرکزی بنک کی مانند تھا نیز اس کی سرگرمیاں اور امور و فرائض بھی ویسے ہی تھے البتہ کرنسی کے اجراء کا معاملہ اسلامی ریاست کے سپرد تھا۔ آج کوئی اسلامی ملک اسلامی قوانین کے مطابق مرکزی مالیاتی ادارہ قائم کرسکتا ہے۔ اس اسکیم کے تحت تمام موجودہ بنک دو ترامیم کے بعد جاری رکھے جاسکتے ہیں۔ بنکوں میں جو روپیہ جمع کیا جائے اس پر سود نہ دیا جائے اور جو قرض دیے جائیں ان پر سود نہ لیا جائے۔ چونکہ بینکاری کا یہ ترمیم شدہ ادارہ فلاحِ عامہ کے لیے چلایا جائے گا ـــــــــ لوگوں کی صنعتی اور اقتصادی ضرورتیں پوری کرے گا اور شفاخانوں ایسے فلاحی ادارے چلائے گا اس لیے حکومت بنک قائم کرنے کے لیے ابتدائی اخراجات اور انہیں جاری رکھنے کے لیے اتفاقی اخراجات اسی طور پورے کرے جس طور پر سرکاری شفاخانوں کے لیے کرتی ہے۔ متبادل طور پر بنکوں کے قرضوں کو صنعتی اداروں کے لیے سرمایے کی رسد قرار دے سکتے ہیں۔ بنکوں کے قیام کا خرچ صنعتی اداروں کے نفع سے پورا کیا جائے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آج کسی اسلامی مملکت میں ایسا بنک فروغ نہ پاسکے۔ آزمائش کے طور پر ایسے اقدام کے حق میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔

> ''سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظام اس مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہے ہیں جسے حل کرنے کے لیے بیت المال نے سعی کی۔''

تقسیمِ دولت کے مسئلے پر اسلام نے کمیونزم اور اشتراکیت کے بین بین راہ اختیار کی۔

پروفیسر موسینون یوں رقمطراز ہے ـــــــــ

> ''اسلام میں یہ وصف ہے کہ وہ ہر شہری کے لیے نظریہ مساوات کی بہت زیادہ حمایت کرتا اور اس سے قومی وسائل میں شرکت کی توقع رکھتا ہے۔ یہ بینکی سرمایے کے اندھادھند لین دین، ریاستی قرضوں اور بنیادی

ضرورت کی اشیاء پر بالواسطہ محصول کے خلاف ہے البتہ باپ اور شوہر کی نجی ملکیت اور تجارتی سرمایے کا حق تسلیم کرتا ہے۔ یہاں پھر یہ سرمایہ داری نظام اور بالشویکی (روسی) کیمونزم کے نظریات میں بین بین رہتا ہے۔''

مالیات کے باب میں قرآن کے تمام بیانات سے ایک بات جو سب سے زیادہ واضح طور پر اُبھرتی ہے یہ ہے کہ تمام دولت من جانب اللہ ہے اور بدیں صورت اسے کسی کا اجارہ نہیں بننے دیا جا سکتا۔ یہ اللہ کی ہے تاہم اس کے لیے جدّ وجُہد کرنا قابلِ قدر ہے اور قرآنِ حکیم محنت و مشقت کرنے اور دولت کمانے کے لیے بار بار مسلمانوں کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں لکھا ہے ــــــــ

''جب نماز تمام ہو جائے تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کی جستجو کرو اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''[1]

حج کے ایام میں بھی روپیہ کمانے کی اجازت تھی۔

نبی کریم صلعم نے محنت مزدوری کرنے کے لیے حوصلہ افزائی فرمائی ــــــــ

''جائز طریقوں سے روزی کمانا نماز کے فریضے کے بعد دوسرے درجے پر اہم ہے۔''[2]

''حشر کے دن میں تین گروہوں کے آدمیوں سے لڑوں گا۔ ان گروہوں میں ایک وہ آدمی ہوگا جو مزدوروں سے پورا پورا کام لیتا ہے لیکن کام کے مطابق انہیں دام نہیں دیتا۔''

اسلام میں امن درہم برہم کرنے والے ہنگاموں کی طرح ہڑتالوں کی بھی ممانعت کی گئی کیونکہ نئی بسائی ہوئی بستیوں میں ترقی کے لئے امن ضروری تھا۔ اگر شکایات پیدا ہوتیں تو ثالثی اور مصالحتی بات چیت کے لئے ادارہ موجود تھا۔ تمام معیشت اس انداز سے مرتب کی جاتی تھی کہ توازن برقرار رہے۔

مؤرخ ہمیں بتاتے ہیں کہ روما کی سلطنت اس لیے تباہ و برباد ہوئی کہ مزدوروں کے طبقوں میں بے اطمینانی بڑھ گئی تھی۔ اسلام میں اس قسم کی بے اطمینانی ممکن نہ تھی۔

1۔ پارہ ۲۸ آیت کریمہ ۱۰

2۔ بروئے کنزالعمل۔ جلد دوم

ایک حدیث یوں مرقوم ہے ــــــــ

"تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اللہ کو سب سے زیادہ وہ محبوب ہے جو سب سے زیادہ کنبے کا بھلا کرتا ہے۔"

اسلام تمام اہلِ ایمان سے کہتا ہے کہ وہ جس قدر معاشرے سے لیتے ہیں اس سے زیادہ اُسے دیں۔

آجروں میں اشتراکِ عمل کی اس روشن خیالی اور مزدوروں میں قوم سے وابستگی کے اس سچے شعور نے صدیوں پہلے فلاحی مملکت کا تصور دیا۔ اس نظامِ معیشت کو اس لیے فروغ ملا کہ اسے زبردست ترین مالی سہارا ملا اور مالی مساوات کا قابلِ ذکر سلسلہ قائم تھا۔ یہاں پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں مادّی اور روحانی معاملوں کے تانے بانے کس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــــــ

"دنیوی فلاح کے لیے اس طرح کام کرو جیسے تمھیں ہمیشہ زندہ رہنا ہو اور آخرت کے لیے اس طرح کام کرو جیسے تمھیں کل ہی مرنا ہو۔"

محنت کشوں، سرمایہ داروں اور بینکاروں کے لیے اس سے بہتر حکم اور کیا ہو سکتا ہے۔

غیر جانبدار اور آزاد عدلیہ شعبہ قانون میں اسلام کا سب سے اہم یہ کام ہے کہ اس نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کیا۔ اس معاملے میں خلیفہ نے مثال قائم کی اور جب کبھی موقع پیدا ہُوا اس نے عام شہری کی طرح قانون کے آگے سرِ تسلیم خم کیا۔ خلیفہ حضرت عمرؓ بن الخطاب اور اُبو ابنِ کعب میں تنازعہ ہوا تو اوّل الذکر کو زید بن ثابت کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ جب حضرت عمرؓ عدالت کے کمرے داخل ہُوئے تو قاضی نے اپنی نشست خالی کر دی اور آپ سے اس پر تشریف رکھنے کو کہا، خلیفہ نے چلّا کر کہا: ابنِ ثابت (قاضی) اس مقدّمے میں تم نے یہ پہلی ناانصافی کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ترجیحی سلوک مسترد کیا اور فریقِ ثانی کے برابر بیٹھ گئے حضرت علیؓ نے بھی قانون کی بالادستی کے معاملے میں ایسے ہی شعور کا مظاہرہ کیا۔ جب ایک عام مزدور نے عباسی خلیفہ منصور کے خلاف مقدّمہ دائر کیا تو خلیفہ بہ نفسِ نفیس معمولی شہری کی طرح قاضی کے رُوبرو آیا۔ اسی طرح خلیفہ المامون کو ایک معمولی عورت کی شکایت کا جواب دینے کی غرض سے قاضی کے پیش ہونا پڑا۔

قانون کی بالا دستی براہِ راست قرآنی احکامات اور رسول اکرم ﷺ کے مثالی کردار کا نتیجہ ہے۔

ایک بار جلیل القدر قریشی خاندان کی ایک عورت نے چوری کی جس کی سزا میں ہاتھ کاٹے جاتے تھے۔ خاتون کے لواحقین حضرت عثمان بن ثابت سے ملے تا کہ وہ معافی کے لیے رسول اکرم ﷺ سے التجاء کریں۔ رسولؐ اللہ نے جواب میں فرمایا ———

> ''عہدِ گزشتہ میں قومیں اس لیے مٹ گئیں کہ جب ان میں سے کسی بڑے آدمی نے چوری کی یا کوئی اور جُرم کیا تو اُسے سزا دیے بغیر چھوڑ دیا گیا لیکن اس صورت میں غریب آدمی کو سزا دی گئی۔ واللہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو یقیناً اس کے ہاتھ کٹوا دیے جاتے''۔

یہ سزا اگرچہ سخت تھی لیکن وقت کے مُطابق تھی اور اُصول یہ کارفرما تھا کہ انصاف برقرار رہے۔ ہم پھر اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ انصاف کے کمترین طالب خود کو کس قدر اسلام کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔

حصّہ اوّل کا تتمّہ



پچھلے صفحوں میں متعدد مغربی عالموں کے حوالے دیے گئے ہیں بعض کے حوالے مفصّل ہیں۔ حصہ اوّل کے اِتمام کے لیے یورپی اور امریکی عالموں کے چند حوالے مختصر دیے جاتے ہیں جو خلاصے کا کام دیں گے اور اسلام کے اس کارنامے کی بھی قدر افزائی ہوگی جو اس نے مغربی دنیا کی ذہنی اور مادّی ترقی کے لیے انجام دیا۔

''ادھر یورپ کے باشندوں میں وحشت و بربریت تھی ـــــــ ان کی نسبت بڑی مشکل سے کہا جا سکتا ہے کہ وحشیانہ حالت سے باہر نکلے ہوں گے۔ یہ لوگ جنگلوں میں جھونپڑے بنا کر رہتے تھے اور گھاس پر چلتے تھے ـــــــ برے حالوں لوبیا، باقلا اور پیڑوں کی چھال تک کھا کر گزارہ کرتے۔ اِدھر اگر یورپ کے جنوب مغربی حصے کی طرف توجہ دیں تو دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ شمالی افریقہ کے عرب آبادکاروں نے آ کر ایک تابناک تہذیب پروان چڑھائی۔''[1]

''قدیم یا جدید عہد کا ایسا کوئی کارنامہ نہیں جو مسلمان عربوں کے کارناموں کی گرد کو پہنچے۔ نہ ان کی طرح کوئی کارنامہ اس تیزی سے سرانجام ہوا اور نہ انسانی نسل کی ذہنی ترقی پر اس قدر فیصلہ کن اثرات مرتب ہوئے۔''[2]

''علمی و فنی اور صنعتی سرگرمیوں میں عرب تمام دنیا پر سبقت لے گئے تھے۔''[3]

1۔ ڈریپر کی INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE صفحات ۲۷۔۲۸
2۔ ایس۔ پی۔ اسکاٹ کی تالیف MOORISH EMPIRE IN EUROPE
3۔ گریگوری کی DISCOVERY ص ۱۲۸

''مسلمانوں کے دورِ حکومت میں مملکتِ اندلس آدھی صدی میں انسانی عروج کے اس مقام پر پہنچ گئی جو اطالیہ (اٹلی) کو اپنے کلیسائی سربراہوں کے عہدِ اقتدار میں ایک ہزار سال میں بھی حاصل نہ ہوا۔''[1]

''مسلمانوں نے چھ صدیوں میں علم کے باب میں جو فتوحات حاصل کیں وہ تلوار کی فتوحات سے کہیں زیادہ تھیں۔''[2]

''ازمنۂ وسطیٰ میں تنہا مسلمان (عرب) تہذیب کے نمائندے تھے۔ انھوں نے اس وحشت و بربریت کا مقابلہ کیا جو یورپ میں پھیلی ہوئی تھی۔''

سٹینسلاس گائیرڈ ''انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن'' میں رقمطراز ہے ——

''ازمنۂ وسطیٰ میں اسلام کی تاریخ بنفسہٖ تہذیب وتمدّن کی تاریخ ہے۔''

۱۔ ایس۔ پی۔ اسکاٹ کی مذکورہ بالا تالف۔ جلد اول ص ۳۳۲

۲۔ OUR ELDER BRETHERN ص ۱۲۲

ضمیمہ ایک

مسلمان اور اسکندریہ کا کتب خانہ

مدتوں یہ باور کیا جاتا رہا کہ جب عمرو بن العاص نے مصر فتح کیا تو اس نے اسکندریہ[1] کا عظیم کتب خانہ تباہ کیا لیکن مغرب کی حالیہ علمی تحقیقات نے اسے غلط ثابت کیا ہے۔ تمام مسلمانوں کو اس الزام کی تردید کرنی چاہیے۔ راقم الحروف خوش ہے کہ قارئین کو صحیح واقعات بتانے کے قابل ہے۔

---

[1] سکندر اعظم نے ۳۳۱ق۔م میں اس شہر کی بنیاد رکھی۔ دریائے نیل کے مغربی دہانے کے قریب مصر کے شمالی ساحل پر واقع ہے۔ یونانیوں کے دور میں یہ اہم علمی مرکز تھا۔ شہر کے درمیان میں سے آر پار چوڑی چوڑی سڑکیں گزرتیں۔ کہتے ہیں بطلیموس ثانی نے بندرگاہ پر روشنی کا مینار تعمیر کیا تھا۔ یہی فرماں روا ایشیا سے سکندر کی لاش لایا اور پھر اس نے اسے عالیشان مقبرے میں دفنایا۔ یہاں دریائے نیل سے ایک نہر بھی نکالی گئی۔

شہر روما کے عروج سے قبل اسکندریہ ہی دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ مصریوں اور یونانیوں کے علاوہ یہاں عرب، ایرانی، اناطولیہ کے لوگ، حبشی اور شامی آباد تھے۔ یہاں بطلیموس کا کتب خانہ، میوزیم، اسلحہ خانہ، یونانیوں کے معبد، سیرگاہیں، چڑیا گھر، سرکاری عمارتیں، عدالتیں، جمیزیم، سٹیڈیم، شہر رفتگان (قبرستان)، اشنان گھاٹ اور تفریح گاہیں تھیں۔ افرودائتی (حسن اور جنسی خواہشات کی دیوی) کا معبد بھی تھا جہاں پاکباز رنڈیاں (دیوداسیاں) رہتیں۔ قدیم مصری دیوی آئسس پجتی۔ یونانیوں نے مصریوں کو اپنے مذہبی رنگ میں رنگنے کی بڑی کوشش کی لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ آئسس عورتوں کی دیوی بھی تھی اور دھرتی دیوی بھی۔ جب عیسائیت پھیلی تو یہی مریم بن گئی۔

اسکندریہ میں دولت کی ریل پیل تھی۔ کھیل کے میدان تھے۔ کھیل تماشے عام تھے۔ ادھر علم وفن کی درسگاہیں تھیں، ادھر شراب خانے تھے۔ یہاں شرابی بھی تھے، فلسفی بھی، شاعر بھی۔ عورتیں آزاد تھیں اور عیش وطرب کے سامان فراواں تھے۔ "نفیس ترین نجی ایوان رنڈیوں کی ملکیت تھے۔ ہر طبقے کی عورتیں بازاروں میں آزادی سے گھومتیں، دکانوں پر جا کر خرید وفروخت کرتیں اور مردوں سے ملتی جلتیں۔ بعض عورتوں نے ادب اور علم میں نام پیدا کیا۔ مقدونیہ کی بیگمات اور شہزادیاں سرگرمی سے سیاست میں حصہ لیتیں۔ انھوں نے مردوں کو جوش وخروش اور ولولہ بھی دیا۔" یہودی غلام بھی بہ کثرت ملتے۔ (مترجم)

معلوم ہوتا ہے کہ عبد الطیف البغدادی پہلا شخص ہے جس نے کتب خانے کی تباہی کا قصہ بیان کیا۔ یہ شخص ابنِ العاص کی فتح کے کوئی چھ سو سال بعد ۱۲۳۲ش میں فوت ہوا۔ البغدادی نے دعویٰ کیا کہ خلیفہ کے حکم سے شہر کے بڑے بڑے حماموں کی بھٹیوں میں اسکندریہ کے عظیم الشان کتب خانے کی کتابیں جھونکی گئیں لیکن اس کے کسی ہمعصر نے ایسی غارت گری کا ذکر نہیں کیا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں مصر میں کوئی قابلِ ذکر کتب خانہ ہی نہ تھا۔ بطلیموس کا کتب خانہ تھا سوا سے جولیس سیزر نے ۴۸ق۔م میں تباہ کردیا۔ پلوتارک [1] اس کا ذکر اپنی تالیف ''سوانح حیات'' میں یوں کرتا ہے ــــــــ

''جب جولیس سیزر نے اپنا بیڑہ دشمن کے قبضے میں دیکھا تو وہ خطرے سے بچنے کے لیے اسے آگ لگانے پر مجبور ہوا۔ اس کے شعلے بندگاہ سے پھیلے اور انہوں نے (اسکندریہ) کا کتب خانہ جلا دیا۔''

سینی کون (۴۶ش) کی بھی یہی رائے تھی۔ اس کے تخمینے کی رو سے سیزر نے جو کتابیں جلائیں ان کی تعداد چار لاکھ تھی۔ دایو کیشیس (۱۵۰ تا ۲۳۰ش) بتاتا ہے کہ آگ ان عمارتوں تک پہنچ گئی تھی جو کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ۲۷۳ش میں شاہنشاہ اوریلیان نے مصریوں کی بغاوت [2] کے جواب میں بچے کھچے کتب خانے کو سپردِ آتش کردیا۔ ہمیں اس امر کا پتا بھی چلتا ہے کہ ۳۸۹ میں ایک نیا کتب خانہ قائم کیا گیا اس کا نام ''کتب خانہ دختر'' تھا۔ اسے شہنشاہ

۱۔ پلوتارک (۴۶ تا ۱۲۰ش) سوانح نگار اور اخلاقیات دان تھا۔ روما میں جا کر اس نے اخلاقیات کے موضوع پر لیکچر دیے۔ یونان اور اطالیہ میں سیر و سیاحت کرتا رہا۔ اسکندریہ بھی آیا۔ ڈلفی (کہانت گاہ) میں پروہتوں کی درسگاہ کا رکن تھا۔ اس کی تحریریں بے حد دلچسپ ہیں۔ (مترجم)

۲۔ بطلیموسوں نے افواج اور جنگی کارروائیوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جس سے عوام میں بے چینی پھیلی۔ ان کے بعد جو حکمران آئے وہ تو بالکل غنڈے تھے۔ انہوں نے جبراً لوگوں سے روپیہ لیا۔ چونکہ لیٹرے غیر ملکی تھے اس لیے عوام میں ان کے خلاف نفرت پیدا ہوئی۔ ادھر پروہتوں کا طبقہ بھی نالاں تھا کیونکہ ایرانیوں اور یونانیوں کی آمد سے قبل اسے مصر میں بے پناہ اثر و رسوخ حاصل تھا۔ کسانوں پر اتنی سختی کی گئی کہ انہوں نے کھیتی باڑی ترک کردی۔ پرانی تہذیب جسے زراعت نے جنم دیا تھا کھنڈر ہو کر رہ گئی۔ نوبیا میں سونے کی کانوں میں کام کرنے والے لوگ زندگی سے تنگ آ گئے۔ ملک بھر میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مصریوں نے پہلی بار ۲۱۶ق۔م اور دوسری بار ۱۸۹ق۔م میں بغاوت کی۔ دوسری بغاوت پانچ سال تک رہی۔ (مترجم)

تھیودوسئیس کے حکم پر تباہ کیا گیا۔[1] پھر جب عمرو بن العاص نے مصر فتح کیا تو اسکندریہ میں ایسا کوئی کتب خانہ نہ تھا جسے جلایا جاسکتا۔

پروفیسر الفریڈ بٹر نے اس موضوع پر نہایت دلکش کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام "فتح العرب مصر یہ" ہے اور ۱۹۳۳ میں قاہرہ میں چھپی تھی۔ پروفیسر نے واضح کیا ہے کہ حضرت عمرؓ ایسے پاکباز اور متقی خلیفہ کے لیے کتابوں کی تباہی کا حکم نافذ کرنا ممکن نہ تھا۔ انہیں خبر تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کتابوں کی کتنی قدر کرتے تھے۔

پروفیسر ایلفریڈ بٹر کے نزدیک عملی صورت یہ تھی کہ یہ نام نہاد کتابیں کاغذ پر نہ لکھی گئی تھیں۔ یہ تو چمڑے اور پیپیرس کے رول تھے جنھیں مضبوطی سے لپیٹ لیا ہوگا۔ یہ بڑی مشکل سے آگ پکڑتے تھے۔ کاغذ سے کہیں کم آگ پکڑتے۔ اگر انہیں حماموں میں جلایا جاتا تو ان سے درجہ حرارت بڑھ نہ سکتا تھا۔ کتب خانہ تو رہا ہی نہ تھا۔ اگر کوئی کتب خانہ ہوتا تو اسے جلا کر وہ نتائج پیدا نہ کیے جاسکتے تھے جو داستان میں مذکور ہیں۔

---

[1] اسکندریہ کا کتب خانہ بطلیموس اول نے قائم کیا اور بطلیموس ثانی نے اس میں توسیع کی۔ یہ کتب خانہ شاہی محل کے ایک حصے میں تھا۔ کتب خانے کی ایک شاخ دیوتا سیراپس کے معبد کے پہلو میں تھی۔ کہتے ہیں بطلیموس ثانی نے ارسطو کا کتب خانہ خرید لیا تھا۔ بطلیموس ثالث نے جالینوس سے نامور یونانی ڈرامانگاروں ایسکی لس، سوفوکلیز اور یوری پیدیز کے ڈراموں کے متون کی نقول حاصل کر لی تھیں۔ جالینوس یہ بھی بتاتا ہے کہ جب کوئی جہاز اسکندریہ میں لنگر انداز ہوتا اور اس کی تحویل میں کوئی کتاب ہوتی وہ چھین لی جاتی۔ (مترجم)

ضمیمہ دو

عرب بحیثیت، مترجمین اور خلقی مُفکّرین

تین مرحلے ہٹی کہتا ہے ــــــ

"جب عربوں کو زرخیز ہلال [1] پر فتح نصیب ہوئی تو اس وقت یونانیوں کا علمی ترکہ بلاشک وشبہ سب سے قیمتی خزانہ تھا جو ان کے ہاتھ لگا۔"

مختلف مترجمین پر گفتگو کرنے کے بعد وہ یوں بات تمام کرتا ہے ــــــ

"ترجمے کے دور کے خاتمے سے پہلے ارسطو کی تمام موجودہ تصانیف عرب قاری کو میسر تھیں ...... پھر ابنِ سینا اور ابنِ رُشد کی وساطت سے یہ تصانیف لاطینی میں منتقل ہوئیں اور ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کی تعلیمات پر واضح طور پر اثر انداز ہوئیں۔"

اس کے بعد عربی تعلیم کا دوسرا مرحلہ آیا جب مترجمین نے بھی اس میں شرکت کی۔ ہٹی نے اپنی تالیف [2] میں بدیں الفاظ اس کا خلاصہ پیش کیا ہے ــــــ

"ترجمے کے تاریخی دور (۷۵۰ تا ۸۵۰ ش) کے بعد تخلیقی سرگرمی کا دور آیا کیونکہ عربوں نے نہ صرف ایران کی قدیم دانش اور یونان کے کلاسیکی ورثے پر عبور پا لیا تھا بلکہ اپنی سوچ کے مخصوص طریقوں اور تقاضوں کے مطابق اسے ڈھال لیا تھا۔ طب اور فلسفے میں ان کا آزادانہ کام الکیمیا، فلکیات، ریاضی

---

[1] یہ ہلال کا زرخیز علاقہ FERTILE CRESCENT فلسطین سے شروع اور صحرائے شام کے گرد سے ہو کر خلیج فارس تک پہنچتا ہے (مترجم)

[2] HISTORY OF THE ARABS

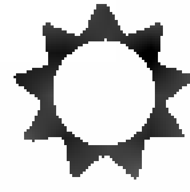
اور جغرافیے سے کم نمایاں نہ تھا۔ قانون، دینیات اور لسانیات میں عرب اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے انہوں نے تخلیقی اسلوب میں فکری اور تحقیقی کام کیا۔ عربوں کے ذہن نے کئی صدیوں تک ان تراجم کے ذریعے بڑی حد تک انقلاب بپا رکھا۔ پھر یہ سرمایہ متعدد نئے کاموں کے ساتھ شام، ہسپانیہ اور صقلیہ (سسلی) کے ذریعے یورپ میں پہنچا۔ یہی اس علم کی بنیاد بنا جو ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے فکر پر مسلط رہا۔ تہذیب اور تمدن کی تاریخ کے زاویے سے علمی ترکے کا یہ انتقال تخلیقی کام سے کم اہم نہیں کیونکہ اگر ارسطو، جالینوس اور بطلیموس کا کام بعد کے زمانے میں کھو جاتا تو دنیا ایسی مفلس ہو جاتی جیسے یہ کام کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ ترجمے اور تخلیقی کام میں واضح طور سے ہمیشہ حدِ فاضل قائم نہیں کی جا سکتی۔ کتنے ہی مترجم علمی کام میں شریک ہوئے۔"

عربوں کے علم کا تیسرا اور آخری مرحلہ بارھویں صدی میں آیا جب مغرب کے عالم عربی علوم و فنون سیکھنے طلیطلہ آئے۔ ان کا صاف مقصد عظیم عرب علماء کے کارناموں کو لاطینی میں منتقل کرنا تھا۔ اس زمانے میں مغرب کے طلبہ یہی زبان سب سے زیادہ عمدگی سے سمجھ پاتے تھے۔ قبل ازیں چند صدی تک عربوں کے لیے یونانی علم کی جو حیثیت تھی وہی حیثیت اب عربوں کے علم کی عیسائی دنیا کے لیے تھی ——— یہی اب اندھیرے میں مشعلِ راہ تھا۔

●

اسلام اور مذہبی رواداری

حصّہ دوم



قارئین نے اس کتاب کے پہلے حصے میں اس علمی اور مادی ترقی کا حال پڑھا ہے جو اسلام کا خاصا بنی۔ دوسرے حصے میں اس شے کی جانب توجہ منعطف کروائی جائے گی جو غیر مادی نوعیت کی ہے۔ اس سلسلے میں بطورِ حوالہ جامعیت کے ساتھ انسانی حقوق کا نام لیا جا سکتا ہے۔

انسانی حقوق کے فروغ میں اسلام نے جو حصہ لیا وہ بیک وقت بدرجۂ غایت روحانی اور بہ شدت عملی ہے۔ جہاں تک عملی پہلو کا تعلق ہے شریعت میں جتنے احکام (اوامر و نواہی) شامل کیے گئے ان میں کسی ایسی تفصیل سے بے اعتنائی نہیں برتی گئی جو اچھے انسانی تعلقات کے لیے ضروری ہو۔ روحانی پہلو سے اگر یہ تفصیلات اسلام کے اس بنیادی عقیدے سے ہم آہنگ نہ ہوتیں کہ اللہ نے سب انسانوں کو برابر برابر پیدا کیا ہے اور اگر بردباری کی روح مفقود ہوتی تو یہ قابلِ عمل نہ ہوتیں۔

(مقبولِ عام غلط نظریے کے خلاف دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے مقابل اسلام میں سب سے زیادہ بردباری ہے۔ اسی رواداری کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے صرف تصور کی حد تک نہیں بلکہ عملی طور سے ایسا معاشرہ پیدا کیا جو تمام دوسرے معاشروں کی نسبت کہیں زیادہ روشن خیال تھا۔ رواداری تمام عدل و انصاف، تمام بین الاقوامیت اور تمام سوجھ بوجھ کی جڑ بنیاد ہے۔ مسلمانوں نے جو کئی ایک ملک فتح کیے تو یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ یہ سب کچھ اسلام کی بنیادی تحریک سے ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ دوسرے حصے کی ابتداء اسلام اور مذہبی رواداری کے باب سے ہو رہی ہے۔ پھر یہیں سے ہم حقوقِ شہری، حقوقِ نسواں، غلامی اور رنگ و نسل کے مسائل کا جائزہ لینے

بڑھے ہیں۔ رواداری کے خیر کے پہلو پر یقینِ کامل سے ابتدا کرکے سچی جمہوریت کی بنیاد تک پہنچیں تو یہ صرف چھوٹا سا اقدام ہوگا لیکن رنگ و نسل اور مذہب و ملت کی تمیز کیے بغیر تمام انسانوں کی مساوات پر عقیدہ رکھیں تو اس نظریے کی جانب راہنمائی ہوتی ہے کہ انجامِ کار اس جھگڑے اور فتنے سے بالاتر ہو کر بین الاقوامیت کی کوئی صورت پیدا ہو جو قومیت پرستی سے لازم و ملزوم ہے۔ تیرہ سو سال قبل اخوتِ اسلامی نے حقوقِ انسانی کی ضمانت دینے اور انہیں برقرار رکھنے کی راہ نکالی۔ ~~قارئین کو اب اس کا جائزہ لینے کی دعوت دی جاتی ہے۔~~ موجودہ دور میں رواداری

دین میں جبر نہیں (قرآن حکیم) صدیوں تک اہلِ مغرب اپنے مسلمان فاتحین کو ایسے جابر حکمران سمجھنے میں سہولت پاتے تھے جنھوں نے (ان کے خیالِ خام میں) تلوار کے زور سے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا اور اپنے ضابطۂ مذہب کے سوا کسی دوسرے مذہب کے عقائد اور اس کی رسوم کو برداشت نہیں کیا۔ تازہ تر علمی تحقیقات بہ عجلت اس ناپاک الزام کی تردید کرتی ہیں لیکن بدقسمتی سے بدنام کرنے والے پرانے دفاتر نے جو جذبات و تعصبات پیدا کیے ہیں وہ آج بھی نہ صرف یورپ کے ان لوگوں میں پائے جاتے ہیں جو اسلام سے بے خبر ہیں بلکہ ان مسلمانوں میں بھی جنھوں نے اپنے علمی ورثے کو نظرانداز کرکے مغربی تعلیم حاصل کی ہے۔

قرآن مجید میں آیا ہے ——— "دین میں جبر نہیں۔" اور تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ مسلمان سپہ سالاروں نے مفتوحہ علاقوں پر بہ امن و امان قبضہ کیا۔ انگریز مؤرخ فنلے لکھتا ہے ~~...~~

> "مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں غیر مسلموں کو زبردستی اسلام قبول کروانے کے لیے کوئی منظم کوشش نہیں ہوئی، عیسائیت کے خاتمے کی غرض سے باقاعدہ ظلم و ستم بھی روا نہیں رکھا گیا۔ اگر خلفاء ان دونوں میں سے کوئی راہ اختیار کرتے تو عیسائیت کو اسی آسانی سے کچھ دیتے جس آسانی سے فرڈیننڈ اور ازابیلا نے کیا۔ انھوں نے اسلام کو ہسپانیہ سے خارج کیا یا لوئی چہاردہم نے فرانس میں پروٹسٹنٹ عقائد کو سزا کے قابلِ قرار دیا یا جیسے یہودیوں کو ساڑھے تین سو برس تک انگلستان میں داخل نہ ہونے دیا گیا۔ ایشیا میں آج تک

عیسائیوں کی عبادت گاہوں کا قائم رہنا اس عام رواداری کا زبردست ثبوت ہے جو اسلامی حکومتوں نے اپنی غیر مسلم رعایا سے روا رکھی۔"

جنگوں میں خون بہتا ہی رہا لیکن ایسی بھی مثالیں ہیں کہ فتوحات خون بہائے بغیر ہوئیں۔ مسلمان سپہ سالار اس امر کے پابند تھے کہ دشمن کو ہتھیار ڈالنے کا موقع دیے بغیر اس سے جنگ نہ کریں ــــــ لیکن مسلمانوں کی مہمات کی نسبت سب سے حیرت انگیز حقیقت وہ رحم دلی ہے جو انہوں نے زبردست فتح حاصل کرنے کے بعد مفتوحہ لوگوں سے روا رکھی حالانکہ ان سے جو پرامن اور فراخدلانہ سمجھوتے ہوئے ان کی امید کے لیے ان کے پاس کوئی وجہ نہ تھی۔ مفتوحین سے رحمدلانہ اور انسان دوستی کے اس طرزِ عمل کی نظیر تو خود نبی کریم ﷺ نے رکھی جب حضور مکہ میں فاتح کی حیثیت سے تشریف لائے۔ مورخ آرتھر گلیمن(۱) اس شاندار واقعے کی نسبت رقمطراز ہے ــــــ

"یہ امر ان کے لیے تحسین آفریں ہے کہ اس موقع پر جبکہ ماضی میں ان سے کی ہوئی بدسلوکی سے پیدا شدہ نفرت اُنھیں انتقام پر ابھار سکتی تھی انھوں نے اپنے لشکر کو خون خرابے سے روکا اور بہر صورت عجز و انکسار کا اظہار کیا اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کیا۔ صرف دس بارہ آدمی ایسے تھے جنھیں سزا دی گئی کیونکہ انھوں نے سابقہ موقعے پر وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان میں سے صرف چار کو سزائے موت دی گئی لیکن ان اقدامات اور اعمال سے یہ کہیں زیادہ انسانیت پرستانہ ہیں جو دوسرے فاتحین سے سرزد ہوئے۔ مثال کے لیے صلیب و ہلال کی جنگوں کے عیسائی فاتحین کے ظلم و تشدد سے مقابلہ کیجیے! ۱۰۹۹ ء میں جب یروشلم ان کے قبضے میں آیا تو انہوں نے ستر ہزار مسلمانوں ــــــ آدمیوں، عورتوں اور بے بس بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا ــــــ

سچ تو یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح مذہبی تھی، سیاسی نہ تھی۔ انہوں نے ذاتی احترام اور شاہی اقتدار کو بہر شکل مسترد کیا۔ جب قریش مکہ کے مغرور و سرکش سرداران کے سامنے آئے تو انہوں نے (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

پوچھا۔تم مجھ سے کس سلوک کی امید رکھ سکتے ہو؟" سردار نے کہا،" اے فیاض بھائی! رحم کی" ! نبی اکرم ﷺ نے فرمایا،" ایسا ہی ہوگا۔جاؤ، تم آزاد ہو!" [1]

ایچ۔ایم ہائیڈمین نے بھی اپنی معروف تالیف [2] میں فتح مکہ کے موقع پر ہمارے نبی اکرم ﷺ کے فیاضانہ سلوک کے جذبے کی اسی طرح تعریف وتوصیف کی ہے۔اسی طرح جوزف شاکٹ [3] نے بھی اس لافانی نقش کا ذکر کیا ہے جو ایسے موقع پر نبی اکرم (ﷺ) نے ذاتی اثر ورسوخ اور مثال سے اسلام پر ثبت کیا۔ [4]

پروفیسر نیتھنیل شمٹ [5] بھی "نیو انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا" (۱۹۱۶ء) میں نبی اکرم (ﷺ) کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے ــــــــ

"وہ (حضرت محمد ﷺ) پیغمبروں کے اس گروہ سے تھے جنھوں نے مروجہ ضابطے سے کہیں زیادہ پروقار ضابطہ نافذ کیا اور بے خوف ہو کر خود کو اپنے منصب عالی کے لیے وقف کر دیا اور اپنی اندرونی قوت سے بے قابو ہو کر انہوں نے خود کو اس کے حوالے کیے رکھا۔" [6]

(3) رواداری

(خلیفہ حضرت عمرؓ) نبی اکرم ﷺ کی قائم کردہ مثال پر عمل کرتے ہوئے بعد میں کئی مسلمان فاتحین نے اپنے مفتوحین سے رواداری کے اسی رویے کا اظہار کیا۔حضرت عمرؓ ایسے ہی آدمی تھے جنھوں نے یروشلم حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں سے رواداری برتی اور ڈریپر نے اس واقعے پر خاص طور سے تبصرہ کیا ہے۔ [7] ڈریپر مسلمانوں کے اسی انسانیت پرستانہ سلوک کا مقابلہ عیسائیوں کے اس اقدام سے کرتا ہے جو انہوں نے صدیوں بعد یروشلم واپس لینے کے بعد مسلمانوں کے قتلِ عام کے لیے کیا وہ کہتا ہے ــــــــ

۱۔ THE SARACENS لندن، ۱۸۸۷، صفحات ۱۸۴، ۱۸۵

۲۔ THE AWAKENING OF ASIA

۳۔ JOSEPH SCHACHT

۴۔ ENCYCLOPAEDIA OF SOCIAL SCIENCES جلد دہم، ۱۹۳۳ء

۵۔ NATHANIEL SCHMIDT

۶۔ ENCYCLOPAEDIA OF SOCIAL SCIENCES جلد ۱۲، صفحہ ۷۲

۷۔ THE HISTROY OF INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE جلد ۲

"جب خلیفہ عمرؓ نے ۶۳۷ء میں یروشلم پر قبضہ کیا تو وہ بطریق سوف رونیس کے پہلو بہ پہلو اونٹ پر سوار ہو کر شہر میں گئے اور اس کی پرانی یادگاروں کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ نماز کا وقت آیا تو کلیسا احیائے ربانی میں تھے۔ انھوں نے وہاں نماز پڑھنے سے انکار کیا۔ باہر نکل آئے اور کلیسائے قسطنطین کے زینوں پر نماز ادا کی۔ انھوں نے بطریق سے کہا، اگر میں یہاں نماز پڑھ لیتا تو مستقبل میں مسلمان میری مثال کی پیروی کے رنگ میں معاہدہ شکنی کرتے۔"

خلاف ازیں حضرت عمرؓ اپنی زندگی کے بعد اپنی مملکت میں غیر مسلموں کی تقدیر کے بارے میں اس قدر مضطرب تھے کہ انہوں نے بستر مرگ سے اپنے جانشین کے نام ذیل کی ہدایات جاری فرمائیں ـــــ

"میں اسے (اپنے جانشین کو) ان لوگوں (یعنی غیر مسلمانوں) کی نسبت جنھیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حفاظت ملی ہے اس امر کا پابند کرتا ہوں کہ ان سے کیے ہوئے معاہدے پر قائم رہے، ان کے دفاع کی خاطر لڑے اور ان پر ان کی بساط سے زیادہ بار نہ ڈالے۔"

صلاح الدین یروشلم اور مصر میں

ایک اور عظیم مسلمان فرماں روا ـــــ سلطان صلاح الدین ہے جو اپنی رواداری کے لیے مشہور تھا اور جس کے بارے میں عیسائی راہب بینڈکٹ آف پیٹر بروز بردست کلماتِ تحسین ادا کرنے پر مجبور ہوا۔ اس نے کہا کہ سلطان نے ذاتی کردار اور رویے سے عیسائی فوجیوں کو اسلام کی خوبیاں عملاً دکھائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان کے عمل سے چند عیسائی سردار اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کیا۔

۱۲۴۴ء میں جب انجام کار یروشلم مسلمانوں کی تحویل میں آیا تو بلاشبہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی آبادی نے نئے حکمرانوں کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے اطمینان اور خاموشی سے اسلامی اقتدار کو تسلیم کیا۔

سلطان صلاح الدین کے عہد میں (۱۱۶۹ تا ۱۱۹۳ء) مصر میں عیسائیوں کی حالت بہت اچھی تھی۔ ان پر عائد کیے ہوئے محصولات کم کیے گئے اور بعض بالکل معاف کر دیے گئے۔ سرکاری دفاتر معتمدوں، محاسبوں اور رجسٹراروں کے عہدوں پر عیسائیوں کا ہجوم ہو گیا۔ تقریباً ایک صدی

تک سلطان صلاح الدین کے جانشینوں کے عہدِ اقتدار میں ان سے رواداری برتی گئی اور ان پر لطف وکرم کیا گیا۔ عیسائیوں کو کبھی شکایت نہ ہوئی اور ہوئی بھی تو اپنے ہی پادریوں سے ان کی بدعنوانیوں اور بدکرداریوں کے باعث ہوئی۔ [1]

۷۔ عیسائیوں کی اپنے ہم مذہب فاتحین پر مسلمان فاتحین کو ترجیح مسلمانوں نے عیسائیوں سے جو رواداری برتی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی موقعوں پر عیسائیوں نے مسلمانوں کے زیرِ حکومت رہنے میں بڑی گرمجوشی دکھائی۔ بارھویں صدی میں یونانی کلیسا کے بطریق، مائیکل دی ایلڈر نے مسلمان فاتحین میں "انگشتِ ربانی" دیکھی۔ اسے یقین تھا کہ ہرقل اور رومنوں نے عیسائیوں پر جو ظلم ڈھائے ہیں ان کا انتقام لینے کی غرض سے خدا نے انھیں (مسلمان فاتحین کو) بھیجا ہے۔ ذیل کے حوالے میں بطریق کے الفاظ من وعن دیے گئے ہیں۔

"خدا ہمہ گیر طاقت کا مالک ہے اور فانی انسانوں کی سلطنتیں ادلتا بدلتا ہے۔ اس نے رومنوں کا ظلم وستم دیکھا جنھوں نے اپنے سارے دورِ حکومت میں وحشیانہ انداز سے ہماری خانقاہیں اور ہمارے گرجے تباہ کیے اور کامل بے رحمی سے ہمیں ہلاک وبرباد کیا۔ یہ دیکھ کر خدا جنوبی خطے سے اسماعیل علیہ السلام کے بیٹوں کو لے آیا تاکہ ہمیں رومنوں کے جور وتشدد سے نجات دلائیں۔

رومنوں کے ظلم، ان کی درندگی، ان کے غضب اور ہمارے خلاف ان کے وحشیانہ جذبے سے نجات اور پرامن زندگی دلانا کوئی معمولی سی سہولت نہ تھی۔" [2]

فاتحین کی حیثیت سے مسلمانوں کو اس موقع پر بھی ترجیح دی گئی جب اسلامی فوج وادیٔ اردن میں پہنچی اور ابوعبیدہ نے فحل میں پڑاؤ ڈالا۔ اسی آن وہاں کے عیسائی باشندوں نے عربوں کو مکتوب بھیجا جس میں یہ لکھا ــــــــ

۱۔ رینالٹ صفحہ ۳۸۸

۲۔ مائیکل دی ایلڈر، جلد دوم، صفحات ۴۱۲، ۴۱۳

"اے مسلمانو! ہم تمہیں بازنطینیوں پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں کیونکہ تم ہم سے بہتر مذہبی سلوک روا رکھتے ہو، ہم سے زیادہ رحم دلی سے پیش آتے ہو اور ہم سے ناانصافی نہیں کرتے —— تم ان سے کہیں بہتر طور پر حکومت کرتے ہو —— انھوں نے تو ہم سے ہمارے خدا اور ہمارے گھر بھی چھین لیے۔"[1]

پھر جب ہرقل (بازنطینی حکمران —— ۵۷۵ء، ۶۱۰ تا ۶۴۱) شہر ایمیسہ کے قریب آیا تو شہریوں نے دروازے بند کر لیے اور مسلمانوں کو اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ اپنے ہم مذہب یونانی حکمرانوں کی ناانصافی اور سختی پر مسلمانوں کی حکومت اور عدل پرستی کو ترجیح دیتے ہیں۔[2]

مسلمانوں نے بازنطینی سلطنت کے جو صوبے فتح کیے ان میں عیسائیوں سے کامل رواداری برتی۔ قبل ازیں کسی نے ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔ یہ رواداری جو اسلامی عہدِ حکومت میں اس قدر نمایاں رہی اس کی انتہا ان شرائط سے معلوم ہوتی ہے جو مفتوح شہروں کو پیش کی گئیں۔ یہاں پھر حضرت عمرؓ رواداری کی شاندار مثال قائم کرتے ہیں۔ جب شہر یروشلم ان کی تحویل میں آیا تو انھوں نے بدیں شرائط بطریقِ اعظم سے معاہدہ کیا ——

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! عمر —— اللہ کا بندہ اور مومنوں کا سپہ سالار اہلِ یروشلم کو امان دیتا ہے۔ بیمار اور تندرست سب کو جان و مال، ان کی عبادت گاہوں اور صلیبوں اور جو کچھ ان کے مذہب سے متعلق ہے اس کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ ان کے گرجے رہائشی مکانوں میں تبدیل کیے جائیں گے نہ پامال کیے جائیں گے۔ انھیں کسی طرح گھٹایا نہیں جائے گا۔ ان کی صلیبوں، ان کی املاک کو تباہ نہیں کیا جائے گا۔ مذہب کے معاملے میں ان پر کسی قسم کی سختی نہیں کی جائے گی۔ ان میں سے کسی کو ضرر نہیں پہنچایا جائے گا۔"[3]

۱۔ عضدی صفحہ ۲۷۲

۲۔ بلاذری صفحہ ۱۳۷

۳۔ طبری صفحہ ۲۴۰۵

عثمانی سلاطین کی رواداری فرانسیسی مورخ اور شاعر (۱۷۹۰تا۱۸۶۹ء) لامارتین اپنی آٹھ جلدوں والی "عثمانیوں کی تاریخ" میں بتاتا ہے کہ ترک سلطان، محمد ثانی نے قسطنطنیہ میں بلاتاخیر مذہبی رواداری کا اصول نافذ کر کے ایک سچے مسلمان سپاہی کی مثال قائم کی۔ یہ واقعہ شہر میں فاتحانہ داخلے کے وقت رونما ہوا ــــــ

"سلطان سینٹ صوفیہ کے گرجے کے سامنے اپنے گھوڑے سے اترا، اس نے اپنا خنجر نکالا اور اس سپاہی کا سر قلم کر دیا جو مقدس قربان گاہوں کو توڑنے پھوڑنے میں لگا تھا۔"

آگے چل کر لامارتین بتاتا ہے کہ کس طرح سلطان اس بات پر تلا تھا کہ اپنی فتح کو رسوا نہ ہونے دے ــــــ

"ترک سلطان نے کسی چیز میں ردوبدل کرنے سے انکار کیا۔ عین آغاز ہی سے ترکوں کی مذہبی رواداری عیاں ہو گئی تھی۔ سلطان نے عیسائیوں کے پاس ان کے گرجے رہنے دیے اور اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی اجازت دی۔ اس نے یونانی بطریق کو اپنی مداخلت سے محفوظ رکھا۔"

محمد ثانی کے کاموں میں سے پہلا کام یہ تھا کہ اس نے یونانی کلیسا اور یونانی عیسائیوں کے جان و مال کا محافظ ہونے کا اعلان کیا۔ ترکیہ ہی وہ ملک تھا جہاں اندلسی یہودی پندرھویں صدی کے آخر میں قتلِ عام سے بچنے کے لیے پہنچ گئے۔ سترھویں صدی میں جب یورپ میں مذہب کے نام پر ہلاکت آفرینی کا دور دورہ تھا تو مذہبی جنون کا شکار ہونے والے ترکیہ کو جائے پناہ خیال کرتے۔ کیتھولک پولوں کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے انطاکیہ کا بطریق میکاریوس یوں رقمطراز ہے ــــــ

"خدا ترکوں کی سلطنت قیامت تک برقرار رکھے! وہ محصول لے لیتے ہیں اور پھر کسی طرح اپنی رعایا کے حسابات میں دخل نہیں دیتے ــــــ خواہ ان کی رعایا میں عیسائی ہوتے، یہودی یا سیمیری۔ رہے یہ ملعون پول، یہ اپنے عیسائی بھائیوں سے محصول پر محصول لے کر بھی مطمئن نہیں ہوتے اور مذہبی اعتقادات کی بنا پر ان پر ظلم توڑتے ہیں۔" [1]

---

[1] MACARIOUS جلد اول، صفحات [redacted]

(۷)

اندلس میں مسلمانوں کی رواداری اندلس میں مسلمان اس قدر روادار اور بُردبار تھے کہ ایک متعصب عیسائی آرک بشپ نے ان کی رواداری کو ان کے اخراج کا ایک حقیقی سبب بتایا۔ ۱۶۰۲ء میں ''مسلمان موروں کی آزاد خیالیوں اور غداریوں'' کے بارے میں لکھتے ہوئے اس نے ان الفاظ میں فلپ ثالث سے ان کے اخراج کی سفارش کی ــــــــ

''یہ (اندلسی مسلمان) تمام مذہبی امور میں آزادیٔ شعور سے زیادہ کسی شے کی قدر نہیں کرتے۔ ترک اور تمام دوسرے مسلمان جو ان کی رعایا ہیں ایسی ہی آزادی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔''

ایک اندلسی مسلمان نے جسے سب سے آخر میں نکالا گیا کیتھولک مذہبی عدالت کے اس غیر انسانی ظلم وتشدد پر زبردست احتجاج کیا جو مسلمانوں ہی پر نہیں بلکہ عیسائی پروٹسٹنٹوں پر بھی روا رکھا۔ اپنے دین کا دفاع کرتے ہوئے اس نے ۱۶۱۰ء میں لکھا ــــــــ

''کیا ہمارے فاتح مسلمان بزرگوں نے اندلس میں کبھی عیسائیت کو مٹانے کی کوشش کی جبکہ یہ بات ان کے اختیار میں تھی؟ کیا مسلمان حکمرانوں نے اس زمانے میں تمہارے آباؤ اجداد کو رسم و رواج اور مذہب کی آزادی عطا نہیں کی جب وہ ان کی رعایا تھے؟ کیا یہ ہمارے پاک نبی ﷺ کا قطعی حکم نہیں کہ مسلمان جو جگہ فتح کریں اسے اپنی پرانی وضع پر قائم رہنے دیں اور محفوظ رکھیں؟ اگر جبری تبدیلی مذہب کی چند مثالیں مل جائیں تو اتنی کم اور نایاب ہیں کہ ذکر کے قابل بھی نہیں۔ یہ ان لوگوں کی حرکت ہے جنہیں اللہ اور رسول ﷺ کا خوف نہ تھا اور جنھوں نے براہِ راست اسلام کے مقدس قوانین وضوابط کی خلاف ورزی کی۔ کوئی فرد اسلام کی بے حرمتی کیے بغیر ایسا کر سکتا ہے نہ وہ اسلام کی قابلِ قدر خوبی کا اہل ہو سکتا ہے۔ مختلف انداز سے مذہب کی پیروی کرنے کی بنا پر تم ہمارے یہاں کسی ایسی خونخوار عدالت کا سراغ نہیں دے سکتے جو کسی طور تمہاری نفرت انگیز مذہبی عدالت کی گرد کو پہنچ سکے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے بازو ان سب کے خیر مقدم کو کھلے رہتے ہیں جو رضا کارانہ طور پر ہمارے مذہب کی آغوش میں آنے پر مائل ہوں لیکن

ہمارا مقدس قرآن ہمیں لوگوں کے شعور پر ستم ڈھانے کی اجازت نہیں دیتا۔ نومسلموں کو تمام حقوق اور مراعات سے نوازا جاتا ہے۔ جونہی وہ توحید الٰہی اور دینِ محمدیؐ قبول کر لیتے ہیں بلا امتیاز اور بلا خصوصیت ہم ایسے ہو جاتے ہیں، ہماری بیٹیوں سے بیاہ کر لیتے ہیں۔ اعتماد، وقار اور منفعت کے منصوبوں پر مامور ہو جاتے ہیں۔" [1]

فرانسیسی مورخ پروفیسر رینان رقمطراز ہے کہ ــــــــ

"جب مسلمانوں نے اندلس پر قبضہ کیا تو رواداری کی عملاً ایسی مثال قائم کی کہ کبھی اس کی نظیر نہ ملی۔ وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب عام طور پر مسجدوں میں مدرسے اور یونیورسٹیاں قائم کی گئی تھیں تو ہر مذہب وملت کے لڑکے ان میں داخل کر لیے جاتے تھے۔ دسویں صدی تک دنیا کے اس ممتاز گوشے (یعنی مسلم اسپین) میں سائنس اور ادب کا مذاق پیدا ہو چکا تھا۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ عہدِ حاضرہ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ عیسائی، یہودی اور مسلمان ایک ہی زبان بولتے، ایک جیسے گیت گاتے اور ایک جیسے ہی ادبی اور سائنسی مطالعوں میں شرکت کرتے۔ وہ تمام دیواریں منہدم کر دی گئیں جو لوگوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کرتیں۔ سب ایک مشترکہ تہذیب کی نشوونما کے لیے ہم آہنگی سے کام کرتے۔"

فتحِ ہسپانیہ کا حال بیان کرتے ہوئے ڈوزی لکھتا ہے ــــــــ

"مسلمانوں کے زیرِ اقتدار عیسائیوں کی حالت چنداں بے اطمینانی کا موجب نہ تھی ...... عرب بہت زیادہ روادار تھے۔ انھوں نے مذہبی معاملوں میں کسی کو ہراساں نہیں کیا۔ عیسائی اس ضمن میں عربوں کے ممنون ہیں۔ وہ مسلمانوں کی رواداری اور ان کے عدل وانصاف کی تعریف کرتے اور ان کی حکومت کو جرمنوں اور فرینکوں [2] کی حکومت پر ترجیح دیتے۔"

---

[1] بحوالہ مورگن جلد دوم صفحات ۲۹۷ تا ۲۹۸

[2] وفاقی جرمنی کے وہ قبائل جنھوں نے فرینکی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ بعد ازاں نویں صدی میں یہی فرانس، اٹلی اور جرمنی کی الگ الگ سلطنتوں میں بٹ گئی۔

Main. H

جبری مذہبی تبدیلی اسلام میں گوارا نہیں ذمہ دار مسلمانوں نے جبراً اسلام قبول کرنے کو کبھی گوارا نہیں کیا۔ اگرچہ جنونیوں نے وقتاً فوقتاً اسلام کو غلط سمجھا (اور لوگوں کو جبراً مسلمان کیا) لیکن ایسے لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنھیں اپنا پرانا مذہب دوبارہ اختیار کرنے کی اجازت دی گئی۔

ایک یورپی مورخ لکھتا ہے ———

"جب سخت گیر الموحدین کے عہدِ حکومت میں موسیٰ میمونیدیز نے جھوٹ موٹ مذہب تبدیل کرنے پر آمادگی ظاہر کی، پھر بھاگ کر مصر چلا گیا اور ایک بار اس نے خود کو یہودی ظاہر کیا تو اندلس کے ایک مسلمان فقیہ نے اسے اسلام سے خارج کیا اور مرتد ہونے کی بناء پر اس کے قتل کا دعویٰ کیا۔ اس پر سلطان صلاح الدین ایوبی کے وزیراعظم اور ایک نامور ترین جج ——— القاضی الفاضل عبدالرحیم بن علی نے اعلان کیا!" ایسے آدمی کو مسلمان نہیں سمجھا جاسکتا جس نے مجبور ہو کر اسلام قبول کیا ہو۔"

ابتدا میں کسی حاجی نے آرمینیا کے ایک سوداگر کو بدیں وجہ قتل کر دیا کہ اس نے مسلمان ہونے سے انکار کیا تھا۔ جب عاملِ شہر نے سنا تو کہا ———

"کیا یہی وہ طریقہ ہے جس سے اسلام کا مذہب پھیلا"!

حاجی کو فی الفور حراست میں لیا گیا، قتل کیا گیا اور اس کی لاش کتوں کو ڈال دی گئی۔

عہدِ غازان (۱۲۹۵ تا ۱۳۰۶) میں چند بدھ راہبوں نے جھوٹ موٹ اسلام قبول کرنے کا ادّعا کیا۔ معلوم ہونے پر انہیں پرانا مذہب اختیار کرنے اور ضرر رسانی کے بغیر تبت لوٹ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ سیاح ٹیورنیئرؔ اصفہان کے چند مرتد یہودیوں سے بھی ایسے ہی فیاضانہ سلوک کا ذکر کرتا ہے۔ جنھوں نے شاہ عباس دوم (۱۶۴۲ تا ۱۶۶۷) کی چال میں آکر خود کو مسلمان ظاہر کیا تھا۔ جب شاہ نے محسوس کیا کہ انھوں نے ڈر کے مارے مذہب تبدیل کیا ہے نہ کہ ایمان کی خاطر تو انھیں سابقہ عقائد کی پیروی کرنے اور اصفہان لوٹ جانے کی اجازت دے دی۔

عیسائی مذہب میں دخل دینا جرم تھا جبراً مذہب تبدیل کروانے کے ضمن ہی میں موت کی سزا مقرر نہ تھی بلکہ متعدد حکمرانوں کے عہدِ اقتدار میں مسیحی عبادت گزاروں کے حقوق میں مداخلت

کرنے پر بھی یہی سزا دی جاتی۔ اس کی یادگار مثال ازبک خان کے فرمان سے ملتی ہے۔

ازبک خانِ اعظم جو ۱۳۱۳ سے ۱۳۴۰ ش تک "لشکرِ زریں" کا قائد رہا اسلام کا پرجوش حامی تھا۔ اس نے پورے وسطِ ایشیا میں اسلام پھیلانے کی کوشش کی لیکن بہر حال اسلام کے بنیادی اصول رواداری پر قائم رہا۔ ۱۳۱۳ میں اس نے عیسائیوں کے لیے جو ضابطہ نافذ کیا وہ رواداری کے باب میں ایک بہترین اسلامی تاریخی دستاویز ہے۔

"رفیع ترین اللہ کی مشیت، قوت، عظمت اور رحمت کے نام پر ازبک اپنے تمام چھوٹے اور بڑے شہزادوں کے نام فرمان جاری کرتا ہے کہ کوئی شخص ایسے گرجے کی بے حرمتی نہ کرے جس کا سربراہ پطرس ہو یا اس کے خادم یا پادری ہوں! کوئی شخص ان کا سامان چھینے نہ آدمیوں کو گرفتار کرے! کوئی شخص امورِ کلیسا میں دخل نہ دے کیونکہ یہ الٰہیاتی ہوتے ہیں۔ جو شخص ان میں دخل دے گا اور ہماری حکم عدولی کرے گا وہ اللہ کے نزدیک گنہگار ہو گا اور اس کے غضب کا شکار ہو گا۔ ہم سے موت کی سزا پائے گا۔"[1]

مصر کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی رواداری ہر وقت اور ہر قسم کے حالات میں مسلمانوں پر فرض ہے کہ انسانی رشتوں میں ہم آہنگی برقرار رکھنے کی سعی کریں۔ مصر کی فتح دلچسپ مگر انتہائی انداز کی مثال پیش کرتی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ایک حکمران شکست خوردہ لوگوں کو ان کے حقوق کی ضمانت دینے کے لیے کہاں تک جانے کو تیار تھا۔

ادھر عمرو ابنِ العاص کو مصر کا عامل مقرر کیا گیا اور ادھر عیسائی آرک بشپ کی قیادت میں ایک وفد ملنے آیا۔ غالباً کسی مسلمان نے مسیح کا ایک مرمریں مجسمہ مسخ کیا تھا اور اس کی ناک کاٹ دی تھی۔ عمرو نے ازراہِ تلطف وفد کا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ اس واقعے سے انہیں صدمہ پہنچا ہے اور وہ بخوشی نئے مجسمے کی قیمت ادا کریں گے۔ بہر حال یہ تجویز آرک بشپ نے منظور نہ کی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ عیسائیوں کو مطمئن کرنے کے لیے انہیں حضرت محمد (ﷺ) کا بت بنانے اور اس کی ناک کاٹنے کی اجازت دی جائے۔ اس تجویز پر عمرو کا دل دہل گیا، تاہم انہوں نے غصے پر قابو

---

[1] بحوالہ KARAMZIN جلد اول، صفحات ۲۲۳۔۲۲۲

پایا۔ خاموشی سے لیکن انتہائی رنجیدہ ہو کر کہا ـــــــ

"تم ہمارے پاک نبی کا بت بنانے کی تجویز پیش کرتے ہو حالانکہ یہی وہ آدمی ہے جس نے زبردست اور مسلسل جدوجہد سے بت پرستی ختم کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی اور اب تم ہماری آنکھوں کے سامنے ناک کاٹ کر اس کی بے حرمتی کرنا چاہتے ہو۔ ہم اپنی تمام املاک اپنی جانیں اور اپنے بچے تک قربان کردیں گے قبل ازیں کہ ہم ایسی کافرانہ حرکت دیکھیں۔ میں نے چونکہ تمہاری جانیں، املاک اور تمہارے مذہب کی حفاظت اپنے ذمے لی ہے اس لیے میں اس بات پر آمادہ ہوں کہ تم ہم میں سے جس کی چاہو ناک کاٹ لو اور لے جاؤ!"

اس پر بشپ مان گیا۔ اگلے دن ہزاروں کی تعداد میں عیسائی اور مسلمان یہ دیکھنے میدان میں جمع ہوئے کہ عیسائی کس طرح انتقام لیتے ہیں۔ عمروؓ بن العاص نے اجتماع عظیم سے خطاب کیا اور اس افسوس ناک ترین واقعہ کا پس منظر بیان کیا۔ پھر اس نے آرک بشپ کو اپنے پہلو میں بلایا اور پھر سنجیدگی سے اعلان کیا ـــــــ

"تم عیسائیوں کے سربراہ ہو اور میں مسلمانوں کا سربراہ ہوں۔ ہم نے تمہیں زیر کیا، اب اس ملک پر حکومت کرنا میرا مقدس فرض ہے۔ تمہارے مذہب کی جو توہین ہوئی ہے میں لازماً اس کی سزا قبول کروں گا کیونکہ یہ حرکت میرے نظم و نسق کی خامی کی علامت ہے۔ یہ لو تلوار اور میری ناک اُڑا دو!"

یہ کہہ کر عمرو بن العاص نے بشپ کو تلوار پکڑا دی۔

واقعات نے ایسا حیران کن موڑ لیا کہ تماشائی دنگ رہ گئے اور گُنگ ہو گئے۔ پریشان ہوئے کہ اب کیا ہوگا لیکن جونہی بشپ حاکم وقت کی ناک کاٹنے لگا ایک مسلمان سپاہی نے جھٹ اقرار جرم کرلیا۔ اس نے چلا کر کہا ـــــــ

"میں نے بت کی ناک کاٹی تھی۔ میں مجرم ہوں۔ لو، یہ ہے میری ناک! لازماً سزا مجھے ملنی چاہیئے۔ عامل بے گناہ ہے۔ میری ناک کاٹ لو!"

وہ لپک کر آگے آیا اور اس نے حیران و پریشان اجتماع کے روبرو بشپ سے ناک کاٹنے کو کہا۔ یہ ساری کاروائی دیکھ کر بشپ اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے تلوار پھینک دی اور چیخ کر کہا ـــــــ

"مبارک، ہزار مبارک ہو اس سپاہی کو، عامل کو اور سب سے بڑھ کر ذی شان پیغمبر کو جس کے مثالی مقصد اور جس کی تعلیمات نے ان سپاہیوں اور اس عامل ایسے انسان پیدا کیے۔ بت کی ناک کا شا برا تھا لیکن اس سپاہی اور عامل ایسے ذی وقار انسانوں کے چہرے بگاڑنا حد سے سوا بدکرداری ہے۔"

۱۳ گرجوں اور مندروں کے باب میں مسلمانوں کی رواداری

آدم منیر لکھتا ہے ـــــــ

"عام اصول کی رو سے اسلامی حکومت نے کبھی غیر مسلم رعایا کی عبادت میں دخل نہیں دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے ہنگامہ خیز عیسائی تہواروں اور ریتوں رسموں کو بنظرِ استحسان دیکھا...... ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ مسلمانوں کے فاتح لشکر نے کلیساؤں، اسرائیلی عبادت خانوں اور مندروں کو نقصان نہ پہنچایا اور جوں کا توں برقرار رہنے دیا۔ پھر جن اضلاع میں صرف ایک ہی عبادت گاہ تھی وہاں عیسائیوں اور یہودیوں کو اکثر اسی میں اپنی اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت دی۔ یہاں بھی نبی اکرم ﷺ نے نظیر قائم کی۔ جب نجران سے عیسائی وفد آیا تو آنحضرت ﷺ نے اسے مدینہ کی مسجد میں عبادت کی اجازت دی۔"

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے نبی اکرم ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے عیسائیوں کو دمشق کا وہ کلیسا لوٹا دیا جو ان سے لے لیا گیا تھا۔

"ایک پکا اور سچا مسلمان ہونے کے باعث وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں ـــــ عیسائیوں، یہودیوں اور آتش پرستوں پر مہربان تھا۔ انھیں اپنے کنیسہ، [۱] کلیسا اور معبد قائم رکھنے کی اجازت دی۔ دمشق میں الولید نے یوحنا بپتسمہ کار کے کلیسا کا حجرہ اپنی تحویل میں لے لیا اور مسجدِ بنوامیہ کی جائے تعمیر میں شامل کر لیا۔ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو عیسائیوں نے کلیسا چھن جانے کی شکایت کی۔ انہوں نے حکم دیا کہ مسجد کے لیے کلیسا کا جو حصہ لیا گیا ہے وہ اسی کو لوٹا دیا جائے۔" [۲]

ہسپانیہ کے فرڈیننڈ اور ازابیلا نے طلیطلہ کی مسجد سے جو سلوک کیا یہ مثال اس سے نہایت

---

[۱] یہودیوں کا عبادت خانہ

[۲] بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

مختلف رجحان کا اظہار کرتی ہے۔ مسلمانوں کے زیر حکومت یہودیوں اور عیسائیوں کو ہر دوسرے دن مسجد میں عبادت کی اجازت دی گئی تھی لیکن جونہی ہسپانوی عیسائیوں کو فتح نصیب ہوئی مسجد کو کلیسا میں تبدیل کر لیا گیا اور دیگر مذاہب کے پیرو کاروں پر اس کے دروازے بند کر دیے گئے[1]

حضرت عمرؓ ہی اس خراج تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اہلِ کتاب نصرانیوں سے جو رواداری برتی اس سے کہیں زیادہ رواداری دمشق کے آتش پرستوں سے برتی جو زرتشت کے مشرکانہ عقیدے پر کاربند تھے، نیز خیر و شر کی دو طاقتوں ـــــ یزدان و اہرمن پر ایمان رکھتے۔ مسلمان اس سے متنفر تھے اور پھر وہ سحر و عملیات کے بھی قائل تھے۔ بہر حال مورخ ایم۔ این رائے اس امر کا اشارہ کرتا ہے کہ ''زرتشتی عرب فاتحوں کی رواداری سے محروم نہ رہے۔ تیسری صدی ہجری میں بھی پرانے آتشکدے شان و شوکت سے معمولی درجے کی مسجدوں کے پہلو میں کھڑے دکھائی دیتے۔''

المعتصم (۸۳۳ تا ۸۴۲ ش) کے عہد سے ایک خاص مثال لی جا سکتی ہے۔ ایک موقع پر ایک امام اور مؤذن نے مل کر آتشکدہ منہدم کر دیا اور اس کی جگہ مسجد تعمیر کر لی، شکایت کی گئی تو خلیفہ نے اس کے جواب میں آتشکدہ ڈھانے پر امام اور موذن کو کوڑے لگانے کا حکم دیا۔[2]

ہندوؤں کے مندروں اور ان کی ریتوں کے باب میں رواداری مسلمانوں کی فتح کے زمانے میں رواداری کا جذبہ پیدا رہا۔ وان کریمر لکھتا ہے ـــــ

''ہندوؤں کو مندر تعمیر کرنے، مسلمانوں سے ملنے جلنے اور بے خوف و خطر رہنے اور ہر طریقے سے اپنی بہتری کے لیے کوشاں ہونے کی اجازت تھی، عربوں نے سندھ میں ہندوؤں سے جس رواداری کا سلوک

---

[1] اس گئے گزرے زمانے میں بھی مسلمان رواداری کے معاملے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ اپنے زریں ماضی اور گزشتہ دور اقتدار کی طرح آج بھی دوسروں کی عبادت گاہوں اور غیر مسلم اقلیت کا احترام کرتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں اس کا واضح ثبوت ملتا ہے جہاں ان سکھوں کے گوردوارے اور استھان بہ حفاظت موجود ہیں جو تقسیم کے بعد بھارت چلے گئے۔ انہیں ہر سال یاترا کے لیے پاکستان آنے اور کامل آزادی سے اپنے تہوار منانے کی اجازت ہے، جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں انتہائی بے دردی سے اپنے علاقوں میں نہتے مسلمان مردوں اور عورتوں کا قتلِ عام کیا۔ ایسے ہولناک واقعات ہوئے کہ ان کے ذکر سے دل تھرا تا ہے۔ پھر ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارتی سینا نے سفاکی کا بے نظیر مظاہرہ کیا۔ ۶ ستمبر کو بھارت نے پانچ گنا فوج سے الٹی میٹم دیے بغیر پاکستان پر حملہ کیا۔ بھارتی سینا نے رات کے اندھیرے میں بین الاقوامی سرحد عبور کی، نہتے مسلمانوں کو گولی کا نشانہ بنایا، عورتوں کی آبروریزی کی، مسجد کو ضرر پہنچایا لیکن جب پاکستانی فوج نے جوابی کاروائی کی، بھارتی سینا کو جگہ جگہ پسپا کیا، راجستھان اور پنجاب (کھیم کرن) کے علاقے فتح کر لیے تو کسی مندر یا گوردوارے کی بے حرمتی یا کسی ہندو یا سکھ عورت کی آبروریزی کا ایک واقعہ رونما نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں جب امرتسر کے فوجی ٹھکانوں پر فضائی حملہ ناگزیر ہوا تو پاک فضائیہ کے ہوا بازوں کو ہدایت کی گئی کہ سخت احتیاط برتیں اور کسی حالت میں سکھوں کی کسی عبادت گاہ کو نشانہ نہ بنائیں۔ پاکستانی ہوا بازوں کی دیانتداری اور ان کا کمال ہے کہ انہوں نے صرف فوجی ٹھکانے برباد کیے۔ کسی قوم کی عبادت گاہ کو بھول کر گزند نہیں پہنچایا۔ (مترجم)

[2] بحوالہ CHOWLSOHN جلد اول صفحہ ۲۸۷۔

کیا اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔"

وان کریمر یہ بھی کہتا ہے ———

"برہمن روایات جس عزت و احترام کے مستحق تھے انھیں اس سے نوازا گیا۔ شنکراچاریہ اور اس کے چیلے مثلاً مدھون تند اور نمبارک ایسے ہندو مبلغوں کو ہمیشہ تبلیغ کرنے کی آزادی حاصل رہی [1]۔"

ہندوؤں سے مسلمانوں کا یہ کریمانہ سلوک کئی سال تک رہا اور اس حد تک رہا کہ ہندو اکثر اپنے ہم مذہبوں کے خلاف مسلمان فاتحین کی جانب سے میدان جنگ میں لڑے۔ علاؤالدین خلجی کے عہد میں ہندو اپنی خدمات کے صلے میں بڑے بڑے عہدوں پر پہنچے۔ شیر شاہ کے زمانے میں شفاخانوں اور سراؤں میں ہندوؤں کی سہولت کے لیے خاص انتظامات کیے گئے۔

تمام مغل حکمران ہندوؤں سے بڑی فیاضی سے پیش آئے۔ ان کے مندروں کی حفاظت کی گئی۔ پروہتوں کو سنکھ بجانے اور اپنے بتوں کا جلوس نکالنے کی اجازت دی گئی۔ بادشاہوں کے حرم کی ہندو بیگمات کو محلات میں اپنے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی کھلی چھٹی دی گئی تھی۔

عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب بڑا متعصب فرماں روا تھا جس نے ہندوؤں پر ظلم ڈھائے، ان کے مندر برباد کیے اور ان پر جزیہ [2] لگایا لیکن جدید تحقیق ان قصوں کی براہِ راست تردید کرتی ہے۔ وہ خط جو اس نے اپنے بیٹوں اور دوسرے مسلمانوں کو لکھے اور تانبے کی وہ تختیاں جو برآمد ہوئی ہیں یہ بات ظاہر کرتی ہیں کہ اس نے تو خلاف ازیں ہندوؤں کے مندروں کی دیکھ بھال کے لیے مستقل جاگیریں اور رقوم دیں۔ مزید برآں اس نے ان پر کوئی ناواجب محصول عائد نہیں کیا۔

ہر دور میں رواداری ہر دور میں اسلامی رواداری کی روح کارفرما رہی۔ دشتِ سینا میں سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ کے زائرین اکثر مسلمانوں کی رواداری کی طویل تاریخ سے متاثر ہوئے ہیں۔ دنیا کے اس چھوٹے سے گوشے میں بھی رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔ مصر کی فاطمی خلافت کے دور

---

[1] بھارت کے ہندو جس وحشیانہ طریقے سے مسلمان حکمرانوں کے کریمانہ سلوک کا جواب دے رہے ہیں اسے تاریخ عالم خونیں الفاظ میں لکھنے پر مجبور ہوگی۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک بھارت میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی ہزاروں منظم وارداتیں ہو چکی ہیں۔ نیم فوجی تنظیم جن سنگھ ہر دم منصوبے تیار کرتی اور مسلم کش فسادات برپا کرتی رہتی ہے۔ ہند سرکار اس ناپاک فعل میں ہمیشہ جن سنگھ کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ (مترجم)

[2] غیر مسلمان کے جان و مال کی حفاظت کا ٹیکس۔

میں ۱۰۶۱ء میں مسجد بنائی گئی۔ یہ مسجد مسیحی خانقاہ سے اس قدر قریب ہے کہ بالکل متصل ہوگئی ہے۔ ساڑھے آٹھ سو سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ خانقاہ کی گھنٹیوں کا شور مسجد میں آرہا ہے لیکن مسلمانوں کی رواداری میں ایک بار خلل نہیں پڑا۔ اسلامی رواداری کا یہ موثر ثبوت ہے۔

رواداری اسلام کے خمیر میں ہے جذبہ رواداری کے اس مسلسل مظاہرے کی تشریح کرتے ہوئے ایم۔ این۔ رائے نے بتایا ہے کہ یہ اسلام کا موروثی، الگ نہ ہونے والا عنصر ہے۔ ان کے الفاظ میں ــــــ

> ''اسلام کا یہ بنیادی عقیدہ کہ خدا ایک ہے بنفسہ رواداری کو برقرار رکھتا ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ ساری دنیا اپنی تمام خرابیوں اور بدصورتیوں سمیت نیز ساری نسلِ انسانی اپنی لغزشوں اور حماقتوں سمیت اسی ایک خدا کی تخلیق ہے تو پھر مومن اپنے رفیع الشان عقیدے کی رو سے مسخ شدہ صورتوں پر اظہار افسوس کرے گا، خرافات اور کج روی پر ہنسے گا لیکن اس عقیدے کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ انھیں کسی خدائے شر کا کارنامہ یا اس کی عبادت کا نتیجہ سمجھ کر ان کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کرے گا۔ جو لوگ مختلف انداز سے عبادت کرتے ہیں اس کے نزدیک اس کے غلط کار اور گمراہ بھائی ہیں لیکن بہر حال ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ انہیں راہِ راست پر لانا پڑتا ہے یا پھر ان سے رواداری برتنی پڑتی ہے تا آنکہ وہ تائب ہونے کے لیے آمادہ ہوجائیں۔''

اس تجزیے کی وضاحت کے لیے قرآن کی آیات کریمہ بآسانی مل جاتی ہیں۔ مثلاً ــــــ

(۱) ''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا۔''

پوری آیت کریمہ یہ ہے ــــــ

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اسی میں سے اس کا ساتھی پیدا کیا اور پھر اس جوڑے سے بہ کثرت مرد اور عورتیں پیدا ہوئیں اور اللہ سے ڈرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور خصوصیت سے رشتے اور قرابت داری کا احترام کرو۔ بلاشبہ اللہ تمہیں دیکھتا ہے۔'' (سورۃ ۴، آیتِ کریمہ ۱)

(۲) ”اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے قبیلوں کی شکل دی تا کہ تم ایک دوسرے کو جان پہچان لو!“ (سورۃ ۴۹، آیت کریمہ ۱۳)

(۳) ”ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے قانون (شرع) اور راہِ عمل وضع کر دی ہے۔ اللہ چاہتا تو تمھیں ایک امت بنا دیتا۔“ (سورۃ ۵، آیت کریمہ ۴۸)

(۴) ”ہم نے ہر امت کے لیے عبادت کے طریقے بنا دیے ہیں جن پر وہ عمل کرتی ہے۔“ (سورۃ ۲۲، آیت کریمہ ۶۷)

(۵) ”بے شک جو مومن ہیں ان میں سے اور یہودیوں اور نصرانیوں اور صابیوں میں سے جو بھی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے اور نیک عمل کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ انہیں کسی قسم کا ڈر ہوگا نہ غم۔“ (سورۃ ۲، آیت کریمہ ۶۲)

(۶) ”اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ سب لوگ جو زمین پر رہتے ہیں ایک ساتھ ایمان لے آتے۔ کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرو گے؟“

پوری آیت کریمہ یہ ہے ———

”اور ہم نے اتاری تمھاری طرف یہ سچی کتاب جو اس سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر محافظ ہے۔ پس ان میں اللہ نے جو نازل کیا اس کے مطابق حکم دیجیے اور آپ کے پاس حق کی جو بات پہنچی اسے چھوڑ کر یہودیوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے قانون (شرع) اور راہِ عمل وضع کر دی ہے۔ اللہ چاہتا تو تمھیں ایک اُمت بنا دیتا۔ مگر اسے یہ منظور ہے کہ جو کچھ تمھیں دیا ہے اس میں تمھیں آزمائے تو نیکیوں میں جلدی کرو۔ تم سب کو اللہ کی طرف جانا ہے۔ پھر وہ تمھیں بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔“

ان آیاتِ کریمہ سے واضح ہے کہ کتنے ہی ایسے لوگ ہوں گے جو مختلف مذہبوں،

عقیدوں، سرگرمیوں، رسموں، ریتوں اور رواجوں کے پابند ہوں گے۔ انھیں مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو رہنے کی اجازت دینی پڑے گی۔ اسلام تمام حقیقی پیغمبروں کے لائے ہوئے دین کی سچائی تسلیم کرتا ہے اور ان میں امتیاز روا نہیں رکھتا۔

تمام مخلوقِ انسانی کی یگانگت کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے پوری آیت کریمہ یہ ہے ــــــ

''پس اللہ نے پیغمبروں کو اچھی خبر دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا۔''

اور اس سے بھی زیادہ وضاحت سے یہ فرمایا ــــــ

''کہو اے مسلمانو! ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ــــــ اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور ان کی آل پر نازل ہو ــــــ اور اس پر جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور ان نبیوںؑ کو دیا گیا جو اپنے رب کی طرف سے آئے۔ ہم ان میں سے کسی میں امتیاز نہیں کرتے اور ہم اسے (اپنے رب کو) تسلیم کرتے ہیں۔'' (سورۃ ۲، آیت کریمہ ۱۳۶)

اہلِ کتاب سے قرآن یوں مخاطب ہے ــــــ

''اے اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ)! ہم اور تم ایک مساویانہ انداز کی مفاہمت کر لیں کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہیں کریں گے اور تم اللہ کے سوا کسی سے واسطہ نہ رکھو گے اور ہم میں سے کوئی بھی اللہ کے سوا کسی کا اپنا رب نہ بنائے گا۔''

اور پھر دوبارہ یہودیوں سے کہا ــــــ

''وہ (یہودی) جو مسلمانوں کے مقصد کو مشترکہ مقصد بنا لیں اور ان کی جانب سے لڑیں وہ مسلمانوں سے مل کر ایک قوم ہو جائیں گے اور وہ ہماری مدد سے بہرہ ور ہوں گے اور ظلم و ستم اور پریشانی سے محفوظ کیے جائیں گے۔''

قرآن پاک میں مسلمانوں کو کلیساؤں اور دوسری عبادت گاہوں کو خراب کرنے سے بالخصوص منع کیا گیا ہے ــــــ

''انھیں (دیوی دیوتاؤں کو) بُرا بھلا نہ کہو مبادا وہ بوجہِ نفرت اللہ کو لاعلمی میں بُرا بھلا کہہ ڈالیں۔ پس ہم نے ہر اُمت کے عمل کو اس کے لیے

حسین بنا دیا ہے۔ پس انھیں اپنے رب کے پاس لوٹ جانا پڑے گا اور وہ انہیں بتائے گا کہ وہ کیا کرتے رہے۔"

قرآن میں یہ بھی کہا گیا ہے ——

"اے محمد! اگر کوئی تیری پناہ میں آنے کا طلبگار ہو تو اسے پناہ دے تا کہ وہ اللہ کا کلام سن سکے اور اس کے بعد اسے اس کی حفاظت کی جگہ پر پہنچا دے۔"

اس جذبۂ رواداری کو مختصر مگر مکمل شکل میں قرآن کے ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے ——

"کہہ کہ یہ رب کو جانب سے آئی ہوئی صداقت ہے جو چاہے اس پر ایمان لائے، جو نہ چاہے، ایمان نہ لائے"۔

برضا و رغبت قبولِ اسلام اس باب میں جو حوالے دیے گئے ہیں ان سے عیاں ہوا ہے کہ بزورِ شمشیر اسلام قبول کروانا اسلام کی سچی اسپرٹ کے عین خلاف ہے۔ شاذ ہی حکم عدولی کی گئی ہو۔ اگر کبھی مسلمانوں نے جبر سے کام لیا تو انہیں سزا دی گئی۔ اب ہم پر واجب ہے کہ قبولِ اسلام کے ان متعدد واقعات کا ذکر کریں جو اسلام کے توسیعی دور میں برضاء و رغبت ہوئے، ڈر سے نہیں۔ جذبۂ احترام سے ان کی تحریک ہوئی۔ صلیب و ہلال کی جنگوں میں متعدد نصرانی سپاہیوں نے دلی امنگ سے صلاح الدین ایوبی کا مذہب اختیار کر لیا۔ ہزاروں سادہ لوح نصرانیوں نے مسلمان فاتحین کی رواداری کے برتاؤ میں ایسا مثالی تصور اور ایسا جذبۂ ایمانی پایا جسے وہ (مسلمان) بڑھ چڑھ کر پیش کرنے کی سعی کرتے۔ رضا کارانہ قبولِ اسلام کے واقعات کی گنتی کا ذکر کرتے ہوئے ولندیزی مؤرخ وان گٹ شمڈ کہتا ہے ——

"غیر ملکیوں (مسلمانوں) کی فتح و نصرت کے بعد نیا مذہب (اسلام) اختیار کرنے کی رغبت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا سراغ شاذ ہی ماضی میں ملے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس معاملے میں تنہا اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔"

نامور مؤرخ ڈوزی قبولِ اسلام کے سلسلے میں شکست خوردہ لوگوں کی آمادگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے ——

"پہلے پہل یہ واقعہ چھپتا ہوا راز نظر آتا ہے۔ خصوصاً جب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ نیا مذہب کسی پر ٹھونسا نہیں گیا۔"

درحقیقت یہاں جبر و کراہ کا عنصر ناپید تھا۔ یہی سبب ہے کہ لوگوں نے بھاری تعداد میں آزادانہ اسلام قبول کیا۔

رواداری اسلام کی قوت ہے عظیم فنکار اور مستشرق مارمڈیوک پکتھال[1] مذہبی رواداری میں اسلام کی زبردست قوت پاتا ہے ——

"کوئی مسلمان جب مسلمانوں کی سلطنت کے کھنڈر دیکھے تو یہ نہ سمجھ لے کہ رواداری اسلام کی کمزوری ہے۔ یہ زوال انھی لوگوں کے ذریعے آیا ہے جنہیں مسلمانوں نے ایسے زمانے میں صدیوں تک امان بخشی اور ان سے رواداری کا سلوک کیا جبکہ مغربی یورپ نے اپنے سوا ہر دوسرے مذہب کے پیروکاروں سے جبراً مذہب بدلوانے کو مذہبی فریضہ سمجھا۔ رواداری اسلام کی زبردست ترین قوت ہے کیونکہ یہ صداقت کا انداز فکر ہے۔"

خدا صرف یہود و نصاریٰ یا مسلمانوں ہی کا خدا نہیں۔ اس سورج سے زیادہ کسی کا نہیں جو صرف یہودیوں، نصرانیوں یا مسلمانوں پر چمکتا ہو یا جو اُن میں سے کسی ایک پر پڑتا ہو۔ جنت بھی تنہا مسلمانوں کی نہیں، جیسا کہ قرآن شاہد ہے: "جو کوئی اللہ کی اطاعت کرے گا اور نیکی کرے گا اسکا اجر اس کے رب کے پاس ہوگا۔ انہیں کوئی ڈر نہیں، کوئی غم نہیں۔" (سورہ ۲، آیت کریمہ ۱۱۲)

---

[1] پکتھال غیر معمولی صلاحیت کے انگریز نو مسلم ہیں۔ انھیں اسلام کے خصوصی مطالعے کا شرف حاصل ہے۔ نہایت روشن خیال، صائب الرائے مسلمان اور متبحر عالم ہیں۔ مرحوم نظام حیدرآباد کی سرکار سے وابستہ رہے ہیں۔ انھی کے دور حکومت میں انھوں نے قرآن مجید کو انگریزی میں منتقل کیا۔ ان کا کہنا ہے: "قرآن کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پرانے شیوخ کا نظریہ ہے اور راقم الحروف کا بھی۔ یہاں لفظاً لفظاً کتاب کو منتقل کیا گیا ہے اور موزوں زبان کے انتخاب کی پوری پوری سعی کی گئی ہے لیکن نتیجے میں ذیشان قرآن معرض وجود میں نہیں آتا —— وہ موسیقی پیدا نہیں ہوتی جس کی آوازیں لوگوں کو اشکبار کر دیتی اور سرور و مستی کے عالم میں لے آتی ہیں۔ یہاں صرف قرآن کا مفہوم پیش کیا گیا ہے —— اور اتفاقیہ طور پر انگریزی میں اس کا تھوڑا سا سحر بھی آ گیا ہے۔ یہ ترجمہ کبھی بھی عربی زبان کے قرآن کی جگہ لے سکتا ہے نہ یہ مقصود ہے۔" یہ حوالہ ان کے ترجمہ قرآن کے دیباچے سے لیا گیا ہے۔ (مترجم)

حقوقِ انسانی اور اسلام

غیر مسلموں کے شہری حقوق مسلمانوں کی رواداری اسلام کی روح کا اتنا بڑا عنصر تھی کہ یہ غیر مسلموں کے کلیساؤں اور مندروں کی حفاظت تک ہی محدود نہ رہی بلکہ غیر مسلموں کو شہری حقوق دینے تک پہنچی۔

مسلمانوں کے لشکروں نے جن ملکوں پر قبضہ کیا وہاں کی غیر مسلم اقوام جزیہ ادا کر کے جان و مال کے تحفظ پر بھروسہ کر سکتی تھیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جزیہ مسلمانوں کی اختراع ہے جو وہ غیر مسلموں پر نافذ کرتے تھے لیکن رومنوں اور ایرانیوں کے عہد میں بھی مدتوں ہر شخص سے ایک قسم کا محصول لیا جاتا رہا۔ مسلمانوں نے جن لوگوں کو زیر کیا تھا ان کے لیے جزیہ کوئی نئی شے نہ تھا البتہ یہ ایک نئی شے ضرور تھی کہ جو لوگ محصول ادا کرتے انہیں تحفظ کی ضمانت دی جاتی۔ حضرت علیؓ نے کہا ــــــ

"قانون کی نظر میں ذمی اور مسلمان ایک برابر ہیں۔ جو ہماری حفاظت سے بہرہ ور ہے اس کا خون ہمارے خون کی مانند ہے اور اس کا زرِخوں ہمارے زرِخوں کی مانند ہے ــــــ"

بعض غیر مسلموں نے بوقتِ ضرورت مسلمانوں کے دوش بدوش لڑنے پر رضا مندی ظاہر کی اور انھوں نے جزیے پر اعتراض کیا تو انہیں زکوٰۃ دینے کی اجازت دی گئی۔ ان میں قبیلہ بنو تغلب کے نصرانی اور جرجومہ کے لوگ شامل تھے۔

یہ بھی واضح ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ نے اس آمدنی سے غیر مسلموں کی مدد کی جو مسلمانوں کی جانب سے بیت المال میں وصول ہونے والے محصولات سے ہوتی۔ یوں سخاوت کے اسلامی جذبے نے رواداری کی اسلامی روح سے مل کر دوسرے مذاہب کے بیماروں اور محتاجوں کی مدد کی۔

مذہبی امور میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں غیر مسلموں کو کامل خود مختاری دی گئی۔ اپنے معاملات خود طے کرنے کے حق کو خانگی امور اور داخلی نظم ونسق تک وسعت دی گئی۔ ممتاز مستشرق ڈاکٹر منگانا نے عباسی خلفاء کی جانب سے نسطوری[1] عیسائیوں کو عطا کیے ہوئے منشور آزادی پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی رُو سے ــــــ

(۱) عبادت کی آزادی

(۲) کلیسا کے حکام کے تقرر کے حق

(۳) ~~کلیسا کی املاک اور~~ اموال کے تحفظ اور

(۴) مذہبی رسوم وفرائض کی ادائی کی آزادی کی ضمانت دی گئی۔

ازاں بعد وہ اس شہری آزادی کا ذکر کرتا ہے مسلمان حکمرانوں کی بدولت نسطوری جس سے بہرہ ور تھے اور یوں اس کا خلاصہ پیش کرتا ہے ــــــ

”اس باب میں قانونی طور پر اسلامی طرز عمل کی تشریح اس میثاق میں واضح الفاظ میں کی گئی ہے جس سے بلاشک وشبہ ثابت ہوتا ہے کہ قانونی طور پر عدم رواداری اسلام کی خرابیوں میں شامل نہ تھی۔ یہ میثاق عباسی خلیفہ کے قاضی خانے سے جاری ہوا تھا لیکن کیا آج بیسویں صدی میں انگلستان کا کوئی حکمران، ولندیزی ملکہ یا فرانس کا صدر اپنی بے شمار مسلمان رعیت کے لیے اس سے بڑھ کر رواداری کا حامل میثاق جاری کر سکتا ہے؟“

اس میثاق میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال پر عمل کیا گیا تھا جو آنحضرتؐ نے قائم کی تھی۔ اس میثاق نے صدیوں پہلے آج کی مغربی دنیا سے کہیں بڑھ چڑھ کر وقار پایا اور شکست خوردہ

---

[1] قسطنطنیہ کے بطریق نسطوریس کے پیروکار۔ نسطوریس کو کفر کے الزام میں ہلاک کیا گیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ یسوع مسیح میں الوہی شخصیت اور فانی شخصیت عملاً کامل ہم آہنگی سے گھل مل گئی تھی۔ (مترجم)

لوگوں سے رواداری کر دکھائی۔ دوسرا ایثاقِ آزادی جس سے سچی اسلامی اسپرٹ عیاں ہوتی ہے خالدؓ ابن ولید نے جاری کیا۔ یہ وہی سپہ سالار اعظم ہے جو خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ماتحت منصب دار تھا اور جو سیف اللہ کے نام سے معروف ہوا۔ میثاق یہ ہے ———

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! اگر خالدؓ بن ولید دمشق میں داخل ہوا تو وہ وہاں کے باشندوں کو یہ مراعات دے گا ——— وہ ان کے جان و مال اور گرجوں کے تحفظ کا وعدہ کرتا ہے۔ ان کے شہر کی فصیل منہدم کی جائے گی نہ ان کے گھروں میں کسی مسلمان کو ٹھہرایا جائے گا۔ ہم انہیں اللہ کا عہد نیز پاک نبی ﷺ، خلیفہ اور مومنوں کی حفاظت عطا کرتے ہیں۔ جب تک وہ محصول ادا کرتے رہیں گے خیر کے سوا ان پر اور کچھ نازل نہ ہوگا۔"

قانون کے معاملوں میں اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا کو حق حاصل تھا کہ وہ کسی مسلمان کے خلاف ہی کسی مجرم کا ارتکاب کیوں نہ کریں انھی کا ہم مذہب فیصلہ کرے اور انھیں ہمیشہ منصافانہ فیصلے کی ضمانت دی گئی تھی۔ انھیں کسی شک وشبہ کی بنا پر حراست میں لیا جاسکتا نہ قید کیا جاسکتا تھا اس کی مثال قرونِ اولیٰ سے مل جاسکتی ہے جب حضرت عمرؓ خلیفہ تھے۔

ایک موقع پر حضرت عمرؓ سے شکایت کی گئی کہ عراق کے لوگوں کی آزادی خطرے میں ہے اور انہیں شک کی بنا پر پکڑ لیا جاتا ہے۔ خلیفہؓ نے فوراً عراق کے لوگوں کو یقین دلاتے ہوئے کہا: "کسی قسم کا خوف نہ کھائیں کیونکہ اسلامی ریاست میں کسی کو شک کی بنا پر پکڑا نہیں جاسکتا اور عدل وانصاف کے شعور کے بغیر کسی کو قید میں نہیں ڈالا جاسکتا۔"

اپنے معاملات میں تحفظ، عدل وانصاف، عبادت کی آزادی اور بڑی حد تک آزادی کی مراعات کے باعث غیر مُسلموں کو قومی امور کے وسیع تر شعبے سے محروم نہیں کیا گیا۔

مورخ آیڈم میز کہتا ہے ———

"اسلامی حکومت کی سب سے حیرت خیز بات سرکاری شعبے میں غیر مسلموں کے منصبوں کی تعداد تھی۔ مسلمان اپنی ہی سلطنت میں عیسائیوں کے زیر حکومت رہے۔ یہ پرانی شکایت ہے کہ مسلمانوں کے جان و مال کے

فیصلوں کا معاملہ انھی کے زیرِ نگرانی لوگوں کے سپرد رہا۔ تیسری صدی ہجری (بمطابق نویں صدی شمسی) میں عیسائی وزرائے دفاع تک رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غازیانِ اسلام کو اپنے سالاروں کے ہاتھ چومنے اور ان کے احکام ماننے پڑتے۔"

فرانسیسی مورخ والا زون کو میرز ہمیں بتاتا ہے کہ خلیفہ معاویہؓ (۶۶۱ تا ۶۸۰) نے عیسائیوں کو بہ تعداد کثیر سرکاری ملازمت میں رکھا۔ دوسرے خلفاء کے زمانے میں عیسائی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ خلیفہ المعتمد کے عہد میں نصرانی اُمابن یوسف عنبر کا عامل تھا۔ الموفق نے اسرائیل نام کے ایک عیسائی کو فوج کا نظم ونسق سونپا۔ اسی طرح الموفق کے عہد میں ایک عیسائی دفترِ جنگ کا ناظم تھا۔ مائیکل دی ایلڈر کے بیان کی رو سے جنوبی ایران کے فرماں روا عضد الدولہ (۹۴۹ تا ۹۸۲) کا وزیر اعظم نصر ابنِ ہارون عیسائی تھا۔

مسلمان چونکہ ذمیوں کو اپنے برابر سمجھتے تھے اس لیے آپس میں شادی بیاہ کی اجازت تھی بلکہ بعض اوقات اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ غیر مسلموں سے مسلمانوں کے رویے کی بابت قرآن مجید میں یہ حکم موجود ہے ——

> "اللہ تمھیں ان لوگوں کے احترام سے منع نہیں کرتا جنھوں نے مذہب کی بنا پر تم سے جنگ نہیں کی اور تمھیں گھر سے بے گھر نہیں کیا۔ تم ان سے مہربانی اور انصاف سے پیش آؤ کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔" (سورۃ ۶۰، آیت کریمہ ۸)

اسلام ان غیر مسلموں سے شادی بیاہ کی اجازت دیتا ہے جن پر شریعت نازل ہوئی۔ قرآن میں آیا ہے ——

> "آج کے دن تمام عمدہ چیزیں تم پر حلال کردی گئی ہیں۔ اہلِ کتاب کا کھانا تم پر حلال ہے اور تمہارا کھانا ان پر حلال ہے۔ تم پر مومنوں کی نیک بیبیاں اور ان کی نیک بیبیاں جن پر تم سے پہلے صحیفہ نازل ہوا حلال ہیں بشرطیکہ تم انہیں شادی بیاہ کا معاوضہ دو اور ان کے ساتھ عزت وآبرو سے رہو —— ان سے زنا

کرو نہ انہیں چوری چھپے داشتہ کے طور پر رکھو!" (سورۃ ۵، آیت کریمہ ۵)

مسلمان مہاجرین کے حقوق جب کوئی مہاجر کسی غیر اسلامی مملکت سے بھاگ کر اسلامی مملکت میں آئے تو وہ اسی آن شہری حقوق پا سکتا ہے۔ اسے دوسرے مسلمانوں کی طرح پورے حقوق حاصل ہوں گے۔ حاجت مند ہو تو اسے زکوٰۃ کی مد سے مدد دی جا سکتی ہے تا آنکہ وہ معقول طور پر محصول ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔

اس نظام کے سیدھے سادے انصاف نے اسلام کے استحکام میں گراں قدر اضافہ کیا۔

اسلام اور حقوقِ نسواں عورت کو جس طور اللہ نے پیدا کیا وہ آدمی کے برابر ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے اسلام نے اس صداقت کو جان لیا اور نسائی انفرادیت کا دعویٰ برقرار رکھا۔ عورتوں کو جو حقوق دیے گئے ان میں روزی کمانے اور کام کا پورا پورا معاوضہ پانے کا حق شامل تھا۔ قرآن مجید میں آیا ہے ——

"جو کچھ مرد کمائیں اس کا فائدہ مردوں کو اور جو کچھ عورتیں کمائیں اس کا فائدہ عورتوں کو پہنچے۔" (سورۃ ۴، آیت کریمہ ۳۲)

قرآن میں مزید ایسے احکام ہیں جو عورتوں سے کیے جانے والے سلوک، بیویوں کے حقوق، بیواؤں کی حفاظت اور ماؤں کی اہمیت کے بارے میں فکر مندی کا مسلسل اظہار کرتے ہیں۔ تمام معاملات میں، وہ دنیاوی ہوں یا روحانی قرآن حکیم مساوی مواقع پیش کرتا ہے۔

"مرد ہو یا عورت، جو کوئی نیکی کرے گا اور ایمان والا ہو گا ہم یقیناً اسے عمدہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہترین عملوں کا اجر دیں گے۔"

(سورۃ ۱۶، آیت کریمہ ۹۷)

اور قرآن حکیم میں آیا ہے ——

"بے شک وہ مرد جنھوں نے (خدا کے احکام کو) تسلیم کیا اور وہ عورتیں جنھوں نے (خدا کے احکام کو) تسلیم کیا، اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں، اور صبر والے مرد اور صبر والی عورتیں، اور مسکین مرد اور مسکین عورتیں، صدقہ خیرات دینے والے مرد اور صدقہ خیرات دینے والی عورتیں،

روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور
اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ کا زیادہ ذکر کرنے والے مرد
اور ذکر کرنے والی عورتیں ——— ان سب کے لیے اللہ نے مغفرت اور
بڑے اجر کا بندوبست کیا ہے۔" (سورۃ ۳۳، آیت کریمہ ۳۵)

جہاں تک عورتوں کے لیے مساوی اُجرت کا سوال ہے صدیوں پہلے قرآن پاک میں اس کا اندازہ کرلیا گیا تھا درآنحالیکہ مغربی ممالک اس کے حصول کی ہنوز ابتدا کر رہے ہیں۔ آج بیسویں صدی کے فرانس میں ہو رہا ہے اس سے کہیں پہلے اسلام کے عین شروع کے دنوں میں عورتوں ——— شادی شدہ عورتوں، غیر شادی شدہ عورتوں اور بیواؤں کو جائیداد کے حقوق دیے گئے تھے۔

اسلام نے ہمیشہ یہ بات واضح کی ہے کہ عورت اپنی تمام جائیداد اور ان جائیدادوں پر پورا پورا اختیار رکھتی ہے جو اسے رشتہ داروں کی جانب سے ملیں۔

قرآن کہتا ہے ———

"عورتوں کو ان کا مہر خوشی خوشی دے دو اور اگر وہ اپنی مرضی سے اس کا
کچھ حصہ تمھیں دے دیں تو اسے مزے سے کھاؤ۔" (سورۃ ۴ آیت کریمہ ۴)

اور پھر ———

"مردوں کا اس میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑیں اور
عورتوں کا اس میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑیں ———
یہ حصہ کم ہو یا زیادہ لیکن یہ مقرر ہے۔" (سورۃ ۴، آیت کریمہ ۶)

رسولِ اکرم (ﷺ) کے بارے میں روایت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بہترین مسلمان وہ ہے جو اپنی بیوی سے بہترین سلوک کرے اور اگر کوئی مسلمان اچھی طرح اپنی لڑکی کی پرورش کرے اور اس کی خوشی کا مناسب بندوبست کرے تو اس پر جنت کے دروازے کھلے رہیں گے۔ یہ بھی حدیثِ نبوی ہے کہ ———

"بہترین مسلمان وہ ہے جو اپنی بیوی سے بہترین سلوک کرے۔" (بحوالہ ترمذی)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل اس بات پر زور دیا کہ مسلمان اپنی عورتوں کا

احترام کریں۔ جب بھی آپ کی صاحبزادی آپ سے ملنے آئیں آپ ہمیشہ کھڑے ہو گئے۔ یہ حدیث بھی آپ سے مروی ہے ــــــــ

"ماں کے قدموں میں جنت ہے۔"

کینیڈا کے ایک جج مسٹر جسٹس کریا بکس نے لکھا ہے ــــــــ :

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم غالباً دنیا میں حقوق نسواں کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔"

نامور فرانسیسی قلمکار آندرے سرومیئر نے بھی اس رائے کی تائید کی۔ وہ لکھتا ہے ــــــــ

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کا حامی بننے کی سعی کی۔ وہ ان کے سلسلے میں فراخدلی سے بات کرتے ہیں اور انھوں نے انھیں بلند مرتبہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی اصلاحات سے پہلے عورتوں اور بچوں کو ورثہ نہیں ملتا تھا اور پھر سب سے بُری بات یہ تھی کہ متوفی کا سب سے قریبی رشتہ دار عورتوں اور املاک پر اس طرح قابض ہو جاتا جس طرح وہ اپنے غلاموں اور ان کی بچت (کے روپے) پر قابض ہو جاتا۔ ان کے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) آخری خطبے میں یہ تاریخی الفاظ شامل تھے ــــــــ "اپنی بیویوں سے اچھا سلوک کرو کیونکہ یہ تمہاری مددگار ہیں اور اپنے آپ کچھ نہیں کر سکتیں، انھیں خوب معلوم تھا کہ اگر عورت دن کے وقت خادمہ ہے تو رات کے وقت ملکہ ہے اور ہر وقت اس کا اثر قابل غور ہے۔"

جب آدمی یہ دیکھتا ہے کہ بعض قبائل جنھیں اسلام نے مسخر کیا کس قدر غیر مہذب تھے اور اس زمانے کے بیشتر مہذب ترین ملکوں میں عورتوں کو کس قدر کم حقوق حاصل تھے تو اس سے پتا چلتا ہے کہ اسلام نہ فقط حقوقِ نسواں کے سلسلے میں بلکہ کتنے ہی دوسرے معاملوں میں ان کے مذہبوں اور اخلاقی نظاموں سے صدیوں آگے تھا۔ درحقیقت اسلام کا فکر انگیز معاشرتی انقلاب قرآن کے اس حکم میں سمٹ کر آ گیا ہے ــــــــ

"اور ان (عورتوں) سے نرمی سے پیش آؤ۔" (سورۃ ۴، آیت کریمہ ۱۹)

فوجی امور سے متعلق ایک پچھلے باب میں ہم نے دیکھا کہ عورتوں سے متعلق یہ احساس مفتوحہ علاقوں کی عورتوں اور دشمنانِ اسلام کی عورتوں کے حقوق تک قائم رہا۔ اس سے وہ انسانی جذبہ عیاں ہوتا ہے جو اپنے زمانے پر سبقت لے گیا۔

مسلمانوں میں ان کی عورتیں اعلیٰ منصب اور اثر و رسوخ پا سکتیں تھیں۔ اندلس میں مسلمانوں کی بہادری کے کارناموں کے باب میں ہم نے دیکھا کہ بعض مسلمان شہزادے کس

قدر عالم و فاضل تھے۔ فلپ حِتّی بتاتا ہے کہ عام عورتیں بھی امتیازی مقام رکھتی تھیں ــــــ [1]

"ہم اسلام کے قرونِ اولیٰ ہی میں عورتوں کو اونچے حلقوں میں دیکھتے ہیں۔ وہ امورِ مملکت میں ممتاز حیثیت رکھتی اور اثر و رسوخ استعمال کرتی ہیں ــــــ مثلاً الخیضوران، المہدی کی بیوی اور الرشید کی ماں، علیہ (المہدی کی بیٹی) ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ اور الامین کی ماں اور بوران، المامون کی بیوی۔ یہی نہیں بلکہ عرب دوشیزائیں محاذِ جنگ پر جاتیں، لشکروں کی کمان سنبھالتیں، شعر کہتیں اور ادبی مشاغل میں مردوں سے مقابلہ کرتیں یا پھر اپنی ذہانت، فنِ موسیقی کی صلاحیت اور نغموں سے معاشرے میں جان ڈال دیتیں۔"

اس تالیف کے پہلے حصے میں تعلیم سے متعلقہ باب میں ہم نے دیکھا کہ کس طور مسلمان لڑکی کو علم حاصل کرنے کا حق حاصل تھا۔ طب کے باب میں ہم نے تیمارداری کی خدمت (نرسنگ سروس) کا حال پڑھا ہے۔ مسلمان عورتیں محاذِ جنگ پر اپنے مردوں کی خدمت کے لیے شعبۂ تیمارداری میں شامل ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر مسلمان عورتوں کی دلیری کے متعدد قصے موجود ہیں۔ ایک مشہور ترین واقعہ یہ ہے کہ جنگ قادسیہ میں چند رضا کار عورتوں نے لاٹھیاں سنبھال لیں اور صفیں بنا کر چل پڑیں تا کہ یہ تاثر پیدا ہو کہ کمک آ رہی ہے۔ یوں صف بستہ ہو کر اپنے تکان زدہ لشکر کا ایسا حوصلہ بندھایا کہ جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمانوں کو ایرانیوں پر زبردست فتح نصیب ہوئی۔ اسی طرح یرموک کی جنگِ عظیم میں ابوسفیان کی صاحبزادی جوارِیہ کی قیادت میں مسلمان عورتوں کے لشکر نے بڑا امتیاز حاصل کیا۔ امام بخاری علیہ الرحمتہ نے کئی ابواب رقم کیے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ عورتوں نے محاذِ جنگ پر نرسوں، بہشتیوں اور گورکنوں کا کام تن دہی سے کیا۔ یہی نہیں بلکہ ہنگامی حالات میں سچ مچ کے سپاہی بھی بن گئیں۔

شادی اور کثرتِ ازواج ــ اسلام میں اہلِ مغرب اسلام کی صداقتوں سے آگاہ نہیں چنانچہ وہ اکثر اسلام پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ وہ قیاس کرتے ہیں کہ اسلام نے جبری شادی کی اجازت دی اور زیادہ عورتیں کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ان میں سے کوئی الزام بھی درست نہیں۔

جہاں تک شادی کا تعلق ہے مسلمان فقہاء نکاح سے پہلے عورت کی رضامندی پر زور دیتے ہیں اور قرآن مجید عورت کی مرضی کے خلاف شادی بیاہ سے منع کرتا ہے۔ آیاتِ کریمہ میں آیا

---

[1] بحوالہ HISTORY OF THE ARABS صفحہ ۳۳۳۔

ہے کہ مقررہ مہر کے ذریعے دلہن کے حقوق کی لازماً نگہداشت کی جائے اور بعض حالتوں میں خاوند کے گھر رخصت ہونے سے پہلے دلہن کے سرپرست کی اجازت کا بھی تقاضا کیا گیا ہے۔

عورت کو زبردستی شادی کے بندھنوں میں جکڑنے کا تو ذکر ہی کیا اسے تو درحقیقت شادی کے انتخاب میں آزادی دی گئی ہے۔

"اگر وہ دستور کے مطابق باہم راضی ہو جائیں تو انہیں خاوند کرنے سے مت روکو۔" (سورۃ ۲، آیت ۲۳۲)

شادی کرنے کے بعد عورت اپنی ذاتی املاک سے محروم نہیں ہو جاتی بلکہ نئے حقوق حاصل اور نئی ذمہ داریاں قبول کرتی ہے۔

زیادہ بیویاں کرنے کے موضوع پر ہمیں پتا چلتا ہے کہ اسلام اس کی حوصلہ افزائی تو کیا کرتا الٹا اس نے اس زمانے کے عرب قبائل کے عام مروجہ دستور پر حد لگائی۔ کئی بیویاں کرنے کی بجائے اسلام نے نیک مسلمان کو چار سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دی اور پھر وہ بھی اس شرط پر کہ وہ ہر ایک کی مناسب کفالت کا اہل ہو اور ان سے مساوی طور پر انصاف کر سکے۔ اس سے زمانے کی عرب عورتوں کی حالت میں زبردست انقلاب کا پتا چلتا ہے۔

بیسویں صدی میں چند ہی مسلمانوں کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں گی، چند کی دو دو بیویاں ہوں گی اور چار بیویاں تو شاید ہی کسی کی ہوں۔

بہرحال یہ امر دلیل طلب ہے کہ مشرق میں زیادہ بیویوں کے رواج کو ہنوز مغرب میں ایک بیوی اور اسکے ساتھ رنڈی بازی کے چلن پر خاصی حد تک سبقت حاصل ہے۔

اسی موضوع پر نامور عرفانیات دان اور حقوقِ نسواں کی علمبردار خاتون مسز اینی بیسینٹ نے اپنے ایک لیکچر میں کہا ہے ——

"جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں بے کس عورتیں رات کو مغرب کے گلی کوچوں میں ہجوم کر آتی ہیں تو پھر ہم بالیقین محسوس کرتے ہیں کہ اہلِ مغرب کو زیب نہیں دیتا کہ کثرتِ ازدواج کے نام پر اسلام کو برا بھلا کہیں۔ بہتر یہی ہے کہ عورت کثرتِ ازدواج کے دائرے میں ایک آدمی کے ساتھ رہے اور اس کی آغوش میں حلال کا بچہ رہے —— جسے بنظرِ احترام دیکھا جائے نہ یہ کہ اسے ورغلایا اور اس سے حرام کیا جائے اور باہر گلی کوچوں میں پھینک دیا جائے —— غالباً اس کی گود میں حرام کا بچہ ہوگا جسے کسی قسم کا قانونی حق حاصل نہ ہوگا۔ یہ عورت بے گھر ہوگی، اس سے اتنی بے اعتنائی برتی جائے گی کہ راتوں پر راتیں گزریں گی اور وہ کسی بھی راہگیر کی ہوس کا شکار بنتی رہے گی —— اسے کبھی ماں نہ بننے دیں

گے، سب اس سے نفرت کریں گے۔" [1]

---

[1] علمائے بشریات بتاتے ہیں کہ رنڈی مشرق کے قدیم تہذیبی دور کی پیداوار ہے۔ اسے زرعی تہذیب نے جنم دیا۔ دنیا کی پہلی رنڈی کا خمیر معبد میں اٹھا۔ یہ معبد حسن، پیار اور جنسی جذبے کی دیوی ـــــ عشتار (یونانی افرودائتی) کے لیے مخصوص تھا جہاں زرعی تہذیب کے مروجہ ضابطے کی رو سے ہر کنواری لڑکی فرض کے طور پر آتی اور اپنا جسم بلا تامل اس اجنبی کے حوالے کر دیتی جو حسب توفیق چند ٹکے دیوی کے نام پر اسکی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ اس دھرتی دیوی کی پوجا اول اول فرات و دجلہ کی وادی اور نیل ویلی میں ہوتی۔ رفتہ رفتہ معبد مقدس رنڈیوں (دیوی داسیوں) کا چکلہ بن گیا۔ پھر جب طلب بڑھی تو رنڈی نے پر پرزے نکالے اور معبد سے باہر پاؤں دھرا۔ گلی کوچوں میں آئی تو معاشرے نے اسے بطیب خاطر اپنے اندر سمو لیا۔ یونان اور روما میں اونچے طبقے کی رنڈی کو بنظر احترام دیکھا جاتا اور اسے تہذیب، تمدن کی علامت مانا جاتا۔ اس دور میں یہ اپنے وقت کی امراؤ جان ادا ہوتی اور صرف جنس کا بازار نہ گرماتی بلکہ علم و فن کی محفلیں سجاتی، سیاسی امور سلجھاتی اور علم و فن کی سرپرستی کرتی ـــــ اقتدار کی ہر مسند تک پہنچ جاتی۔ اس سلسلے میں ملکہ تھیوڈورا کا نام لیا جا سکتا ہے جو گلی میں سے اٹھ کر تاجدار کے پہلو میں جا بیٹھی۔ اس نے ٹکیائیوں (نچلے درجے کی رنڈیوں) کی اصلاح کا اقدام بھی کیا جو نا کام ثابت ہوا۔

رنڈی کو صلیبی جنگوں سے بھی تعلق رہا۔ رنڈیوں کی کھیپ مسیحی مجاہدوں (کروسیڈرز) کے ہمراہ جاتی۔ ان رنڈیوں کو اصطلاحاً "کیمپ فالورز" کہتے۔

رنڈی کے پیشے کو روز افزوں ترقی ملتی گئی۔ رنڈی بازار کی رونق بنی اور پھر جب بات یورپ کے طویل اور مسلسل صنعتی انقلاب، گولڈ رش اور سیم و زر کی ریل پیل تک پہنچی، گھر کا شیرازہ بکھرا اور کنبے کا تصور ماند پڑ گیا تو رنڈی کی بن آئی۔ رنڈی کی مانگ بے حد بڑھی اور رسد تو اس سے بھی سوا ہوئی۔ اب یورپ کے ہر محلے، ہر بازار، ہر کوچے میں کہیں نہ کہیں کوئی سرائے، کوئی شراب گھر، کوئی قمار خانہ اور "سرخ لالٹین والا مکان" نظر آنے لگا۔ سرخ لالٹین قحبہ خانے کی علامت تھی اور اہل ضرورت کی سہولت کے لیے دروازے پر لٹکا دی جاتی۔ "ریڈ لائٹ ڈسٹرکٹ" کھل گئے۔ رنڈیاں طبقوں میں بٹ گئیں۔ اونچے طبقے کی رنڈی "کال گرل" بن گئی۔ ملوکیت کے زمانے میں یہ "درباری رنڈی" "COURTESAN" تھی جسے امراء و رؤساء داشتہ کے طور پر کام میں لاتے۔ کال گرل خواص کی رنڈی ہے۔ عوام کی رنڈی سٹریٹ واکر (گشتی) کہلاتی اور راہ چلتے کو اٹکاتی ہے۔ مغرب میں ان چلتی پھرتی بازاری عورتوں نے معاشرے کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ گشتیوں میں سب سے خطرناک Hookers ہیں جو راہگیروں کے گلے پڑتی اور جارحیت پر اتر آتی ہیں۔ موقع ملے تو گاہک کی جان بھی لے لیتی ہیں۔ انہی کے انسداد کی خاطر کمیشن بٹھائے گئے، قوانین بنائے گئے۔ قانون بے بس ہے اور اس کے پاس "اسٹریٹ واکرز" (گلے پڑنے والی فاحشہ عورتوں) کی سرگرمی کو محدود کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

مغرب کا صنعتی اور سرمایہ دارانہ (جمہوری) معاشرہ رنڈی بازی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ادھر مشینوں نے آدمی کو مشین بنا دیا، زندگی میکانکی (اور غیر قدرتی) ہو کر رہ گئی، تصنع بڑھا اور ادھر جنگوں میں بے تحاشا بہترین انسانی ایندھن جھونکا گیا۔ اس کے نتیجے میں چنگی بھلی عورت جنسی اشتہا سے تنگ آ کر بے حیائی پر اتر آئی۔ رنڈیوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوا۔ پھر مغرب کے چمکتے دمکتے، سنسنی خیز اور لذت فروش معاشرے میں عورت بہتر معیار زندگی (یعنی عیش و عشرت، آسائش و آرائش) اور جنسی آزادی کی طلبگار ہے۔ اس کے لیے وہ جز وقتی رنڈی بن جاتی ہے اور اپنی ذہنی اور بدنی صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ روپیہ کماتی ہے۔ وہاں صنعتی زندگی کے پھیلاؤ نے عورت پر معاش کے تمام دروازے کھول دیے ہیں لیکن عورت اپنی کمائی کو نا کافی سمجھتی اور ایک ہی ملازمت پر اکتفا نہیں کرتی۔ سنسنی پسندی، زر طلبی اور جنسی اشتہا سے جسم فروشی پر مائل کرتی ہے۔ معاشرہ ہر وقت اس کے لیے راہ ہموار رکھتا ہے۔ آج کا مغربی معاشرہ بڑی حد تک رنڈی کے اختیار میں ہے۔ کرسٹائن کیلر کا واقعہ ابھی کل کی بات ہے۔ اعلیٰ طبقے کی اس ممتاز رنڈی نے حکمران طبقے میں کھلبلی مچا دی اور سرکاری ڈھانچے کی بنیاد ہلا دی۔

مغرب کے علمائے عمرانیات رنڈی کو معاشرے کا "سیفٹی والو" قرار دیتے ہیں اور رنڈی بازی کی روک تھام کے سلسلے میں سرکاری اقدامات سے بسا اوقات اختلاف کرتے ہیں۔ وہ رنڈی کو وجہ خیر سمجھتے اور اسکے وجود کو بڑے اہتمام سے سنبھال رکھنے کے قائل ہیں۔ حیرت ہے کہ مغرب میں رنڈی بازی اتنی عام ہے جبکہ وہاں عورت حد سے زیادہ بے باک اور جمہوریت کے فیض سے ہر قسم کی اخلاقی پابندی سے آزاد ہے، مرد و زن کا اختلاط غیر مستحق نہیں اور اب نفسیات دانوں کی سفارش پر بچوں کو جنسی تعلیم دینے کی تیاری ہو رہی ہے۔ عجب نہیں کہ عورت مغرب کی شاخ نازک ثابت ہو۔ (مترجم)

میاں بیوی کے تعلقات کی نسبت قرآن ایسے الفاظ میں گفتگو کرتا ہے کہ نقالی نہیں کی جا سکتی۔ ارشاد ہوا ہے ـــــــ

"وہ (تمھاری بیویاں) تمھارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔"

(سورة ۲ آیت کریمہ ۱۸۷)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کعبہ پر فرمایا ـــــــ

"اے لوگو! تمھیں اپنی بیویوں پر چند حقوق حاصل ہیں۔ پس تم انھیں اپنے اوپر حقوق دو! وہ تمھاری تحویل میں اللہ کی امانت کے طور پر ہیں۔ لہٰذا تم ان سے مہربانی سے پیش آؤ!"

اسلام کے مخفی پھول مسلمان عورتیں نسبتاً تنہائی میں رہتی ہیں تو اس سے کئی اہلِ مغرب کو یہ قیاس کرنے کا موقع ملا کہ وہ پسماندہ ہوتی ہیں اور نئی دنیا میں اپنا مقام پانے کے نا قابل ہیں لیکن مسٹر جسٹس کار بائنس کی سوچ کا انداز مختلف ہے۔ وہ مسلمان عورتوں کو "اسلام کے مخفی پھول" کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کسی طور ڈرپوک یا مغلوب نہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے ایک اسلامی ملک میں جج موصوف کو جو تجربہ ہوا اس کا حوالہ دیتے ہوئے وہ بتاتا ہے کہ کس طرح وقت آپڑے تو مسلمان عورتیں گوشۂ تنہائی سے نکل آتی اور نہایت فصاحت و بلاغت اور جرأت و جسارت سے اپنا معاملہ خود پیش کرتی ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت کیوں پائی جاتی ہے، جج موصوف کے نزدیک جرأت و جسارت کا اصل سبب کردار کی پاکیزگی اور رفعت ہے۔ مسلمان عورتیں مثالی طور پر پاکباز اور بلند مرتبہ ہیں۔ وہ ہنوز ان مثالی نظریوں کے مطابق زندگی گزرانے کی کوشش کرتی ہیں جن پر ان کے مرد اعتقاد رکھتے ہیں اور جن کی اسلامی تعلیمات نے صدیوں نگہداشت کی۔

اسلام اور غلامی جس دور میں اسلامی لشکر تین بڑاعظموں پر فتح و نصرت پا رہے تھے فاتحین کا عام دستور یہ تھا کہ بطور یرغمال یا غلام بنانے کے لیے دشمن کے جس قدر قیدی ہتھے چڑھتے انھیں لے جاتے۔ اسلام نے ایک دم غلامی کا قلع قمع نہیں کیا لیکن اس نے بلاشبہ یوں کیا کہ آغاز ہی سے غلاموں کی ملکیت کو انفرادی طور پر ہر مسلمان کی ضمیر کا مسئلہ بنا دیا اور مسلمانوں کو اس امر کی تحریک دی کہ وہ ان غلاموں کو آزاد کر دیں جو پہلے سے ان کے قبضوں میں ہوں۔

قُرونِ اُولیٰ ہی سے ہم دیکھتے ہیں کہ غلامی کے باب میں مسلمانوں کی سوچ اپنے زمانے سے بہت آگے تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ــــــ

"اے ایمان والو! اپنے غلاموں یا کنیزوں سے مت کہو کہ تمھارا کھانا یا تمھارے لیے وضو کا پانی لائیں اور انھیں اپنا غلام بھی مت کہو کیونکہ انجام کار تم سب اللہ کے خادم ہو۔ پس اپنے غلاموں کو "میرا لڑکا، میرا بیٹا، میری بیٹی" کہہ کر مخاطب کرو۔ اے مومن! اپنے غلام یا اپنی کنیز کو پاس بٹھا کر کھانا کھلا اور اگر کھانا اتنا نہ ہو کہ دو کے لیے کافی پڑے تو کم از کم اسے چند نوالے ہی اپنے ساتھ کھلا۔ جو مسلمان بھی ایک غلام کو آزاد کرے گا اللہ اس کے کنبے کے ایک فرد پر دوزخ کی آگ حرام کرے گا۔" (بخاری)

جنگی قیدیوں کا ذکر کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــــ

"تمھارے جنگی قیدی تمھارے بھائی ہیں جنھیں اللہ نے تمہاری تحویل میں رکھا ہے۔ پس جس کسی کے پاس اس کا بھائی ہے وہ جو کچھ کھائے اس میں سے اسے بھی دے اور جو کپڑے پہنے ان میں سے اسے بھی پہننے کو کپڑے دے اور انھیں ایسا کام کرنے کو نہ دے جو اس کی طاقت سے باہر ہو اور اگر انھیں ایسا ہی کام دینا ہو تو پھر انھیں کام میں مدد دو۔"

قرآن میں غلامی کا لفظ تقریباً ہر موقع پر جنگی قیدیوں کے سلسلے میں آیا ہے۔ لیکن کوئی شخص قرآن میں کسی طور غلامی کی اجازت کا حکم نہ پائے گا۔ غلاموں کی فروخت واضح طور پر ممنوع ہے اور اسی طرح نکاح کیے بغیر کنیزوں سے ہم بستری حرام ہے۔ اس سلسلے میں قرآن میں آیا ہے ــــــ

"تم میں سے جو تنہا ہوں ان سے یا پھر غلاموں یا کنیزوں میں نیک ہوں ان سے بیاہ کر دو! اگر وہ مفلس ہوں تو اللہ اپنے کرم سے انہیں عطا فرمائے گا۔ کیونکہ اللہ سب پر قادر ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔" (سورۃ ۲۴، آیت کریمہ ۳۲)

قرآن میں یہ حکم بھی آیا ہے ــــــ

"جو لوگ شادی کی استطاعت نہیں رکھتے وہ پاکباز رہیں تا آنکہ اللہ

اپنے کرم سے انھیں مالدار کر دے تا کہ وہ شادی کر لیں اور تمھارے ایسے غلام جو پروانہ آزادی طلب کریں انھیں پروانہ دے دو اگر تم ان کی نیکوکاری سے واقف ہو اور انھیں اللہ کا مال و دولت دو جو اس نے تمھیں بخشا ہے اور اپنی کنیزوں کو اس دنیا کی ناپائیدار چیزیں حاصل کرنے کی غرض سے رنڈی بازی پر مجبور کرے گا تو لاریب جبر کے بعد بھی اللہ معاف کرنے والا اور رحم دل ہے۔" (سورۃ ۲۴، آیت کریمہ ۳۳)

اتنے اسلامی اوصاف پر بھی یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ گرامی تھی جنھوں نے اپنے پیروکاروں کے لیے ذاتی مثال پیش کی۔

ایک مرتبہ قریش کے ایک سردار نے حضرت محمدؐ سے شکایتاً کہا، "اے محمد ﷺ ہم تمھارے پاس کیونکر بیٹھ سکتے ہیں جبکہ تمھارے پاس ہم جیسوں میں بلالؓ اور زیدؓ ایسے غلاموں تک، کمترین طبقوں کے لوگ شامل ہیں؟ اگر تم انھیں نکال دو تو ہم تمھارے پاس آئیں گے۔"

رسول اکرم ﷺ نے بڑی شدت سے اس تجویز کو ٹھکرا دیا اور امراء سے کہا گیا کہ وہ بلالؓ کو "سیّدنا" کہہ کر بلائیں اور زیدؓ کے لڑکے اُسامہ کے زیرِ کمان رہنے کو کہا جب اسے شام کی مہم پر سپہ سالار بنا کر بھیجا گیا۔ اس طرح عرب کے امراء کو پہلی بار براہِ راست اسلام کے نظریۂ مساوات کی قدر و منزلت جاننی اور اسے بجان و دل قبول کرنی پڑی۔

جن غلاموں کو سب سے پہلے آزاد کیا گیا ان میں ممتاز عالم کے طور پر شہرت پانے والوں میں صہیب بھی تھے۔ وہ اعلیٰ مقام پا کر خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے مشیر مقرر ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ جب خلیفہ بسترِ مرگ پر تھے تو انھوں نے انھی کو نمازِ جنازہ پڑھانے اور اس وقت تک مسندِ کو خلافت پر رہنے کو کہا جب تک نئے خلیفہ کا انتخاب عمل میں نہ آئے۔ یہی صہیب تین روز تک خلیفہ رہے۔ خود نبی اکرم ﷺ کے داماد (حضرت علیؓ) اور رؤسائے قریش نے ان کی اطاعت کی بعد ازاں صہیب نے آخری خلیفہ کی عم زاد بہن زینب سے بیاہ کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں مساوات صرف نام لینے کے لیے نہیں بلکہ ایک زندہ صداقت ہے۔

جب حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں عمروؓ بن العاص نے مصر فتح کیا تو انہوں نے دیکھا

کہ ملک صرف غلاموں کی جبری محنت پر زندہ ہے۔[1]

خلیفہ کو جو رپورٹ بھیجی گئی وہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ عمروؓ بن العاص نے تعلیماتِ اسلامی کامل طور سے جذب کیں اور انھیں بھی غلامی سے نفرت ہوگئی۔

> ''غلاموں کے انبوہ یوں زمین کو کالا کر دیتے ہیں کہ ان کا مقابلہ جفاکش چیونٹیوں کے لشکر سے کیا جاسکتا ہے۔ ان سے کام لینے والے کا کوڑا انھیں سرگرمِ عمل رکھتا ہے لیکن وہ جو دولت کا خزانہ برآمد کرتے ہیں وہ آقا اور مزدور میں غیر مساوی طور پر بانٹا جاتا ہے۔''

عمروؓ ابنِ العاص کا لڑکا بہر حال نسبتاً کم روشن خیال تھا تا آنکہ ایک دن اسے حضرت عمرؓ کی جانب سے تنبیہ موصول ہوئی۔ لڑکے نے ایک مصری افسر کو پہلے تو پیٹا اور پھر قید میں ڈال دیا۔ قیدی بھاگ نکلا اور اس نے خلیفہ سے انصاف کی درخواست کی۔ وہ ایک مسلمان کے اس سلوک کا حال جان کر بڑے غمزدہ ہوئے۔ خلیفہ نے عمروؓ بن العاص اور ان کے لڑکے سے کہا: ''اے عمرو! تم کب سے لوگوں کو غلام بنانے لگے جبکہ اُن کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا؟''

وہی مصر رومنوں اور یونانیوں نے پہلے لوٹا کھسوٹا اب ساراسینوں کے عہدِ اقتدار میں خوشحال ہوا اور کتنے ہی غلام ملتِ اسلامیہ کے آزاد رکن بن گئے۔ آنے والی صدیوں میں بھی ایسے ہی نتائج برآمد ہوئے جیسا کہ پروفیسر نولڈیک نے بیان کیا ہے ———

> ''جو بھی مسلمان ہوا اسے وہی حقوق ملے اور وہی فرائض سونپے گئے جو سب سے اعلیٰ اور سب سے ادنیٰ مومن کو حاصل تھے۔ مسجد میں کسی

---

[1] عہدِ فراعنہ میں غلاموں کا وجود مصری معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی تھا۔ ان سے بالجبر کام لیا جاتا۔ اہرامِ مصر اور کتنی ہی دوسری عمارتیں اور نہریں انھی کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ عہدِ قدیم کے حکمران اور مفکر ایسے معاشرے کے تصور سے عاجز تھے جو غلاموں کے بغیر قائم رہ سکتا ہو۔ آزاد شہریوں کے لیے غلام از بس ضروری تھے۔ افلاطون ایسے روشن خیال فلسفی نے بھی اپنی لافانی تالیف ''دی ری پبلک'' میں ریاست کا ایسا نقشہ پیش کیا جس میں غلاموں کو اس کا لازمی جزو قرار دیا۔ قدیم ہند کے مفکرِ اعظم (اور انسانیت کے سب سے بڑے دشمن) ——— منو مہاراج نے بنی نوع آدم کو واضح طور پر چار طبقوں میں بانٹا۔ سب سے ممتاز سطح پر برہمنوں کو رکھا، ان سے نیچے کھشتریوں کو، ان سے نیچے کاروباری لوگوں (ویشوں) اور سب سے نیچے شودروں کو۔ یہ غلام ہوتے اور رذیل سمجھے جاتے اور ذلیل کیے جاتے۔ یہ مظلوم لوگ شہری حقوق سے محروم ہوتے۔ البتہ ان کی خوبصورت عورتوں کو ہندوؤں کا جی بہلانے اور ناچ گانا سیکھنے کی اجازت تھی ——— جہاں شودر مردوں کو قریب بھی پھٹکنے نہ دیا جاتا وہاں ان کی عورتوں کے جسم سے لمس کرنے میں مضائقہ نہ تھا۔ (مترجم

کے لیے مخصوص نشست نہ تھی۔ اسلام نے افریقہ اور ایشیا کے کروڑوں غلاموں کے دلوں میں اسلامی وقار کے شعلے تاباں رکھے۔''

عیسائیوں کے یورپی ملکوں میں ازمنۂ وسطیٰ تک غلامی زوروں پر رہی اور ہم سنتے ہیں کہ کس طرح ۱۴۹۲ء میں پوپ نے پرتگال کے بادشاہ کو حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کو بیچ کر غلام بنا ڈالے۔ بعد کے زمانے میں انگلستان میں پھر غلاموں کی تجارت کا منظر سامنے آتا ہے۔ ۱۶۸۰ء سے ۱۷۰۰ء تک تو غلاموں کی تجارت نقطۂ عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ جبکہ نجی تجارتی اداروں نے جمیکا اور شمالی امریکہ کے باغات کے لیے ساٹھ لاکھ سے زائد نیگرو بیچ ڈالے۔ انیسویں صدی سے قبل انگلستان میں غلامی کا خاتمہ نہیں ہوا اور جب تک رائے عامہ نے مجبور نہ کیا حکومتِ برطانیہ نجی سرمایہ داروں کے مفادات میں دخل دینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ امریکہ میں تو غلامی کا خاتمہ اور بھی بعد میں ہوا۔

ایک نامور سیاح جوزف طامسن افریقہ گیا تھا چنانچہ اس نے ۱۴ نومبر ۱۸۸۷ء کو ''مشرقی افریقہ میں غلامی'' کے موضوع پر اخبار لندن ٹائمز میں ایک خط چھپوایا۔ مضمون یہ تھا ——

''میں بلا تامل تصدیق کرتا ہوں اور مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے اس وسیع تر تجربے کی بنا پر کہتا ہوں جو آپ کے ہر نامہ نگار کے مقابل مجھے حاصل ہے کہ ان علاقوں میں اسلام کے نہ آنے کی وجہ سے غلاموں کی تجارت زوروں پر ہے۔ سب سے زبردست سبب یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت کا مطلب اس کے ساتھ غلاموں کی تجارت کا خاتمہ ہوگا۔''

مشرقی افریقہ میں اسلام کے تہذیبی اثر کے سلسلے میں اگلے باب میں زیادہ تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس سے پتا چلے گا کہ کتنے ہی ممتاز علماء ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہیں۔

قرآن کا ایک نہایت جامع حوالہ اس امر کی بابت ہے کہ کس طرح ایک مسلمان راستباز بن سکتا ہے۔ اس سلسلے میں غلاموں کے آزاد کرنے کو سخاوت کا قابلِ قدر ذریعہ بتایا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے ——

''یہی نیکی نہیں کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف اپنا منہ پھیرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ اور روزِ قیامت اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان

لائے ـــــــ اور اس کی محبت میں رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مانگنے والوں اور غلاموں کو چھڑانے کے لیے مال و دولت دے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے اور جو کیا ہوا عہد پورا کرنے والے ہیں اور جو تنگ دستی اور بیماری اور لڑائی میں صبر کرنے والے ہیں ـــــــ یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ جو پرہیز گار ہیں۔" (سورۃ ۲، آیت کریمہ ۱۷۷)

صدیوں پاکباز مسلمانوں نے غلامی سے متعلق قرآنی احکام پر چلنے کی سعی کی۔ اسلام کے ایک ممتاز اور معروضی طالب علم لارڈ ہیڈ لے نے ان احکام کو ملخص کیا ہے۔ لارڈ ہیڈ لے یوں رقمطراز ہے ـــــــ

"اسلامی تعلیمات بالیقین غلامی کو برا کہتی اور اس کے خاتمے کا قصد کرتی ہیں۔"

اسلام اور تمیز رنگ و نسل اس میں رنگ کی تمیز نہیں۔ اکثر اہلِ مغرب کے لیے حقیقت کا یہ بیانِ سادہ بمشکل قابلِ یقین ہے لیکن یہ درست ہے۔ مسلمان دنیا میں نسلوں کی کثرت کو اللہ کی تخلیقی قوت کا مظہر گردانتے ہیں۔

"زمینوں اور آسمانوں کی پیدائش اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا اختلاف اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ بے شک یہ جاننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔" (سورۃ ۳۰، آیت کریمہ ۲۲)

اگر تمام نسلیں مساوی طور پر اس کی نشانیوں میں سے ہیں تو پھر کسی قسم کا نسلی امتیاز ناقابلِ یقین ہو جاتا ہے۔ سب لوگ اللہ کے ہیں، کچھ بھی کسی کا رنگ سہی سب کو اللہ نے کاملاً تخلیق کیا ہے۔ قرآنِ مجید میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے ـــــــ

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی آسمان سے پانی نازل کرتا ہے اور پھر ہم اس کے ذریعے سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کرتے ہیں اور پہاڑوں میں سفید اور سُرخ اور مختلف رنگوں کے اور کالے کوؤں کے رنگ والی لکیریں ہوتی ہیں۔ اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگوں والے ہوتے ہیں۔ بے شک اللہ کے بندوں میں وہی اس سے ڈرتے ہیں جو عالم

ہیں۔" (سورۃ ۳۵، آیت کریمہ ۲۷، ۲۸)

اسلام میں رنگ و نسل کی تمیز کے فقدان نیز دوسری قوموں کے رواجوں اور عقیدوں کے بارے میں مسلمانوں کی رواداری ان اسباب میں سے ایک ہے جس سے اسلام ان علاقوں میں تیزی سے گھر کر گیا جو بصورتِ دیگر وقت گزرنے پر اپنے فاتحین کے خلاف بغاوت کر دیتے۔

محمد ﷺ نے اپنا ضابطۂ اخلاق ان لوگوں میں قائم کیا جن کے قبائلی مذہب اور مسلک مقامی طور پر محدود اور قبلِ تہذیب کے تھے۔ یہ حیرت خیز سُرعت سے پھیل گیا اور اس نے جذب و کشش کی بے پناہ قوّت کا مظاہرہ کیا۔ نہایت مختلف نسلوں ــــــــ سفید، زرد اور سیاہ رنگتوں اور نہایت مختلف عقیدوں اور ضابطوں کے لوگ اس کے سامنے ہتھیار ڈال کر رہ گئے اور اس کی آغوش نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس نے نسلی تعصبات اور قومی جذبات ہلاک کر کے سب لوگوں کو بلاچون و چرا قبول کیا۔ اس نے ذات پات کا قلع قمع کیا، رنگ کی تمیز نظر انداز کی اور وہ تمام دیواریں گرا دیں جو آدمی کو آدمی سے الگ کرتی تھیں۔ عرب آزادی سے حبشیوں اور زرد رو اقوام، اہلِ ملایا، منگولوں اور تاتاریوں سے گھل مل گئے۔ یہ درست ہے کہ نہایت تیز رفتار نے اسلام کی اشاعت جزوی طور پر اس کے دستور کی سادگی اور پابندیوں کی بجائے نسبتاً سادہ نوعیت کے طفیل تھی۔ انھی وجوہ سے یہ موثر طور پر سب کو بھایا۔ اس کا ضابطہ اتنا اونچا نہ تھا کہ آدمی کی اس تک رسائی ہی نہ ہو اور اس کی پابندیاں اتنی دُور از کار اور غیر حقیقی نہ تھیں کہ عام نوعِ انسانی کو موثر اپیل نہ کر سکیں۔ سب سے بڑھ کر اس کی کامیابی کا سبب یہ تھا کہ اس نے تمام نومسلموں کو ایک حقیقی مساوات سے نوازا۔ خدا کی نظر میں سب برابر تھے اور ہر قسم کی ذہانتوں کے لیے معاش کے راستے کھلے تھے۔ اس طریقے سے مختلف نسل اور کلچر کے متنوع عناصر کے تعلقات کی کثرت اور انسانوں کے اجتماعِ عظیم کی آمد و رفت کے نتیجے میں انسانی پیداوار کی تحریک و ترغیب ملنے میں ناکامی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسلامی نظام کے اس سُرعت سے پھیلنے سے ایسی تہذیب ابھری جس کی ترقی کی رفتار اور جس کے کارناموں کا گرانقدر تنوع ــــــــ دونوں ہی حیرت خیز تھے۔

ڈاکٹر ڈیلا نے اپنی معروف تالیف "OUR PERFECTING WORLD" میں لکھا ہے ــــــــ

"مذاہبِ عالم میں تنہا اسلام رنگ و نسل کی تمیز سے مبرّا رہا ہے ـــــ یہ فراخدلی سے اسلام قبول کرنے والوں کا خیر مقدم کرتا ہے خواہ وہ نیگرو ہوں یا پاریا۔ [1] کسی قسم کی رکاوٹ یا امتیاز کے بغیر جس طرح یہ انہیں داخلِ مذہب کرتا اسی طرح اپنے معاشرتی حلقے میں انہیں قبول کرتا ہے اور انہیں حقوق و مراعات دیتا ہے۔ رنگ و نسل کی ساری دیواریں گرا دیتا ہے اور کامل معاشرتی مساوات کی بنیاد پر انہیں ملت میں شریک کرتا ہے۔"

مسلمان دوسرے رنگوں کے لوگوں میں شادی بیاہ کرنے میں جس طور آزادی محسوس کرتے ہیں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سر ولفریڈ بلنٹ نے دلکش پیرائے میں اظہار کیا ہے۔ موصوف کی کتاب "اسلام کا مستقبل" سے یہ ماخوذ ہے ـــــ

"اسلام کے پاس اولادِ آدم کو دینے کیلئے اتنا کچھ ہے کہ ان کا دل جیتے بغیر نہیں رہ سکتا ـــــ یہ اس سے زیادہ ہے جو عیسائیت یا یورپ کی ترقی سے کسی صورت مل سکتا ہے۔ عیسائی مُبلّغ افریقہ میں ڈھیرے ڈھیرے اپنا راستہ بناتا ہے۔ اسکے پاس اگلی دنیا کے سوا افریقہ کے کالوں کو پیش کرنے کیلئے سچی اخوت نہیں۔ وہ حال کے بارے میں کوئی تاثر نہیں دیتا اور جسے عیسائی بنانے چلا ہو اسکے وقار کا احساس نہیں رکھتا۔ کون عیسائی مبلغ کسی نیگرو عورت کو بیوی بنانے پر تیار ہوگا یا کسی نیگرو مرد کے ساتھ کامل مساوی حیثیت سے بیٹھے گا لیکن مراکش کا مسلمان مبلغ مختلف بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ نیگرو سے کہتا ہے، آؤ اور میرے ساتھ بیٹھو! اپنی لڑکی مجھے دو، میری لڑکی تم لے لو! وہ تمام لوگ جو اسلام کے اصول کا اعلان کرتے ہیں، اس دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ غلام تک اسلام قبول کرتے ہی وقار حاصل کر لیتا ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ وسطی افریقہ کو اسلام کا ورثہ شمار کرنا پڑے گا۔"

---

[1] تامل زبان میں اسے پارائن کہتے ہیں جس کے معنی ڈھول بجانے والا ہے۔ یہ لوگ جنوبی ہند اور برما کی نیچی ذات کے لوگ ہیں۔ ہندوستان میں اونچی ذات کے ہندوؤں (برہمنوں اور کھشتریوں) نے ان لوگوں کو پامال کیا اور معاشرے میں کمتر درجہ دے کر اچھوت بنا دیا۔ (مترجم)

افریقہ کا ایک نامور برطانوی ناظم سرایلن برنز آپس کے شادی بیاہ کے بارے میں قریب قریب ایسی ہی بات کہتا ہے۔ رنگ و نسل کی عصبیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یوں اپنی شہادت پیش کرتا ہے ـــــــ

"بیان کیا گیا ہے کہ امتیاز اور اختصاص کے سلسلے میں اسلام کا ریکارڈ عیسائیت سے بہتر ہے۔ اسلام نے نسلی تعصبات اور قومی جذبات کا قلع قمع کیا، ذات پات کی تمیز ختم کی، رنگ و بو کو نظر انداز کیا اور ہر وہ رُکاوٹ دور کی جو آدمی سے الگ کرتی تھی۔ اہم تربات یہ ہے کہ مختلف نسلوں اور قوموں کے مردوں اور اُن کی عورتوں کے درمیان جو دیواریں حائل تھیں وہ ڈھادیں۔ فاتح مسلمان تمام قوموں کی عورتوں سے شادی بیاہ کرتے اور اپنی لڑکیاں کالے مسلمانوں کو دیتے۔"

ایک عیسائی مشنری ڈبلیو ولسن کیش اپنی کتاب THE EXPANSION OF ISLAM میں سرولفریڈ بلنٹ کے ریمارکس کی توثیق کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے ـــــــ

"اسلام اپنے لوگوں کو ایسا وقار دیتا ہے جو اسی سے مخصوص ہے۔
اسلام کی ایک زبردست دل کشی براہِ راست خدا تک رسائی پانا ہے ......
برتری کا پورا پورا احساس رکھتے ہوئے بھی نسلی تمیز کا شکار نہیں۔"

روحانی اور نسلی مساوات کا یہ عقیدہ صحیح طور پر افریقی نیگرو کے لیے جو معنی رکھتا ہے اسے ایک نامور عقلیت پرست وِن وُڈ رِیڈ نے اپنی کتاب THE MARTYRDOM OF MAN میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ پہلے وہ اسلام قبول کرنے سے قبل افریقہ کے دیہاتیوں کی کسمپرسی کا مفصل طور پر حال لکھتا ہے اور اس کے بعد انقلابِ عظیم کا تذکرہ کرتا ہے جو رونما ہو چکا ہے ـــــــ

"اب ہم قیاس کریں کہ ایک سو سال گزر چکے ہیں اور دوبارہ اس گاؤں کو دیکھیں۔ یہ گاؤں اور گردو پیش کا تمام علاقہ بدل چکا ہے۔ جنگل غائب ہے اور اس کی جگہ دھان کی چمکدار بالوں، بھٹوں والی لانبی لانبی مکا (مکئی)، باجرہ اور جوار کی پکی ہوئی فصلوں کے کھیت بھرے پڑے ہیں۔ بڑے بڑے کھیتوں میں تمباکو کے زرد پھول کھلے ہیں۔ کپاس کی بڑی بڑی جھاڑیاں ہیں اور جھکے ہوئے پتوں میں سے سفید اون جھلک رہا ہے۔ ہمارے سامنے ایک بڑا شہر ہے جس کے اطراف میں مینار ہیں۔ اس کے بھاری بھاری پھاٹک ہیں۔ دن طلوع ہوتا ہے۔ عورتیں روئی کا

نیلا لباس زیب تن کیے اور سر پر اس کی ٹوپی ڈالے ندی پر آتی ہیں۔ مرد گھوڑوں پر سوار نکلتے ہیں۔ ان کے دائیں طرف تلواریں لٹک رہی ہیں اور لال پٹکے باندھے ہوئے ہیں۔ یہ براہِ راست جانگلیوں کی اولاد ہیں۔ ان کے چہرے، ہو بہو نیگرو کے ہیں لیکن تاثر وہ نہیں۔ ان کے آداب سنجیدہ اور پُر وقار ہیں۔ عربی میں ''السلام وعلیکم'' کہہ کر ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ مسجد ہی ایوانِ قانون سازی یا ٹاؤن ہال کا کام دیتی ہے۔ یہاں جو پارلیمانی بحثیں ہوتی ہیں اور مقدمات کی جو سماعت ہوتی ہے اس میں وہی وقار پایا جاتا ہے جو عبادت میں ہوتا ہے...... اگرچہ گاؤں چنداں نظر افروز نہیں تاہم ان کے باسی زیادہ مسرور ہیں اور بہتر حالت میں ہے۔ مالی معاوضہ لے کر تشدد آمیز بددیانتی کے جرائم کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ اب شوہر دوستوں کو پھانسنے کے لیے ان کے گلے میں اپنی بیوی کا پھندا نہیں ڈالتے۔ زنا کاری جرم ہے۔ لوگ جوئے کی میز پر اپنے عزیزوں کو ہار سکتے ہیں نہ اپنے جسم داؤ پر لگا سکتے ہیں۔ شراب کے نشے میں برائی اور جرم پر آمادہ نہیں ہوتے عورتیں گلّے کی شکل میں کسی بڑے سردار سے بیاہی جاتی ہیں اور نہ ان سے باربردار جانوروں اور غلاموں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ بیوی ازروئے قانون شوہر کی محبت میں برابر کی شریک ہے۔ اس امر کی اجازت نہیں کہ نوجوان بیوی کی خاطر بوڑھی بیوی کو چھوڑ دیا یا ذلیل کیا جائے۔ ہر ایک کو عربی میں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ یہاں ایک قابلِ ذکر تبدیلی رونما ہوئی ہے اور تاریخ میں جگہ پانے کے لائق ہے۔ مسلمانوں نے یورپ کے برابر نیگرو نگر، بنا دیا ہے۔ یہ دیس صرف بحیرۂ روم اور نیل تک ہی محدود نہیں، یہ صحرائے اعظم کے نخلستانوں اور براعظم کے اس حصے میں بھی ہے جسے ہم دریائے نائیجیر[1] کا پلیٹ فارم کہتے ہیں۔''

ای ڈبلیو۔ بلائیڈن نے سیدھے سادے الفاظ میں اس انقلاب کا سبب یہ بتایا ہے ــــــ

---

[1] دریائے نائیجیر مغربی افریقہ کا دو ہزار میل طویل دریا ہے۔ سیرالیون کی سرحد کے پاس سے نکلتا ہے۔ شمال مشرق میں بہتا ہوا جنوب مغرب کو ہو لیتا اور نائیجیریا میں جا کر خلیج گنی میں گرتا ہے۔ (مترجم)

"بلاشبہ افریقہ میں اسلام نے اس لیے ترقی کی ہے کہ اس میں نیگرو کے خلاف جذبۂ نفرت نہیں پایا جاتا۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام نے نیگرو کو کبھی کمتر نہیں سمجھا جیسا کہ بدقسمتی سے عیسائیت کے معاملے میں اکثر ہوا ہے۔"

اپنی کتاب "اسلام ـــــ افریقہ میں" آر۔ بوسورتھ اسمتھ کہتا ہے ـــــ

"یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام نومسلم نیگرو کو قوت، وقار اور خود اعتمادی کا جذبہ عطا کرتا ہے۔ یہ بات ان کے بے دین یا عیسائی ہم وطنوں میں شاذ ہی ملے گی۔"

ڈی۔ جی۔ ہوگرتھ اپنی کتاب THE PENETRATION OF ARABIA (نیویارک، ۱۹۰۷ء) میں دوسرے ملکوں اور رنگ و نسل کے لوگوں پر اسلام کے اثر کے بارے میں اسی طرح اظہارِ خیال کرتا ہے ـــــ

"یہ لوگ (عرب) ابھرتے ہی ایک صدی کے اندر اندر ایسی مملکت کے فرماں روا ہو گئے جو بحراوقیانوس کے ساحلوں سے چین کی فصیلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ مملکتِ روما کے عہدِ عروج کی سلطنت سے بڑی تھی۔ اس بے نظیر توسیع کے زمانے میں مسلمانوں نے اپنے حلقے میں ـــــ مذہب اور زبان میں اتنی غیر ملکی اقوام جذب کیں کہ ان کے زمانے میں اور نہ ان سے پہلے کسی نے جذب کیں۔ یونانی، رومن، اینگلوسیکسن اور روسی بھی یہ کام نہ کر سکے۔"

فلپ ھٹی کے خیال میں مسلمانوں میں حج کا جو دستور ہے اس کے کثیر فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ ہر سال مختلف نسلوں اور رنگوں کے مسلمانوں کو باہم ملنے کی ضمانت دیتا ہے ـــــ

"صدیوں سے یہ دستور اسلام میں مسلسل اتحاد کی بڑی قوت کے طور پر کام کر رہا ہے۔ بھانت بھانت کے مسلمانوں میں یہ موثر ترین مشترکہ رشتہ ہے۔ یہ قریب قریب ہر صاحبِ استطاعت مسلمان کو زندگی میں ایک بار حج کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ دُنیا کے چہار اطراف کی اسلامی برادری کے اس اجتماع کے معاشرتی اثر کے بارے میں بمشکل ہی مبالغہ آرائی کی ضرورت پڑے گی۔ یہ حبشیوں، چینیوں، شامیوں اور عربوں کو ـــــ امیر اور غریب کو، کمتر اور برتر کو مذہب کی مشترکہ اساس پر بھائی چارے اور باہم ملنے جلنے کا موقع دیتا

ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں سے اسلام کو رنگ ونسل اور قومیت کی دیواریں گرانے میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔"[1]

فلپ حتّی نے اوپر جن قوموں کا نام گنوایا ہے ان میں اہلِ فلپائن کو شامل کیا جاسکتا ہے جو اسلام کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے صدیوں کوشاں رہے اور انھی میں ملایا اور انڈونیشیا کے مسلمان بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔ انڈونیشیا خصوصیت سے مختلف نسلوں سے ترکیب پائے ہوئے معاشرے کی شاندار مثال پیش کرتا ہے جہاں اسلام مستقلاً پھیل رہا ہے۔

بیسویں صدی کا عظیم مؤرخ ٹوئن بی مسلمانوں میں نسلی شعور کے مٹ جانے کو اسلام کا غیر معمولی کارنامہ سمجھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے ــــــ

"مسلمانوں میں نسلی شعور کا خاتمہ اسلام کے غیر معمولی کارناموں میں سے ہے اور اس عہد کی دنیا میں یہ امر واقع ہے کہ اس اسلامی وصف کی اشاعت کا شدید تقاضا موجود ہے۔ اگرچہ تاریخ کے دفاتر یہ ظاہر کرتے نظر آتے ہیں کہ انواعِ انسانی کے مسلسل باہمی اختلاط اور پیدائش کے سلسلے میں نسلی شعور استثنائی شکل میں پایا جاتا تھا اور یہ کوئی دستور نہ تھا لیکن موجودہ صورتِ حال کے لیے مقدر ہو چکا ہے کہ نسلی شعور پیدا ہو اور بہ شدت پیدا ہو ــــــ اور وہ بھی ان لوگوں میں جنھوں نے پچھلی چار صدیوں میں متعدد جنگجو قوموں سے مقابلہ کر کے کم از کم سر دست زمین کا سب سے بڑا حصہ حاصل کرلیا ہے۔ اگرچہ بعض دوسرے پہلوؤں سے انگریزی بولنے والے لوگوں کو ماضی کے حوالے سے جانچیں تو یہ انسانیت کے لیے رحمت ثابت ہوئے ہیں لیکن نسلی شعور کے خطرناک معاملے میں اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ان کی بدقسمتی ہے۔ سمندر پار کی نئی دنیا میں انگریزی بولنے والی جن قوموں نے قدم جمائے ہیں مجموعی طور پر اچھی ملنسار نہیں نکلیں۔ انہوں نے اپنے غیر متمدن پیشروؤں کو بالعموم روند ڈالا ہے اور جہاں جنوبی افریقہ کی طرح انھوں نے غیر متمدن آبادی کو زندہ رہنے دیا ہے یا جیسا کہ شمالی امریکہ میں ہوا ہے انھوں نے دوسری جگہوں سے غیر متمدن افرادی قوت درآمد کی ہے وہاں انھوں نے

---

[1] حتّی کی HISTORY OF THE ARABS صفحہ ۱۳۶

ذات پات کے ہلاکت آفرین دستور کے وہ عناصر پروان چڑھائے ہیں جو کئی صدیاں بیت جانے پر ہندوستان میں بھرپور جوبن پر آئے ہیں۔ ذات پات کے نام پر ہمیں اس دستور پر اظہارِ افسوس کرنا آ گیا ہے۔

مزید برآں علاحدگی پسندی ـــــ ہلاکت آفرینی اور فرقوں کو دور دور رکھنے کا متبادل طریقِ کار ہے۔ یہ ایسی پالیسی ہے جو اس فرقے کی زندگی میں داخلی افتراق کا خطرہ ٹال دیتی ہے جو اس پر عمل پیرا ہوتی ہے لیکن اس قیمت پر کہ یوں ملی جلی نسلوں اور الگ تھلگ رہنے والی نسلوں میں کچھ کم خطرناک بین الاقوامی کھچاؤ پیدا نہیں ہوتا۔ بالخصوص جب اس پالیسی کا اطلاق ان پردیسی قوموں کے نمائندوں پر ہوتا ہے جو غیر متمدن نہیں بلکہ ہندوؤں، چینیوں اور جاپانیوں کی طرح متمدن ہوں۔ حالات تو ایسے ہیں کہ انھی کا ستارہ عروج پر ہے جو نسلی منافرت کے دعویدار ہیں۔ اگر رنگ و نسل کے باب میں ان کا رجحان غلبہ پا گیا تو یہ عملاً عالمگیر تباہی کا موجب ہوگا تاہم معاشرتی رواداری کی قوتیں جو سرِ دست روحانی جدوجہد میں ہار جانے والی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ بنی نوع آدم کے لیے زبردست اہمیت رکھتی ہیں ـــــ اور اگر کوئی ایسا اثر بھی بروئے کار آ جائے جو نسلی شعور سے نبرد آزما ہو اور اب تک محفوظ پڑا ہو ـــــ اسے ترازو کے پلڑے میں ڈال دیا جائے تو شاید یہ قوتیں دوبارہ غالب آ جائیں ...... یہ امر قابلِ فہم ہے کہ اسلام کی روح بروقت کمک پہنچائے جس سے رواداری اور امن کے حق میں فیصلہ ہو۔"

سرسی۔ آر۔ ریڈی (پی۔ ایچ۔ ڈی) کو پولیٹکل سائنس اور فلسفے میں مستند سمجھتے ہیں۔ موصوف نے ۱۹۳۴ء میں "ٹوینٹتھ سنچری میگزین" کے مئی کے شمارے میں یہ لکھا ہے ـــــ

"نسلی مساوات کا مدتِ مدید کا مسئلہ اسلام کے سوا کسی مذہبی یا اخلاقی نظام نے حل نہیں ہوا۔ صرف مسلمانوں ہی میں ہم یہ بات پاتے ہیں کہ تمام مومن خواہ وہ کسی نسل یا رنگ کے ہوں مل جل کر کھانے پینے اور شادی بیاہ کے معاملے میں کامل مساوات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ تمام دوسرے سیاسی ضابطوں اور مذاہب میں رنگ و نسل کی چٹان پر دلیل، اخلاق اور روحانیت کے مثالی نظریات پاش پاش کیے گئے۔"

رنگ و نسل کی نسبت اسلامی رجحان کا مختصر جائزہ ختم کرتے ہوئے ہم اسلام کے ابتدائی ایام سے رجوع کریں اور ان سیدھے سادے اور راستبازی کے واقعات میں سے ایک کو لیں جو اسلامی تعلیمات ہمارے ذہنوں میں واضح کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک حبشی عورت کے لڑکے سے تعلق رکھتی ہے جو جلیل القدر خلیفہ ہارون الرشید کا نصف بھائی تھا۔ ۸۱۹ء میں ابراہیم نامی حبشی لڑکا بغداد میں خلیفہ بن بیٹھا لیکن اس کے بھتیجے المامون نے اُسے معاف کر دیا۔

ابراہیم نے خلیفہ سے جو ملاقات کی اس کا حال بدیں الفاظ بیان کیا ——

''معافی ملنے کے بعد میں المامون سے ملا تو اس نے مجھ سے کہا —— ''کیا تم ہی حبشی خلیفہ ہو؟'' —— اس پر میں نے کہا: ''امیر المومنین! میں ہی وہ ہوں جسے آپ نے معاف کر دیا ہے۔ برن حشس کے غلاموں نے کہا ہے: ''جب لوگ شیخی بگھاریں تو حشس کے قبیلے کا غلام پیدائش اور قسمت کی خرابی کو اپنے اشعار سے دور کر لے گا۔ میں غلام سہی لیکن ارفع فطرت کی بدولت میری رُوح آزاد ہے۔ میرا تن کالا ہے لیکن میرا دماغ خوبصورت ہے۔''

المامون نے جواباً کہا: ''چچا! میرے ذرا سے مذاق نے آپ پر سنجیدگی کی کیفیت طاری کر دی ہے۔ پھر یہ اشعار پڑھے، کالی کھلڑی ذہانت و فطانت کی تذلیل کرتی ہے نہ عالم اور دانشور کی قدر و منزلت گھٹاتی ہے۔ تاریکی تمھارے تن کی سیاہی کا دعویٰ کرے میں تمھاری خوبصورت اور تابدار روح کا دعویدار ہوں۔'' یہی الفاظ —— ''تاریکی تمھارے تن کی سیاہی کا دعویٰ کرے، میں تمھاری حسین اور تابدار روح کا دعویدار ہوں۔''

اس باب کے خاتمے کے لیے موزوں ہیں جو اسلام میں رنگ و نسل کے کامل فقدان سے متعلق ہے۔

●

اسلام اور جمہوریت

لفظ ''ڈیموکریسی'' (جمہوریت) یونانی لفظ ''ڈیموس'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ''لوگ'' (جمہور)۔ چیمبرز ٹوئینٹیتھ سنچری ڈکشنری میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے ـــــــ

''ایسی طرزِ حکومت جس میں اقتدارِ اعلیٰ اجتماعی طور پر لوگوں کے پاس رہے۔ جسے وہ خود یا اپنے مقرر کیے ہوئے حکام کے ذریعے استعمال کریں۔''

اس کا یہ مطلب ہے کہ جمہوری ریاست میں تمام بالغ آدمی جو ذہنی طور پر صحت مند ہوں حکومت کے معاملات پر اظہارِ رائے کا مساوی حق رکھتے ہیں اور جب لوگوں کے لیے براہ راست حکومت قائم کرنا گنتی کے اعتبار سے ناممکن ہو تو اپنی جانب سے بولنے کیلئے اپنے نمائندے چن لیں۔ بہر صورت جمہوریت کی بنیاد لوگوں کی مساوات کے نظریے پر رکھی جائے۔ حقوقِ انسانی کے اس حصے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام اس اصول کی نگہداشت کتنے پُر جوش انداز سے کرتا ہے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ابتدائی ایام ہی سے

ـــــــ کس قدر منصفانہ طریقے سے ذمّیوں اور مہاجروں سے سلوک کیا گیا۔
ـــــــ کس طرح عورتوں کے حقوق کی حفاظت کی گئی اور
ـــــــ کس طور اسلام نے غلامی کی بیخ کنی کی ترغیب دلائی۔

اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ قرآن مجید نے مسلسل ایک حقیقت پر زور دیا ـــــــ کہ اللہ کی نگاہ میں سب آدمی مساوی پیدا ہوئے ہیں۔ ان عناصر کی موجودگی میں جمہوریت کے سوا کسی دوسری قسم کی حکومت معرضِ وجود آ سکتی ہے؟ فی الحقیقت اسلام ہی پہلا مذہب ہے جس نے جمہوریت کی تبلیغ کی اور اس پر عمل کیا۔ پروفیسر بریلفالٹ نے لکھا ہے ـــــــ

''تمام انسانوں کی آزادی، انسانی اخوت، قانون کی نظر میں سب

آدمیوں کے مساوی ہونے، مشورے اور سب کے حق رائے دہی کے مثالی تصورات ہی نے انقلاب فرانس اور "ڈیکلریشن آف رائٹس" کو ہوا دی، امریکی آئین بنانے میں رہبری کی اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں آزادی کی جدّ وجہد کو بھڑکایا ـــــــ لیکن یہ مثالی تصورات مغرب کی ایجاد نہ تھے۔ ان کا منبع و محرک اور سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ یہ ازمنۂ وسطیٰ کے دانشوروں کی اس عقل و خرد کا لب لباب ہے جو انھوں نے کئی صدی میں مختلف راہوں سے ـــــــ اسلامی اندلس، صقلیہ (سسلی) اور صلیبی سپاہیوں نیز ان مختلف انجمنوں سے حاصل کی جو یورپ میں صلیبی جنگوں کے دوران میں اسلامی اخوت کے تعلقات کی نقالی میں پروان چڑھیں۔ بہت اغلب ہے کہ عربوں کے بغیر نئے یورپ کی تہذیب کبھی رونما نہ ہوتی اور وہ کردار اختیار نہ کرتی جس کے باعث یہ ارتقاء کے تمام گزشتہ مرحلوں سے بالاتر ہو سکی۔"[1]

ایک اور یورپی پروفیسر اہل ہنگری ڈاکٹر جرمینس اس بات پر مُصر ہے کہ جدید جمہوریت نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے اسلام کے بنیادی اصول اس پر کہیں زیادہ فائق ہیں۔ ڈاکٹر جرمینس نے لکھا ہے ـــــــ

"مذہب کے طور پر اور معاشرتی ڈھانچے کی صورت میں اسلام کی تشکیل سچے جمہوری اصول پر ہوئی ہے۔ قرآن میں لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے اور لوگوں ہی کے مفاد اور انھی کی نجات کی خاطر عبادات اور عقائد کے سلسلے میں مومنوں پر احکام نافذ کیے گئے ہیں۔ پیدائش یا مخصوص لگن کی بنا پر ایسا کوئی ممتاز گروہ نہیں جو پامال انسانوں اور ذرے سے بنے ہوئے عوام پر حکومت کا مجاز ہو بلا۔ ہر فرد ـــــــ مرد اور عورت عبادت، فرض اور حق کے معاملے میں براہ راست خدا کے حضور میں کھڑا ہوتا ہے۔ مومن دل سے نماز ادا کرتا ہے اور اگر وہ باجماعت نماز پڑھتے تو امام ایسا شخص ہوتا ہے جو سب سے بڑھ کر عالم ہونے کے باعث سب سے زیادہ محترم ہوتا ہے۔ جدید جمہوریت ابھی پوری طرح اسلام کے بنیادی اصول تک نہیں پہنچی۔"

---

[1] THE MAKING OF HUMANITY صفحات ۱۹۰ تا ۱۹۲

مندرجہ بالا پیراگراف میں ڈاکٹر جرمینس نے اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت کے بنیادی فرق پر انگشت نمائی کی ہے۔ مغربی جمہوریت میں مذہبی عنصر مفقود ہے۔ امریکی بڑے طمطراق سے "حکومت عوام از عوام اور برائے عوام" کا ذکر کرتے ہیں لیکن اسلام میں جمہوریت جو شکل اختیار کرتی ہے وہ حکومت الٰہی ہے جسے اس کی مخلوق اپنے مفاد کے لیے احکام الٰہی کی رو سے بروئے کار لاتی ہیں۔ اسلام میں اقتدار اعلیٰ ہمیشہ بالا انجام لوگوں میں نہیں، اللہ میں رہتا ہے۔

اسلام اور پروہتی راج۔ (PRIESTHOOD — مذہبی اجارہ داری) اسلامی جمہوریت ہرگز ہرگز تھیوکریسی نہیں [1]۔ چونکہ اسلام پروہتی نظام کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا اس لیے تھیوکریسی [2] (پروہتی راج) مسلمانوں کے معاشرے میں پروان نہیں چڑھ سکتی۔ ایک بار پھر پروفیسر جرمینس کا حوالہ دیا جاتا ہے ـــــــ

"اسلام کبھی مرکزی کلیسا (مذہبی ادارے) یا پیشہ ور پادری کی زنجیروں میں نہیں جکڑا گیا۔ اسلام کسی حکمران فرقے کو نہیں مانتا، زمین پر اللہ کی جانشینی کے کسی مطلق العنان دعویدار کو گوارا نہیں کرتا ـــــــ اقتدار صرف لوگوں میں، امت میں پوری روحانی ملت میں ہوتا ہے۔"

وہ اخلاقی اصول جو فی نفسہ اسلام میں پایا جاتا ہے اس طرز عمل کو عیاں کرتا ہے جس سے ہر مسلمان کی روزمرہ کی زندگی الہام کے تانوں بانوں سے پوری طرح گتھی ہوئی ہے۔ مغرب میں اقتصادی دائرے کے اندر یورپی معاشرے کو جنم دینے کی کوشش میں جمہوریت کا تصور کسی طلب یا طوائف الملوکی کے ذریعے پیدا نہیں ہوا ـــــــ یہ اقتصادی مواقع کی توسیع کے طور پر بھی

---

[1] پریست ہڈ یہودیوں، ہندوؤں اور بعض دوسری قوموں میں مروج ہے۔ ہندوؤں میں برہمن اور عیسائیوں میں پادری پیشہ ور گروہ کی صورت میں مقتدر اور مذہب کے اجارہ دار ہیں۔ مذہبی تعلیمات، عبادات اور رسومات کے ذمہ دار ہیں۔ ان کے تعاون اور ان کی رہنمائی اور سرپرستی کے بغیر کوئی شخص مذہبی زندگی اختیار نہیں کرسکتا۔ خلاف ازیں اسلام میں ہر شخص اپنے اعمال کا مختار ہے۔ ہر مسلمان ذاتی اور انفرادی طور پر بلاشرکت غیرے اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس لیے ہر سچے مسلمان کے لیے مذہب سے کماحقہٗ آگاہ ہونا، مذہبی اعتبار سے خودکفیل ہونا، اپنی سوجھ بوجھ سے اپنے اعمال سنوارنا اور اپنا کردار سدھارنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حشر کے دن کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ ہر آدمی تنہا ہوگا اور صرف اس کے نیک اعمال اس کے آڑے آئیں گے۔ (مترجم)

[2] ایسی حکومت جس کو پروہت پادری ایسے خدائی نمائندے تشکیل دیں اور اسے چلائیں۔ (مترجم)

ذہن میں نہیں آیا بلکہ یہ تو شدید روحانی عقیدے کا قدرتی اور مادی رنگ میں اظہار تھا۔ ایک طرف تو یہ لادینی اسلوب میں روحانی توحید کی ترجمانی کی کوشش تھی اور دوسری طرف اسی کے ساتھ لادینی حکومت کو بھی اسلام کے موروثی مثالی تصورات سے علاحدہ نہیں کیا گیا۔ یہ ایسی لادینی حکومت ہے جو آدمی کی روحانی مساوات کی بنیاد پر قائم ہے —— سیاسی جمہوری کی تاریخ میں یہ اشتراکِ عمل کی بے نظیر مثال تھی۔ اسلامی جمہوری حکومت آدمی کو تمام دوسری زیادہ انتہا پسندانہ اور تشدد انگیز حکومتوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

<u>انفرادی ذمہ داری اسلام میں فی نفسہ موجود ہے</u> چھ برس کی عمر کے بعد مسلمان جان لیتا ہے کہ وہ اپنے نیک و بد اعمال کا براہ راست ذمہ دار ہے اور اس کی نجات اس کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ روحانی اور دنیاوی امور میں اس کی رہنمائی کے لیے قرآن مجید، شریعت اور حدیث موجود ہے لیکن رہبری پانے کی ذمہ داری ہمیشہ اس پر رہے گی۔ اللہ اور مسلمان کے درمیان کوئی پروہتی نظام PRIESTHOOD حائل نہیں۔ وہ خود براہِ راست، ذاتی طور پر آزادی سے خدا سے رابطہ قائم کرتا ہے۔[1] اسلام اس ذاتی ذمہ داری کو ایسا لازمی وصف سمجھتا ہے جو آدمی کو اللہ کی دوسری مخلوقات سے ممیز کرتا ہے اور قرآن ہر دم مسلمانوں پر زور دیتا ہے کہ وہ بھرپور انداز سے اپنی فطرتی صلاحیتوں کو ترقی دیں اور احساسِ ذمہ داری بدرجۂ اتم پیدا کریں۔ ایک عربی مقولہ ہے —— ''جس نے اپنی ذات کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا'' اور بروئے اسلام ہر وہ شے جو حقیقی مقصد کے لیے شخصیت کے پنپنے میں مدد دے وہ نیک ہے اور قابلِ حصول۔

دوسری طرف اسلام خود پرستی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ بس جو بنی نوعِ انسان کے لیے بھی مفید ہے وہ ترقی کی کاوش کے لائق ہے۔ نری خود غرضی بدی ہے اور اس سے احتراز کرنا چاہیے ——

---

[1] مسلمانوں نے عہدِ زوال اور دورِ غلامی میں پیری مریدی کا جو سلسلہ استوار کیا اور جس سے خالق و مخلوق کے درمیان ایک نیا واسطہ کھڑا ہو گیا وہ پریسٹ بندی کی ایک شکل ہے۔ توہمات، بھوت پریت کے تصورات، ملفیات، تسخیرِ جنات، گنڈے تعویذ، دم، جھاڑ پھونک سب اسی پیشہ ورانہ نظام کی ایجادات ہیں۔ اس طرح آدمی نے خدا کا مضبوط اور قابلِ اعتبار سہارا چھوڑ کر کمزور اور فنا پرست سہارے ڈھونڈ لیے اور یوں کوئی بھی اس کا نہ رہا۔ خدا کی ذات پر بھروسہ نہ رہا تو اپنی ذات پر بھی بھروسہ نہ رہا اور یوں وہ اقوال ذول ہو گیا۔ اپنا ایمان کمزور کر بیٹھا۔ (مترجم)

"رہنما وہی ہے جو بنی نوع انسان کے لیے کارآمد ہے۔"

(القرآن سورۃ ۱۳، آیت کریمہ ۱۷)

اور پھر ارشاد ہوا ہے ـــــــ

"جب تک تم دوسروں کی بھلائی پر وہ خرچ نہیں کرتے جو تم رکھنا پسند کرتے ہو تب تک تم راست بازی اختیار نہیں کر سکتے۔" نیز "تمھارا ہمسایہ تم پر حق رکھتا ہے۔"

کسی لحظہ، کسی صورت بھی ایک نیک مسلمان خود کو اسلامی برادری سے الگ تھلگ ہونے کا نہ سوچے۔

<u>اسلام میں اجتماعی ذمہ داری</u> شروع ہی سے مسلمان بنیادی طور پر خود کو ایک ملت، ایک روحانی کنبے کا رکن جانتا ہے۔ یہاں پھر ہمیں ایک حدیث ملتی ہے جو یوں ہے ـــــــ

"تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور تمام میں اللہ کو سب سے پیارا وہ ہے جو سب سے زیادہ اپنے کنبے کا بھلا کرتا ہے۔"

ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ پہلے انفرادی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے سے اسلام کے لیے اجتماعی ذمہ داری کے شعور کی سمت بڑھنا کس قدر فوراً ممکن ہوا۔ جیسا کہ انیسویں صدی کے عظیم سیاست دان چارلس سمر نے کہا ـــــــ

"کسی قوم کی عظمت ان اوصاف میں پائی جاتی ہے جن سے کسی فرد کی عظمت تشکیل پائے۔"

اسلام میں ہر مسلمان اللہ کے سامنے جوابدہ ہے اور اسی جوابدہی کے باعث ہر مسلمان کے سامنے جوابدہ ہے۔ انفرادی حقوق کے ساتھ بطور فرد اپنی ذات کی شناخت ایک دم اس امر کی راہبری کرتی ہے کہ ملت میں کس انداز سے رہے۔ یہی اسکے حقوق و فرائض کو ضائع جانے سے بچاتی ہے۔ آزاد حکومت کی ساری بنیاد ذمہ داری کے اس شعور پر قائم ہے جو اپنی ذات، ملت اور اللہ کے بارے میں ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ بعض اوقات ملت کے تقاضے فرد کے ذاتی تقاضوں پر غالب آجائیں لیکن یہ کبھی قابل فہم نہیں کہ ملت کی قوت منشائے الٰہی پر غلبہ پا سکے گی۔

مثالی صورت میں اسلام کے تحت جماعتی سیاست کی گنجائش نہیں کیونکہ ملت کے تقاضوں کو ہمیشہ مختلف فرقوں کے شور و شغب پر غالب رہنا چاہیے۔ اس سلسلے میں قرآنِ مجید کا نکتہ واضح ہے۔

''لیکن بنی نوع آدم نے اصول توڑ کر اپنے تئیں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا ہے اور ہر جماعت اسی پر خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔ پس انہیں کچھ دیر کے لیے چھوڑ دو!'' (سورۃ ۲۳، آیات کریمہ ۵۳، ۵۴)

دوسری طرف اشتراکی راج ایسا نظام بھی اسلام میں ناممکن ہے۔ اسلام ہرگز ایسی صورت گوارہ نہیں کر سکتا جس میں فرد اپنی علاحدہ حیثیت گنوا بیٹھے اور اپنے آپ کو اجتماعی معاشرے کے انبوہ میں غرق کر دے۔

اسلام تعلیم یافتہ اور دانشمند معاشرے کا تصور پیش کرتا ہے جو تبلیغ و ترغیب اور تشدد کے بغیر اس امر کے لیے آزادی سے رائے دے جسے وہ اخلاقی طور پر صحیح اور جائز سمجھے۔ ایسا نظام کسی شکل میں مُطلق العنانی حکومت برداشت نہیں کر سکتا۔

اسلام اور مُطلق العنانی اگرچہ ایسے مطلق العنان حکمران ہو گزرے ہیں جنھوں نے اسلام کے نام پر حکومت کی ہے لیکن ان کی حکومت اسلام کے تمام بنیادی اصولوں کے منافی ہے اور انھوں نے ان کی تذلیل کی ہے۔ اسلام ''بادشاہوں کے خداداد حق'' ایسے اصول کا معترف نہیں۔ کوئی راہنما اپنے لیے مذہب سے بالاتر اختیارات کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کوئی مسلمان فرماں روا خود کو قانون سے فائق نہیں سمجھ سکتا۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ ہمیشہ لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ ان سے زیادہ صاحبِ اختیار نہیں اس عورت کی بکریوں کا دودھ دوہتے رہے جس کا خیال تھا کہ خلافت کے لیے منتخب ہونے کے بعد شاید وہ اپنے آپ کو ایسے معمولی کاموں سے بالاتر جانیں۔

خلافت کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنے تاریخی خطبے میں کہا ———

''اگرچہ میں تم سے بہتر نہیں تاہم اب میں تمھارا خلیفہ منتخب کر لیا گیا ہوں۔ راستی پر چلوں تو میرا ساتھ دو، گمراہ ہو جاؤں تو مجھے سیدھی راہ پر لے آؤ! سچ امانت ہے، جھوٹ غداری ہے۔ تم میں سے جو کمزور ہو گا وہ میرے ساتھ توانا ہو جائے گا

تا آنکہ اسے اس کا حق مل جائے گا اور تم میں سے جو توانا ہو گا وہ میرے ساتھ
کمزور ہو جائے گا تا آنکہ اس سے وہ لے لیا جائے گا جو اس پر واجب ہو گا۔
جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو۔
جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تم میری نافرمانی کرو!"

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت سے اس اسلامی نظریے کی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ حاکم لوگوں کا خادم ہوتا ہے۔ اسی باب میں ایک مقام پر آ چکا ہے کہ کس طرح انھوں نے اس قاضی کو ڈانٹ دیا جس نے اپنی نشست خلیفہ کے لیے خالی کرنا چاہی ——— قاضی خانے میں سامعین کے روبرو اس امر کا مظاہرہ کیا کہ وہ کبھی اپنے حاکم کو قانون سے بالاتر نہ سمجھیں۔

حضرت عمرؓ نے بڑی خوبصورتی سے اسلامی جمہوریت کا نظریہ اور اس کے خدوخال یوں بیان کیے ہیں ———

"عوام یا ان کے نمائندہ سے مشورہ لیے بغیر کوئی شخص خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

حضرت عمرؓ نے ہمیشہ اپنے آپ کو عوام کا راہنما سمجھا لیکن کبھی حکمران نہ سمجھا اور آمر تو کسی طور بھی نہیں۔ خلیفہ بننے پر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا ———

"میں عرب کا مقابلہ اس اونٹ سے کرتا ہوں جسے اپنے ساربان کے حکم پر چلنے کا عمدہ شعور حاصل ہے ساربان کا فرض یہ دیکھنا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر جا رہا ہے۔ میں حلفاً یقین دلاتا ہوں کہ تمھیں سیدھے راستے پر لے جاؤں گا۔"

دوسرے موقع پر حضرت عمر نے ان تاریخی الفاظ میں لوگوں کے سامنے اپنی ذات کے بارے میں وضاحت کی ———

"میں بیت المال سے اسی قدر کا حقدار ہوں جس قدر کسی یتیم کا ولی حقدار ہے۔ اگر میرے پاس دولت آ جائے تو میں کچھ نہ لوں گا۔ میں صرف گزارے کے لائق وظیفے کا حقدار ہوں۔" انھوں نے یہ بھی کہا ———

"تمھاری طرف سے مجھ پر کئی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ میں تمھیں کہتا ہوں کہ مجھ سے انہیں پورا کرنے کا مطالبہ کرو۔ ان میں سے ایک میری

ذمہ داری یہ ہے کہ ناجائز اور غلط طریقے سے بیت المال میں کوئی اضافہ کروں نہ غیر ضروری طور پر، زائد از ضرورت اندھا دھند صرف کروں۔ میری دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ تمھارے وظائف کی رقم بڑھا کر تمھارا معیار حیات بلند کروں اور یہ بھی میری ذمہ داری ہے کہ اجتماعی انداز میں تمھاری سرحدیں، تمھاری جانیں اور تمھاری املاک کو دشمنوں اور حریفوں سے بچاؤں۔ تم نے مجھے جو ذمہ داریاں سونپی ہیں انھیں ادا کرنے کے لیے تمھیں مدد دینے اور تعاون کرنے پر مجبور کروں۔"

پھر ایک اور موقعے پر انھوں نے کہا ——

"تمھارے درمیان میری حیثیت عام آدمی سے بڑھ کر نہیں۔ مجھے اس خیال سے نفرت ہے کہ تم میرے ذاتی واہموں اور میری متلون مزاجی پر میری اطاعت کرو!"

خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ جب ایک قاتل کے ہاتھوں مہلک طور پر مجروح ہوئے تو وہ بھی اپنے پیشرووں کی طرح جمہوری اصول پر قائم رہے۔ ولیم میور اپنی تالیف "خلافت" میں لکھتا ہے۔

"انھوں (لوگوں) نے خلیفہ سے پوچھا کہ آپ اگر وفات پا گئے تو کیا وصیت کریں گے کہ آپ کا بیٹا گدی سنبھالے۔ اصولِ انتخاب پر قائم رہتے ہوئے حضرت علیؓ نے کہا —— "میں اس کا حکم نہیں دیتا۔"

جب سلطان صلاح الدّین بسترِ مرگ پر پڑا تھا تو اس نے ان ولولہ انگیز الفاظ میں اپنے جانشین کو اسلامی تعلیمات سے متاثر کرنے کی سعی کی ——

"میرے بیٹے! میں تجھے اللہ کے حوالے کرتا ہوں جو سب سے بڑھ کر رفعت والا اور خیرِ کُل کا سرچشمہ ہے۔ اس کی رضا پر چلنا کیونکہ اسی میں امن و امان ہے۔ خون بہانے سے گریز کرنا، اس پر بھروسہ نہ کرنا کیونکہ جو خون بہایا جائے وہ کبھی خوابیدہ نہیں رہتا۔ لوگوں کے دل جیتنے کی کوشش کرنا اور ان کی املاک کی حفاظت کرنا کیونکہ انھیں کی خوشنودی کے لیے تجھے اللہ کی جانب سے اور میری

جانب سے جانشین مقرر کیا گیا ہے۔ امراء، وزراء اور روساء کے دل جیتنے کی کوشش کرنا۔ میں عظیم ہوا کیونکہ میں نے شرافت اور مہربانی سے لوگوں کے دل جیتے۔"

بازنطینی دربار سے وابستہ ابتدائی زمانے کے ایک مسلمان سفیر معاذ بن جبل نے ان الفاظ میں اسلام کا جمہوری تصور پیش کیا ——

"ہمارا خلیفہ ہمیں میں سے ایک ہے۔ جب تک وہ ہماری کتاب (قرآن) پر عمل کرے گا اور ہمارے پیغمبر کی سنت پر چلے گا ہم اسے اپنا خلیفہ مانیں گے ورنہ ہم اسے الگ کر دیں گے۔ اگر وہ چوری کرے گا ہم اس کے ہاتھ کاٹ دیں گے۔ اگر وہ زنا کرے گا، ہم اسے سنگسار کر کے ہلاک کر دیں گے۔ اگر وہ کسی کو برا بھلا کہے گا تو اُسے بھی بُرا بھلا کہا جائے گا۔ اگر وہ کسی کو ضرر پہنچائے گا تو اسے معاوضہ دینا پڑے گا۔ اس کی حیثیت ہم میں سے ہر ایک کی مانند ہے۔"

رسول اکرمؐ نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ محض اطاعت کی خاطر کبھی کوئی قائد اطاعت کا حکم نہیں دے گا۔ ایک موقع پر ایک فوجی سالار نے نظم وضبط کی آزمائش کرنے کی نیت سے سپاہیوں کو آگ جلانے اور پھر اس میں کود پڑنے کا حکم دیا لیکن آخری لمحے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ جب رسول اکرمؐ کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے برہم ہو کر کہا، "کسی قائد کی اطاعت ایسے معاملے میں واجب نہیں جو احکام الٰہی کے خلاف ہو۔"

عظیم مسلمان مؤرخ اور فلسفی —— نیز دنیا کے پہلے عمرانیات دان کے نظریے کی رو سے ——

"ایک فرماں روا سب سے پہلے اجتماعی ذہن کا علامتی مظہر ہوتا ہے۔ اس فرماں روا کی عادتاً اطاعت ہونے لگے گی اور پھر وہ لوگوں کا روحانی اور مادی آقا سمجھا جانے لگے گا۔ کچھ مدت کے بعد اگر عوام اپنا اجتماعی شعور گنوا بیٹھیں گے تو شاہی خاندان طاقت کے ذریعے حکومت کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

پس تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ ملّت سے وابستگی کا شعور بیدار رکھیں کیونکہ مطلق العنان حکومت کے خلاف یہی ان کا دفاعی حربہ ہے۔ ان پر یہ بھی واجب ہے کہ دانشمندی سے قائد کا انتخاب کریں۔

اسلام میں قائد کے انتخاب کی ضرورت اگر کسی اہم کام میں ایک سے زائد مسلمان لگے ہوں تو احادیث میں قائد کے انتخاب کی ضرورت کا مسلسل ذکر آیا ہے اور اس نظریے کی توسیعی شکل میں قوم کے قائد کے سلسلے میں قومی خطوط پر انتخاب کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

اس سے یہ بات عیاں ہے کہ لوگ قیادت کے لیے موزوں شخص کے اوصاف جانچنا سیکھیں اور یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے قرآن ہمیشہ مسلمانوں پر زور دیتا ہے کہ پہلے وہ علم و دانش حاصل کریں اور اس کا اظہار کریں۔ اسلامی ریاست میں آدمی اور مرد کو پختہ رائے کا اہل ہونا چاہیئے جیسا کہ قرآن مجید کی آیات کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے ــــــ

"پس یوں ہم ان لوگوں پر الہام واضح کرتے ہیں جو تفکر کرتے ہیں۔" (سورۃ ۱۰، آیت کریمہ ۲۴)

"پس یوں ہم ان لوگوں پر الہام کی وضاحت کرتے ہیں جو شعور رکھتے ہیں۔" (سورۃ ۳۰ آیت کریمہ ۲۸)

ہم نے اس قوم کے لیے تفصیل سے آیتیں بیان کر دی ہیں جو سوجھ بوجھ رکھتی ہے۔ (سورۃ ۶، آیت کریمہ ۹۸)

"وہی نصیحت قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوتے ہیں۔" (سورۃ ۳، آیت کریمہ ۷)

قرآن مجید میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے ــــــ

"اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ سیاسی اختیار ان لوگوں کو دو جو اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہوں اور جب تمہیں آدمیوں میں تصفیہ کرنے کو کہا جائے تو عدل اور مساوات سے تصفیہ کرو۔"

قرآن مجید مسلمانوں پر زور دیتا ہے کہ وہ مشورے کے طریقے پر عمل کریں ــــــ

"اور وہ لوگ جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے۔" (سورۃ ۴۲، آیت کریمہ ۳۸)

"اور ان سے مشورہ لیا کرو ہر امر میں۔" (سورۃ ۳، آیت کریمہ ۱۵۹)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورے کے طریقے پر عمل کرنے کی نصیحت کی گئی۔ قرآن

مجید میں یوں آیا ہے ـــــــ

"پس اللہ کی رحمت سے آپ نے نرمی کا برتاؤ کیا ان سے اور اگر آپ درشت خُو اور سنگدل ہوتے تو وہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ پس ان سے درگزر کرو اور ان کے لیے مغفرت طلب کرو اور ہر امر میں ان سے مشورہ لیا کرو۔ پھر جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر توکل کریں۔ بے شک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

(سورۃ ۳، آیت کریمہ ۱۵۹)

باہم صلاح مشورہ کرنے کو سچے مسلمان کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں آیت کریمہ یہ ہے ـــــــ

"اور وہ لوگ جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے اور ہم جو روزی دیتے ہیں وہ ان میں سے خرچ کرتے ہیں۔" (سورۃ ۴۲ آیت کریمہ ۳۸)

لہٰذا ملتِ اسلامیہ کا مثالی قائد وہ ہے جسے بالغ شعور کے شہری منتخب کریں اور جو ان عاقل شہریوں سے جمہوری خطوط پر مشورہ کرے ـــــــ

قائد اپنے تئیں دیکھے گا کہ وہ مطلق العنان نہیں بلکہ امین ہے ـــــــ اس طاقت کا عارضی امین ہے جو اللہ کی ہے اور جو اللہ نے پوری ملت کو دے رکھی ہے۔ اللہ ہی کائنات کا خالق اور پروردگار ہے اور قائد ہر دم اللہ کی اطاعت کے لیے آمادہ رہے، اس کی راہ میں خود کو نثار کرنے پر تیار رہے اور ضرورت پڑے تو اپنی عارضی طاقت سے دستبردار ہو جائے۔

اسلام اور سرکاری حکام عمال اور دوسرے ناظموں ایسے سرکاری خدام کے معاملے میں بھی یہی قانون صادر ہوتا ہے۔ یہ اصول مؤثر ترین انداز سے اس گفتگو میں ملخص ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ (خلیفہ اول) کے درمیان ہوئی۔ ایک معتبر حدیث نبوی یہ ہے ـــــــ

"روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے سرکاری صیغے کے اعلیٰ عہدوں پر تقرر

کرنے کے بارے میں رسول اکرمؐ سے اسلامی اصول دریافت کیے۔ رسول اکرمؐ نے جواب میں فرمایا ــــــ

"یہ اعلیٰ عہدے ان کے لیے ہیں جو ان کی امنگ نہیں رکھتے، ان کے لیے نہیں جنھیں ان کی ہوس ہو۔ یہ ان کے لیے ہیں جو ان سے بھاگتے ہوں اور ان کے لیے نہیں جو انھیں پانے کی غرض سے لڑتے جھگڑتے ہوں۔ یہ ان کے لیے ہیں جنھیں یہ بے طلب پیش کیے جائیں اور ان کے لیے نہیں جو اپنا حق سمجھ کر ان کا دعویٰ کریں۔"

الختصر سرکاری ملازمت کے بارے میں سمجھنا چاہیئے کہ ملت کی بھلائی کے لیے ہے اور اپنی بہتری کا خیال تک دل میں نہ لانا چاہیئے۔

<u>نماز ــــ ایک عظیم جمہوری قوت</u> قرآن مجید میں بار بار آیا ہے کہ تمام مسلمان برابر ہیں۔ پنجوقتہ نماز میں یہی مساوات ایک زندہ حقیقت اور عظیم جمہوری قوت بن جاتی ہے۔

سرسی۔ ایس۔ رام سوامی آئر (نامور ہندو دانشور) نے "ایسٹرن ٹائمز" کی ۲۲ دسمبر ۱۹۴۴ء کی اشاعت میں روزمرہ کی نماز کی قوت کا بدیں الفاظ اعتراف کیا ہے ــــــ

"اسلام کس لیے ہے؟ میری رائے میں تمام صائب الرائے اصحاب کو جاننا چاہیئے کہ اسلام ہی سچا جمہوری مذہب ہے جو آج کی دنیا میں عملاً زندہ ہے۔ ہندو ہوتے ہوئے میں ہندو مت پر بہ استقلال قائم ہوں۔ پھر بھی میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔ اپنے بنیادی فلسفے کے باوجود بنی نوع آدم کی وحدت کے بارے میں میرا مذہب اپنے نظریات کو عملی شکل دینے میں کامیاب نہیں ہوا۔ کسی بھی مذہب نے ــــــ کوئی بھی نظریہ رکھتے ہوئے اسلام کی طرح اس حقیقت کا مظاہرہ نہیں کیا کہ خدا اور آدمی کے سامنے آدمی کی وحدت کا لازمی تصور ایک عملی شے ہے اور اسے روزمرہ کی زندگی کا معمول بنایا جا سکتا ہے۔ کوئی مذہبی فریضہ ادا کرنے یا مسجد میں نماز پڑھنے یا باقاعدگی اور سنجیدگی سے مل جل کر کھانے کا خیال آئے تو اسلام میں چھوٹے سے چھوٹا آدمی

بڑے سے بڑے آدمی کے برابر ہے۔ جس گداگر کے تن پر چیتھڑے ہوں وہ اذان دیتا ہے اور سلطان اس پر لبیک کہتا ہے۔"

معزز ہندو خاتون ــــــ سروجنی نائیڈو نے بھی نماز کے جمہوری انداز کے بارے میں یہی نکتہ یوں بیان کیا ہے ــــــ

"اسلام پہلا مذہب تھا جس نے جمہوریت کی تبلیغ کی اور اس پر عمل کیا۔ جب مسجد میں اذان ہوتی ہے تو نمازی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اسلام میں جمہوریت کی پابندی پانچ مرتبہ کی جاتی ہے۔ کسان اور حکمران برابر برابر کھڑے ہو کر سجدہ اور اعلان کرتے ہیں کہ صرف اللہ ہی بڑا ہے۔ اسلام کی اس انفرادی وحدت نے مجھ پر بار بار اثر کیا ہے۔ جو آدمی کو جبلی طور پر بھائی بنا دیتی ہے۔"

آخر میں ہم یورپی نقطۂ نظر کو لیتے ہیں۔ نامور یورپی مصنف، جی۔ ڈی۔ ڈینیسن اپنی کتاب [1] میں لکھتا ہے ــــــ

"ظاہر ہے کہ ایسے کسی گروہ میں اتحاد، استحکام اور شعور پیدا کرنے میں شدید دشواری پیش آتی ہے جو مختلف روایتیں اور نظریے رکھنے والی مختلف قوموں سے تشکیل پائے۔ تمام مورخ اس امر کا اعلان تو کرتے ہیں کہ دنیا پر غلبہ پانے میں اسلام کو جو حیرت خیز کامیابی نصیب ہوئی ہے وہ گروہ میں اتحاد کے شعور کی غیر معمولی وابستگی کے باعث ہے لیکن یہ نہیں بتاتے کہ اسلام میں یہ معجزہ رونما کیونکر ہوا۔ اس میں کلام ہی نہیں کہ اس کا موثر ترین حربہ نماز تھا۔ جب تمام مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، دشت کی تنہائی میں ہوں یا پر ہجوم شہروں کے ہنگامہ خیز اجتماعوں میں مل کر وضو کرتے ہیں ــــــ مکہ کی جانب منہ کر کے سجدہ ریز ہوتے ہیں، خدا کی ثناء اور رسول کی اطاعت میں وہی الفاظ ادا کرتے ہیں تو پانچ وقت کی نمازیں تماشائیوں تک پر چھا جانے والا جو تاثر قائم

---

[1] EMOTIONS AS THE BASES OF CIVILIZATION

کرتی ہیں اور مشترکہ حمد و ثناء اور اظہارِ اطاعت میں نمازیوں کے دلوں میں ذہنی اتحاد کا جو نفسیاتی اثر پیدا کرتی ہیں وہ درحقیقت غضب کا ہوتا ہے۔ محمدؐ وہ پہلا شخص ہے جس نے باجماعت نماز کی عظیم الشان قوت کو تہذیبی اتحاد کے طور پر دیکھا اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اسلام کی قوت بڑی حد تک روزمرہ کی پنجوقتہ نماز کے قابلِ رشک اصول کے سلسلے میں مسلمان کی اطاعت میں پنہاں ہے۔''

افریقہ میں اسلامی جمہوریت کا ارتقاء آج ہم افریقہ میں نئی قوم میں ابھرتی ہوئی اسلامی تہذیب کے نقوش کا سراغ لگا سکتے اور دیکھ سکتے ہیں کہ کس طور اسلام کی ترویج کے ساتھ ساتھ جمہوری اصول پروان چڑھ رہے ہیں۔ بوسورتھ اسمتھ نے اپنی تالیف ''مسلمان ــــ افریقہ میں'' میں لکھا ہے ــــ

''یہ باور کرنے کی وجہ موجود ہے کہ ایک زمانے میں پورے افریقہ میں سب سے بری بُرائیاں پائی جاتی تھیں اور اب بھی یہ افریقہ کے اکثر حصوں نیز ہماری نوآبادیوں اور گولڈ کوسٹ کے نزدیک پائی جاتی ہیں ــــ یہ برائیاں ہیں، آدم خوری، انسانی قربانی اور زندہ بچوں کی تدفین۔ اسلام کے آتے ہی یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئیں۔ یہاں کے باشندے جواب تک پوری طرح یا قریب قریب ننگے رہتے تھے۔ کپڑے ــــ صاف ستھرے کپڑے پہننے لگے۔ وہی لوگ جو نہاتے دھوتے نہ تھے، نہانے دھونے لگے اور وہ بھی کثرت سے کیونکہ قرآن میں نماز کے لیے وضو کرنے کی ہدایت ہے۔[1] قبائلی تنظیم میں وسیع تر بنیادوں پر ایک نئی شے کو جگہ دینے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہیں گے کہ قبائلی قوموں کی شکل اختیار کرنے لگے اور یوں قوت اور قابلیت بڑھنے سے قوموں نے سلطنتیں بنالیں۔ سوڈان اور ملحقہ ملکوں کی سو سال کی تاریخ سے ایسی کتنی ہی مثالیں اخذ کی جاسکتی ہیں۔ جنگ کا

---

[1] اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ صفائی ستھرائی جزوِ ایمان اور داخلِ عبادت ہے۔ وضو کے بغیر نماز ادا ہی نہیں کی جا سکتی۔ یہ نماز کا ضروری حصہ ہے۔ چنانچہ جس توجہ سے نماز ادا کی جاتی ہے اسی توجہ سے وضو کرنا اور طہارت کا خیال رکھنا فرض ہے۔ (مترجم)

انتظام بہتر طریقے سے اور وہ بھی کسی نہ کسی محدود انداز سے ہوا۔ خواہ مخواہ کی لڑائیاں بند ہوگئیں۔ اندھادھند لوٹ مار نہیں ہوئی، جان و مال کی اور بھی زیادہ حفاظت ہوگئی۔ ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسے کھل گئے۔ عمدہ عمدہ مسجدیں بن گئیں جن کی خوب دیکھ بھال کی جاتی۔ مسجدوں میں پانچ وقت اذان ہوتی، ان میں کعبہ رُو محراب ہوتے، امام ہوتے۔ بھوت گھر [1] اور ہولناک سفلی عمل ختم ہوئے، اب ہر جمعے نماز کا اجتماع ہوتا، گاؤں میں اسی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی۔ ایک خدا، ایک قادرِ مطلق، ہمہ دم حاضر خدا اور رحمان و رحیم خدا کی پرستش ہر اس شے کی پرستش پر بے پناہ سبقت لے گئی جس کا یہاں کے لوگوں کو پہلے سبق ملا تھا۔ عربی زبان جس میں مسلمانوں کی مقدس کتابیں لکھی گئیں ایسی زبان ہے جو غیر معمولی طور پر وسیع اور دلآویز ہے۔ ایک بار سیکھنے پر یہ آدھے برِ اعظم کی قومی زبان بن جاتی اور پھر ادبیات کی تمہید بلکہ ادب ہی کا کام دینے لگتی ہے۔ اس کی بدولت قبائلی سردار کی بے محابا حرص و آز کی جگہ تحریری ضابطۂ قانون نافذ ہو جاتا ہے —— یہ بہ نفسہٖ تہذیب و تمدن میں ایک عظیم الشان اقدام ہے۔ صنعت و حرفت اور تجارت کو رواج ملا۔ گُپ چُپ کا کاروبار یا خام جنس کے تبادلے کا اوٹلی طریقہ نہ رہا جس کی نسبت ہمیں ہیرودوطس [2] سے پتا چلتا ہے کہ شروع ہی سے افریقہ میں رائج رہا ہے۔ کوڑیوں، گھونگوں، بارود، تمباکو یا شراب کا بھی چلن نہ رہا جو اب بھی پورے ساحلی علاقے میں تبادلۂ جنس کے اہم پیمانے ہیں۔ ان کی جگہ ایسی مصنوعات سامنے آئیں جن میں خاصی ہنرمندی سے کام لیا جاتا ہے اور ایسی تجارت

1۔ افریقہ کے جادو پرست اپنے بزرگوں کی روحوں سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ ان میں کچھ اچھی اور مہربان روحیں ہوتی ہیں، کچھ بری اور نامہربان۔ روحوں کو مائل کرم رکھنے کی غرض سے لوگ طرح طرح کی ریتوں پر چلتے نیز گنڈے تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے کرتے ہیں۔ بھوت گھر بناتے ہیں۔ یہ ان کے معبد ہیں جہاں روحوں کو منانے اور انھیں ظلم و تشدد سے باز رکھنے کے لیے پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ افریقہ میں اب تک بھوت گھر پوجے جاتے ہیں۔ لوگ اب بھی ہزاروں سال پرانے مسلک —— یعنی دینِ ساحری پر عامل ہیں۔ (مترجم)

2۔ ہیرودوطس میں دوبرو زن "جو ہو سو ہو" ہے۔

شروع ہوئی جس کا انتظام وسیع خطوط پر ہوا تھا۔ ان کے اثر سے نیز اس مستحکم تر حکومت کی بدولت جو اسلام کے جلو میں قیام پاتی ہے۔ بڑے بڑے شہر نمودار ہوئے۔ یہ سب کچھ اسلام سے وابستہ ہے اور اسلام اس کی تحریک دیتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام اپنے نئے پیروکار کو اسی کے لادین اور عیسائی ہم وطنوں میں شاذ ہی ملے۔"

اسی کتاب کے ایک دوسرے پیراگراف میں بوسورتھ اسمتھ نے اس اسلوب کار کا ذکر کیا ہے جو ایرانی و عرب آباد کار اسی اسلامی جذبے کی اسپرٹ کے ساتھ اپنے ہمراہ لائے۔

"دوسرے علاقوں اور مشرقی افریقہ میں بھی اسلام کا سب سے بڑا وصف یہ رہا ہے کہ اس نے بلا امتیاز ہر شخص کو ذہن کی پرورش اور دل کی بات کہنے، فکر کے پھول کھلانے اور اپنی بصیرت افروز نظریاتی دولت اُگلنے پر اکسایا ہے۔ اظہارِ خیال کی آزادی فقط شعر و سخن تک ہی محدود نہ تھی۔ جس نے اس ساحل پر بڑی زوردار اور دلآویز رومانی و رزمیاتی نظموں کی تخلیق کی اور دلی جذبہ تقدس اور ایمان کی تحریک پر مذہبی کام کی تشکیل کی بلکہ بادشاہ اور غلام ہر شخص کی ہمت افزائی کی جاتی کہ وہ عوامی پالیسی سے متعلقہ مسائل پر اظہارِ خیال کرے۔ سب کے سامنے ان حقوق کا ذکر کرے جن کے بارے میں وہ محسوس کرے کہ قوم کے لیے جائز ہیں اور ان زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کرے جن کے بارے وہ محسوس کرے کہ قوم جھیل رہی ہے۔ اس عہد کا لٹریچر نمایاں انداز سے لوگوں کے حریت پسندانہ جمہوری جذبے، نئی بسائی ہوئی بستی سے ان کی محبت، مظالم کے خلاف ان کی نفرت اور تمام مخالفتوں کے باوجود آزادی کے تحفظ کے عزم کی عکاسی کرتا ہے۔ آزادی کا یہ لابدی جذبہ، ذہنی آزادی کی محبت اور آزادی تقریر کا حق پورے مشرقی افریقہ میں اسلام کے نظامِ معاشرت کا گراں قدر متاع ہے۔"

قرآن مجید اور آئین قرآن حکیم میں خصوصی تفصیل کے بغیر اسلامی آئین کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ ان اصول کا خلاصہ بدیں انداز کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اقتدارِ کل اللہ کو حاصل ہے جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ دیکھتا ہے۔

(۲) اقتدارِ الٰہی کسی فردِ واحد کو حاصل نہیں بلکہ پوری ملّتِ صالحہ کو حاصل ہے —— ہر مسلمان مساوی حقوق اور اختیارات رکھتا ہے۔

(۳) حقِ انتخاب اللہ کی مقدس امانت ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنا ووٹ دانشمندی اور سوجھ بوجھ سے بہ احتیاط استعمال کرے —— تاکہ اس کے بھائیوں میں سے سب سے زیادہ راست باز اور قابل فرد اور مخلص حاکم اس کی نمائندگی کرے۔

(۴) راہبروں کے منصب کی طرح انتظامیہ اور عدلیہ کے تمام منصب بھی مقدس امانت ہیں اور جذبۂ اعتماد ہی سے انہیں قبول کرنا اور ان سے عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔

(۵) جماعتی سیاسیات کو لابداً قوم کے مفادِ عامہ کے تابع رہنا چاہیئے۔

(۶) صلاح مشورے کے طریقِ کار کو حکومت کے تمام دوسرے طریقوں پر لابداً ترجیح دینی چاہیئے۔

نسل کی بجائے مذہب کی بنیاد پر سلطنت کا قیام جس طریقے سے اسلامی جمہوریت معرضِ وجود میں آئی فلپ حطی نے اس کا قابلِ قدر خلاصہ پیش کیا ہے وہ لکھتا ہے ——

"یہ اسلامی معاشرہ یا کامن ویلتھ (دولتِ مشترکہ) جسے پیغمبرِ اسلام نے تشکیل کیا اور جس کی بنیاد کامل مساوات اور عوامی عدل پر رکھی گئی —— اقتدارِ الٰہی اس کا اہم اصول تھا۔ یہ دولتِ مشترکہ جس کی اساس اقتدارِ الٰہی تھی ان برائیوں اور بدعنوانیوں سے پاک تھی جو اس ملوکیت یا ری پبلک میں ملتی ہیں جس کی بنیاد عوام پسند اقتدار کے نظریہ پر رکھی جاتی ہے۔ اس اسلامی ریاست کا قانون جیسا کہ روسوں کا نظریہ ہے قوم کی عمومی خواہش کا مظہر نہیں تھا —— یہ کسی مطلق العنان حکمران کی آمرانہ خواہش کی عکاسی بھی نہ کرتا بلکہ یہ لازوال منشائے ایزدی کا مظہر تھا لہٰذا یہ قوانین قطعی طور پر کامل تھے اور ان میں انسانیت کی بہبود کا میلان پایا جاتا تھا۔ اس ملت کی نمایاں خصوصیت اس کا دینی اور نظریاتی اتحاد تھا نہ کہ نسلی اور

قبائلی اتحاد جو اسلام سے پہلے عربوں کا رشتۂ اتحاد تھا۔ عرب کی تاریخ میں یہ پہلا اقدام تھا جس میں معاشرتی تنظیم کی بنیاد نسل کی بجائے مذہب قرار پائی۔ [1]

اسلام کی صلائے عام قاضی نذر الاسلام [2] نے مساوات اور جمہوریت کے اسلامی جذبے کو ان ولولہ انگیز اشعار میں پیش کیا۔

اسلام کی طوطی کا اعلان دنیا کا گشت کرتا ہے
کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا، سب لوگ برابر ہیں
کوئی غلام ہے نہ آقا، حاکم ہے نہ محکوم
اسلام اعلان کرتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے ہیں
غم ہو کہ خوشی، ہم دونوں میں یکساں شریک ہیں
کوئی فرد دنیا کی عمدہ عمدہ چیزیں ذخیرہ نہیں کریگا
اور دیکھو! کچھ لوگوں کی آنکھیں آنسوؤں سے جل رہی ہیں
جبکہ دوسرے لوگ فانوسوں سے اپنی آنکھیں روشن کررہے ہیں
کیا گنتی کے چند لوگ دولت میں کھیلیں گے جبکہ عوام بھوکوں مررہے ہونگے
یقیناً اسلام میں ایسا کبھی نہیں ہوا!

(قاضی نذر الاسلام)

---

1. بحوالہ حتی HISTORY OF THE ARABS صفحات ۱۲۱۔۱۲۲

2. بنگال کا قابل صد فخر مسلمان سپوت جس نے آزادی کے نغموں سے ہند کے غلاموں کے دل جھنجھوڑے اور ان کے بخت خفتہ کو بیدار کیا۔ (مترجم)

اسلام اور بین الاقوامیت

آج متعدد آزاد مسلم ممالک میں خود مختار ریاستیں قائم ہیں جن کے اپنے اپنے قومی مفادات ہیں۔ان میں سے ہر ریاست قوم سے برتر ایک یونٹ کا حصہ ہے کیونکہ تمام مسلمان خواہ وہ کسی بھی قومیت کے ہوں بین الاقوامی اسلامی برادری کا حصہ ہیں۔پورے قرآن مجید میں قومیت سے بالاتر اخوت پر زور دیا گیا ہے۔

بین الاقوامیت کی روح اسلام کے خمیر میں ہے۔یہ تو اسی اسلامی عقیدے کی قدرتی توسیع ہے کہ تمام مسلمان ایک ہی روحانی اور مادی (لادینی اور دنیاوی) معاشرے کے مساوی درجے کے ارکان ہیں۔اسلام بلکہ اس سے بھی آگے جاتا ہے کہ اللہ کی نظر میں تمام انسان بلا امتیاز نسل و مذہب مساوی حیثیت سے پیدا کیے گئے ہیں۔لہٰذا قرآن مجید تمام دوسری نسلوں کے رواجوں اور مذہبوں سے کامل ترین انداز کی رواداری برتنے پر زور دیتا ہے۔اس کا یہ مطلب ہوا کہ صرف اسلامی ممالک کے درمیان ہی محدود قسم کا بین الاقوامی تعلق قائم نہیں ہوتا بلکہ اس میں دنیا کے تمام ملک شامل ہو جاتے ہیں۔درحقیقت قرآن مجید میں تیرہ سو سال پہلے اقوام متحدہ کے مثالی نظریات وضع کر لیے گئے تھے۔

آیئے! پہلے اخوتِ اسلامی کا مطالعہ کریں اور پھر بین الاقوامی رشتوں کے وسیع تر شعبے کو لیں۔

اخوتِ اسلامی رسولِ اکرم ﷺ نے بہ نفسِ نفیس اسلامی اخوت کی اساس اپنے آخری خطبے میں رکھی جو آپ نے ۸ ذی الحج (بمطابق ۶۳۲ شمسی) کو ارشاد فرمایا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں ——

"اے لوگو! میری بات سنو! تمہاری جانیں اور تمہاری املاک ایک

دوسرے کے لیے متبرک ہیں اور ضرر رسانی کے ناقابل تا آنکہ تم اللہ کے حضور پہنچ جاؤ ـــــ لوگو میری بات سنو اور اسے سمجھو! جان لو کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ تم ایک برادری کے رکن ہو۔ ایک کا مال دوسرے پر تب تک حلال نہیں جب تک کہ وہ اپنی مرضی سے اسے مفت نہ دے دے۔ اپنے آپ کو ناانصافی کرنے سے بچاؤ۔ ماضی کی امارت میرے قدموں تلے روندی گئی ہے۔ عرب کو غیر عرب پر کسی قسم کی فوقیت حاصل نہیں اور غیر عرب کو عرب پر کسی قسم کی فوقیت حاصل نہیں۔ سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو زمین کی مٹی سے بنایا گیا تھا۔"

رسول اکرم ﷺ نے اس خطبے میں اتحادِ اسلامی کے موضوع سے متعلق قرآن مجید کے کتنے ہی اقوال سمو لیے مثلاً یہ کہ ـــــ

"تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں ـــــ اور اللہ کے عہد پر متحد ہو کر مضبوطی سے قائم رہو اور غیر متحد نہ ہو جاؤ!"

اسلامی اتحاد کا یہ تخیل کہ یہ قومی وفاداریوں سے بالاتر ہے۔ بدیں الفاظ قرآن میں مذکور ہے ـــــ

"دیکھو! یہ ہے تمھاری اُمت (پیروکاروں کا نظریاتی گروہ) ـــــ ایک اُمت اور میں تمھارا رب ہوں پس میری پرستش کرو!" (سورۃ ۲۱، آیت کریمہ ۹۲)

اور پھر دوبارہ ان شاندار الفاظ میں ذکر آیا ہے۔

"دیکھو بنی نوع انسان! بلاشبہ ہم نے تم لوگوں کو عورت اور مرد کی شکل میں پیدا کیا اور تمھارے قبیلے کنبے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو جان لو۔ اور بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ فرض شناس اور پرہیزگار ہے۔ بلاشبہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔" (سورۃ ۴۹، آیت کریمہ ۱۳)

"اور اللہ کے عہد پر متحد ہو کر مضبوطی سے قائم رہو اور غیر متحد نہ ہو جاؤ اور

یادرکھو اس نے تم پر احسان کیا جبکہ تم باہم دشمن تھے۔ پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ پھر تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے۔ پھر تمھیں اس سے بچالیا۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے آیتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ!" (سورۃ ۳، آیت کریمہ ۱۰۳)

"اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ نیکی کی ہدایت کرتے اور بدی سے روکتے ہیں اور قائم رکھتے ہیں نماز اور ادا کرتے ہیں زکواۃ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ بس یہی لوگ ہیں کہ بے شک اللہ ان پر رحم کرے گا۔ بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔" (سورۃ ۹، آیت کریمہ ۷۱)

اخوتِ اسلامی کے بارے میں مغربی اور ہندو اہلِ فکر کی شہادت متعدد یورپی مصنفوں نے اخوتِ اسلامی کی حقیقت اور قوت کا اعتراف کیا ہے۔ میجر اے۔ سی۔ لیونارڈ نے اپنے ایک مقالے ـــــ "اسلام ـــ اس کی اخلاقی اور روحانی قدر و منزلت" میں لکھا ہے ـــــ

"سچی اور حقیقی اخوت اسلام ہی میں پائی جاتی ہے جو عیسائیت کی بیان کردہ اخوت سے بخوبی لگا کھاتی ہے۔"

ریورینڈ مرے ٹائیٹس بیان کرتا ہے ـــــ

"اخوتِ اسلامی ایک عقیدہ ہی نہیں بلکہ یہ حق ہے، ایک قانونی نظام بھی ہے اور معاشرتی نظام بھی۔ اسلام میں واقعی ایسی اخوت موجود ہے جو رنگ، نسل، طبقے اور قومیت میں اتحاد کا عامل ہے۔"

بھارت کے راجیہ سبھا کے سابق صدر رادھا کرشن نے بھی اسلامی اخوت کی تعریف میں خود کو مغربی مصنفین کا ہمنوا کر لیا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں انھوں نے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا تھا جس کا عنوان تھا "مشرق و مغرب ـــــ مذہب کے معاملے میں" لکھتے ہیں ـــــ

"ہم اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ اسلام کا نظریۂ اخوت نسل اور قومیت کی تمام رکاوٹوں سے بالاتر ہو جاتا ہے ـــــ یہ ایسی خصوصیت ہے جو کسی مذہب میں نہیں۔"

نامور مصنف سر طامس آرنلڈ کے نزدیک حجِ کعبہ اس نظریے کی زبردست عملی صورت ہے۔ لکھتے ہیں ـــــ

"اسلام ہر سال دنیا کے تمام حصّوں سے آنے والے ہر زبان اور ہر قوم کے مسلمانوں کے اجتماع کو اس پاک مقام پر عبادت کا حکم دیتا ہے جس کی جانب وہ اپنے دُور افتادہ گھروں اور مسجدوں میں ہر بار بوقتِ نماز اپنا منہ کر لیتے ہیں۔ کوئی فطین مذہبی پیشوا اس سے بہتر انداز میں اہلِ ایمان کے ذہن میں روز مرہ کی زندگی اور مذہبی رشتے سے ان میں باہمی بھائی چارے کا شعور پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ مشترکہ عبادت کا ایک عظیم عمل ہے ——— یہاں افریقہ کے مغربی ساحل کا نیگرو مشرقِ بعید کے چینی سے ملتا ہے۔ رئیس اور مہذب ترک ملایا کے بعید ترین حصے سے آنے والے غیر مہذب جزیرے کے رہنے والے اپنے بھائی کو پہچانتا ہے۔ عین اسی وقت پوری اسلامی دنیا میں دیس دیس کے مسلمانوں کے دل مکّہ کے مقدس شہر میں جمع ہونے والے اپنے زیادہ خوش نصیب بھائیوں کی پر جوش ہمدردی میں دھڑکتے ہیں وہ عیدالاضحیٰ مناتے ہیں۔ نمازی کسی بھی نسل، رنگ اور مرتبے کا ہو یا اس کا ماضی کیسا ہی کیوں نہ ہو اسے اسلامی برادری میں قبول کر لیا جاتا ہے اور وہ مساوی درجے کے لوگوں میں مساوی درجہ پاتا ہے۔ اسلام ایک زبردست سیاسی قوت ہے۔ جوں جوں کرۂ ارض کے فاصلے سمٹتے جائیں گے زمین کی دوریاں قریب سے قریب تر آتی جائیں گی توں توں دنیا میں اس قوت کا اثر زیادہ سے زیادہ محسوس ہونے لگے گا۔

اسلام تمام دنیا کی برائیوں کا واحد علاج ہے۔ یہ کہہ کر میں کوئی کھوکھلی شیخی نہیں بگھار رہا۔ مغربی ایشیا اور افریقہ میں جو کچھ ہو رہا ہے سوچ سمجھ کر اس کا مشاہدہ کرنے والا اس کی صداقت کا اندازہ کر لے گا۔ یہ اسلام ہی ہے جس میں صحیح اور قابلِ عمل طریقے سے حقیقی مجلسِ اقوام کا تخیل پایا جاتا ہے۔"

ایچ۔ جی۔ ویلز[1] رقمطراز ہے ———

---

[1] بیسویں صدی کا وہ فنکار جس نے سائنس فکشن میں بڑا نام پیدا کیا "غیر مرئی انسان" اور "آنے والے عہد کی صورت اشیاء" اس سلسلے کی بڑی اہم کڑیاں ہیں۔ ویلز نے "مختصر تاریخ عالم" بھی لکھی ہے۔ (مترجم)

"اسلام بلا امتیازِ مذہب و ملت تمام انسانوں کی مساوات اور مسلمانوں کی سچی گھریلو اخوت پر جو زور دیتا ہے اس نے آج کی مہذب دنیا میں اسے ایک عظیم ترین قوت بنا دیا ہے۔"

مارک سائیکس کہتا ہے ——

"اسلام مربوط و مستحکم ہے اور بین الاقوامی بھی۔ سادہ عبادات اور سادہ تر عقائد سے اس کے مضبوط تانے بانے بنے ہوئے ہیں۔

آج بھی اندلسی عرب شیراز میں آکر ایسا گھریلو ماحول پاتا ہے کہ ہسپانوی عیسائی برلن میں یا رومانیہ کا رہنے والا ویانا میں نہیں پاتا۔ اگرچہ قاہرہ میں جرمن زیادہ ہیں، افغان کم ہیں پھر بھی الازہر کے احاطے میں افغان خود کو کم اجنبی پاتا ہے سوہو[1] کے اقامت گھر میں جمونو کا بیرا خود کو زیادہ اجنبی پاتا ہے۔"

اسلام اور اقوام متحدہ ▪ روحانی اخوت سے عالمگیر اخوت یا اقوامِ متحدہ تک پہنچنے کے لیے ذہنی اور جذباتی اعتبار سے چھوٹا سا قدم اٹھانا پڑتا ہے لیکن تہذیب کے ارتقاء کے لیے اس چھوٹے سے قدم کی امکانی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ جیسا کہ عظیم مورخ ٹوئن بی نے ۱۹۵۴ء میں شکاگو میں کہا ——

"بنی نوعِ انسان کو ایک کنبہ بن جانا چاہیئے یا اپنے آپ کو ختم کر دینا چاہیے۔ عالمی قوم کے انسانی شعور کی نشو و نما ہی بقا کی کلید ہے۔ قوم پرستی آج دنیا کو فنا کی طرف لے جا سکتی ہے۔"

یہ عظیم صداقتیں جنھیں قبول کرنے میں مغربی ذہن سخت دشواری محسوس کر رہا ہے تیرہ سو سال پہلے سچے مسلمانوں نے قبول کر لی تھیں۔

ترمذی میں ابوداؤد سے روایت ہے کہ رسول پاکؐ نے ایک مرتبہ اپنے پیروکاروں سے دریافت فرمایا —— "جانتے ہو، نماز، روزے اور خیرات سے بہتر کیا چیز ہے؟" لوگوں نے عرض کیا کہ انہیں اس چیز کے متعلق بتایا جائے۔ رسول پاک نے فرمایا۔ "یہ ہے لوگوں کا اپنے درمیان امن اور اچھے تعلقات قائم کرنا کیونکہ لڑائی جھگڑے اور نفرت کے جذبات نسلِ انسانی کو غارت کر دیتے ہیں۔"

---

1. آکسفورڈ اسٹریٹ کے جنوب میں لندن کا ایک حصہ جو ریستورانوں کے باعث مشہور ہے۔ سترھویں صدی کے آخر سے یہ پردیسیوں کا گڑھ بنا ہوا ہے۔

معلوم ہوتا ہے، امن کا مقصد پانے کی غرض سے قرآن مجید نگران طاقت کا استعمال تجویز کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔

"اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔ پس اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرے اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم سے رجوع کرے۔ پس جب وہ رجوع کرے تو ان دونوں گروہوں میں انصاف سے صلح کرادو، انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ بے شک مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس اپنے بھائیوں میں صلح کرادو اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ (سورۃ ۴۹، آیات کریمہ ۹، ۱۰)

یہاں پھر صلح پسندی اور باہمی گفت وشنید پر سختی سے زور دیا گیا۔ قرآن مجید میں ثالثی اور اعتدال پسندی کی بھی تاکید کی گئی ہے ——

"پس ہم نے تمھیں اعتدال قائم کرنے والی ملت بنایا ہے تا کہ تم نسلِ انسانی کے لیے مثال بن سکو۔"

جوں ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کو ہجرت کر گئے آپ نے دنیا کے اس خطے میں رہنے والی تمام اقوام کی فیڈریشن (وفاق) بنانے کے لیے یہودیوں اور دوسرے غیر ملکی قبائل سے معاہدہ کرلیا۔ اس معاہدے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرائط رکھیں۔

(۱) تمام مسلمان اور غیر مسلم اقوام مدینہ کے دفاع میں مل کر حصہ لیں گی۔

(۲) سب کو آزادی سے اور کھلم کھلا اپنے مذہب کی پیروی اور رسوم کی ادائی کی اجازت ہوگی۔

(۳) مظلوموں کی حفاظت کی جائے گی۔

(۴) خون بہانے، قتل وغارت اور تشدد کی ممانعت ہوگی۔

(۵) سب کو جان و مال سے لطف اٹھانے کی آزادی حاصل ہوگی اور تمام قومیں مشترکہ دفاع اور مشترکہ بھلائی میں ایک دوسرے کی مدد کریں گی۔

بلاشبہ یہاں ہمیں لیگ آف نیشنز کے چارٹر کا نمونہ ملتا ہے۔

۱۹۲۶ء میں پروفیسر سنوک ہرگرونج نے اپنے علمی مقالے (تھیسز) [1] میں اس حقیقت کا اعتراف کیا اور یہ لکھا ——

"لاریب بنی نوع انسان کی مجلس کا مثالی تصور پہلے ہی اسلام میں موجود ہے کیونکہ لیگ آف نیشنز اسی بنیاد پر قائم کی گئی۔ اسلام نے انسانی نسلوں کی مساوات کا اصول اس سنجیدگی سے قبول کیا ہے کہ دوسری قوموں کو اس پر شرم آتی ہے۔"

آج دنیا ایسی عالمگیر قوم کا تقاضا کرتی ہے جس میں آدمی آدمی کے درمیان امتیاز نہ رہے۔ مذہب، نسل اور رنگ کا فرق نہ رہے۔ جس میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، توانا اور ناتواں سب کو یکساں حقوق اور مراعات حاصل ہوں۔ جس میں تمام انسانوں میں اتفاق، امن اور صلح قائم رہے اور کوئی شخص کسی کے حقوق پامال نہ کرے۔ اسلام نے اس سلسلے میں دور تک رہنمائی کی ہے۔

بین الاقوامی قانون دان پروفیسر رافیل کیمکن جس نے نسل کشی کے ضمن میں اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کا مسودہ تیار کیا۔ کامل طور پر اس بیان کی تائید کرتا ہے۔ ۱۹۵۶ء کے "چٹا گانگ اگزیمینر" میں پروفیسر کا ایک مضمون نقل کیا گیا جس میں اس نے اقرار کیا کہ تاریخ کے مختلف مرحلوں پر مسلمان مردوں اور عورتوں بالخصوص بارھویں صدی میں اسلامی ہسپانیہ کی تباہی اور پھر ۱۹۴۷ء میں برِّ اعظیم ہند کی تقسیم کے موقع پر ہولناک تباہی سے اسے تحریک ملی۔ عام عالمی صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے کہا ——

"پچھلے چالیس سال میں کوئی بیس لاکھ انسان نسل کشی کے اقدام میں تباہ ہوئے ہیں۔

قراداد کی اصل شرائط کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر موصوف نے کہا ——

"مسلمانوں کے لیے میں مزید کہوں گا کہ میں نے جس قرارداد کا مسودہ تیار کیا ہے وہ پوری طرح قرآن کے مطابق ہے کیونکہ انسانی علم کے مطابق اسی میں سب سے زیادہ رواداری اور بین الاقوامی شعور والا مذہب مذکور ہے۔ یہودیت اور نصرانیت کے پیغمبروں کو قبول کرنا اور دوسرے لوگوں کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی سے منع کرنا اس دین (اسلام) کی انسان دوستی اور جذبۂ رواداری کی مثالیں ہیں۔"

---

[1] عنوان تھا THE MUSLIM WORLD TODAY

اسلام اور بین الاقوامی قانون اسلام سے قبل حقیقی معنی میں بین الاقوامی قانون ناپید تھا۔ کوتلیہ اور منو[1] نے صلح و جنگ کے جو قوانین وضع کیے وہ صرف ہنود کے لیے تھے اور یونان اور روما کے قوانین ان لوگوں کے لیے تھے جو ان کے مفتوحہ علاقوں میں رہتے تھے۔ لاریب صرف ایک سو سال ہوئے کہ یورپ کے بین الاقوامی قانون نے ۱۸۵۶ء میں جاپان اور ترکیہ کو پہچانا اور مغرب نے غیر نصرانی اقوام سے مل برتنے کے لیے خود کو تیار کیا۔ خلاف ازیں اسلام نے ابتداء ہی سے تمام اقوام کے حقوق پہچاننے میں آمادگی ظاہر کی۔ ہنوز اسلام تنہا تمام اقوام کے حقوق پہچانتا ہے کیونکہ مغرب کے بین الاقوامی قانون کی مانند یہ مہذب اور غیر مہذب میں امتیاز تلاش نہیں کرتا۔

پروفیسر واکر نے اپنی کتاب "اقوام کے قانون کی تاریخ" میں اس امر کا اشارہ کیا ہے کہ بین الاقوامی قانون سے متعلق عربی تالیفات ازمنۂ وسطیٰ کی یورپین یونیورسٹیوں میں اشتیاق سے پڑھی جاتی تھیں۔ اکثر رومن کیتھولک پوپ اور پروٹسٹینٹ لوتھر[2] عربی کے سنجیدہ طالب علم تھے۔ قانون جنگ کے بارے میں ایالہ، وکٹوریہ، جنٹائلز اور گروٹیس کی تمام کتابیں جہاد کے بارے میں سامانی عربوں کی تصانیف کی بنیاد پر لکھی گئیں۔ یاد رہے کہ یونان اور روما میں جہاد وغیرہ کے انداز کی کوئی شے نہ تھی۔ بین الاقوامی قانون بھی یورپ کی تحریکِ احیائے علوم وفنون کی پیداوار ہے اور اس تحریک کو اسلام کے ان اثرات نے جنم دیا جو اسلامی اندلس میں گلفشاں ہوئے اور عیسائیت نے انہیں قبول کیا۔

عربوں کے بین الاقوامی قانون کی بنیاد تلاش کرنے کے لیے کسی کو اسلامی اُندلس سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک بار پھر قرآن مجید میں وہ تمام بنیادی اصول ملیں گے جو آج مروج ہیں۔ قرآن تنبیہا کہتا ہے ـــــــ

> "اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر عمل کرنے کی نیت نہیں رکھتے۔ اللہ اسے بہت ناپسند کرتا ہے کہ تم ایسی بات کہو جس پر عمل نہ کرو!" (سورۃ ۶۱، آیات کریمہ ۲، ۳)

---

[1] کوتلیہ (چانکیہ) اور منو ہندوؤں کے دو عظیم ترین مقنن تھے۔ بھارت میں آج بھی ان کے رسوائے عالم قوانین کی پابندی کی جاتی ہے۔ کوتلیہ نے سیاسی مصلحت کو فریب کی حد تک جائز قرار دیا۔ منو نے انسان کو چار طبقوں (برہمن کشتری، ویش، شودر) میں بانٹا۔ انسانی تہذیب کی تاریخ میں منافرت کی اس سے بدتر مثال کم ہی ملے گی۔ بھارتی ہندو اس لیے بھی مسلمان کا دشمن ہے کہ اس کا مذہب یعنی اسلام طبقاتی تقسیم کا سخت ترین مخالف ہے۔ (مترجم)

[2] مارٹن لوتھر پندرھویں صدی کا جرمن مصلح جس کی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے کہ عیسائیت کی رو سے ہر امر کا تصفیہ کیا جائے۔

عہد و پیمان کا تقدس تمام بین الاقوامی قوانین کی بنیاد لازمی طور سے عہد و پیمان اور معاہدوں پر رکھنی چاہیئے۔ اور اس سلسلے میں قرآن واضح تر انداز سے رہنمائی کرسکتا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے۔

"جب آپس میں عہد کرلو تو اللہ کا عہد پورا کرو اور پکی کرنے اور اللہ کو گواہ بنانے کے بعد اپنی قسمیں نہ توڑو۔ تم جو کچھ کرتے ہو بے شک اللہ اسے جانتا ہے اور اس عورت کی طرح مت کرو جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ کیا تم اپنے معاملات میں دھوکا دینے کے لیے قسمیں کھاتے ہو تا کہ ایک قوم دوسری سے زیادہ دنیاوی نفع حاصل کرے۔ اللہ ان عہد و پیمان اور معاہدوں کے ذریعے تمھیں آزمائش میں ڈالتا ہے اور روز قیامت تم پر وہ بات واضح کردے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔ (سورۃ ۱۶، آیاتِ کریمہ ۹۱، ۹۲)

ذاتی دفاع کا حق قوت کے ذریعے کسی قوم کے دفاعی حقوق کی نسبت بھی قرآن واضح ہے۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں یہ نکتہ اقوام متحدہ کے زیرِ بحث رہا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے ــــــــ

"جو تم سے لڑیں ان سے اللہ کی راہ میں لڑو اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" (سورۃ ۲، آیت کریمہ ۱۹۰)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے" ــــــــ

"جو شخص اپنے دفاع میں لڑتا اور مارا جاتا ہے شہید ہے۔ جو اپنے کنبے کے دفاع میں لڑتا اور مارا جاتا ہے شہید ہے اور جو اپنے مال کے دفاع میں لڑتا اور اللہ کی راہ میں مارا جاتا ہے شہید ہے۔"

خلاف ازیں کسی موقع پر بھی قرآنِ مجید میں مسلمانوں کو جارحیت پر اُکسایا نہیں گیا۔

سفیروں کے حقوق مسلمانوں نے دوسری طاقتوں کے سفیروں اور ایلچیوں کے حقوق پہچاننے میں بھی جلدی کی۔ ان کے عملوں کے تمام ارکان کامل طور پر امن سے بہرہ یاب ہوتے، کبھی ہلاک نہ کیے جاتے۔ کسی طور ان سے بدسلوکی کی جاتی نہ ان کی بے عزتی کی جاتی۔ اگر کوئی سفیر کسی ایسے ملک کے خلاف سازش کرتا جس میں اسے متعین کیا جاتا تب بھی وہ ان مراعات سے

نوازا جاتا۔ جعلی اور کاذب نبی کے سفیروں سے سلوک کا مسئلہ درپیش ہوا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''اگر تم ایلچی نہ ہوتے تو میں تمھارے قتل کا حکم دیتا۔''

خارجہ پالیسی کے اصول اسلامی ریاست کو جس خارجہ پالیسی پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ قرآن اور سنت میں ان کے اصول یوں مرتب کیے گئے ہیں۔

(۱) اسلامی ریاست نہ دوسری ریاستوں کو فریب دینے کی کوشش کرے نہ ایسی ذمہ داریاں قبول کرے جن سے عہدہ برآ ہونے کی نیت نہ رکھے۔

(۲) اپنا عہد نہ توڑے

(۳) اپنے پڑوسیوں پر اشتعال انگیز حملے نہ کرے۔

(۴) اپنے فائدے کی خاطر دوسرے ملکوں میں سازشوں اور بغاوت کی حوصلہ افزائی نہ کرے۔

(۵) ظلم و تشدد کے اقدامات میں کسی دوسری ریاست کی حمایت کرے نہ اس کی حوصلہ افزائی کرے۔

(۶) جب یہ دشمن کو شکست دے چکے تو انتقامی جذبے کی تسکین کے لیے اسے ذلیل کرنے والی چوٹیں نہ لگائے۔ ایک آدمی کا انتقامی اور ذاتی نفرت کا جذبہ ریاست کی ناقص پالیسی کا آئینہ دار ہے کیونکہ یہ دشمنی کو طول دیتا اور آنے والی مشکلات کا بیج بوتا ہے۔

مغربی قومیت لازماً بین الاقوامیت کو جگہ دے گی مغرب میں ایسے مفکروں کا فقدان نہیں جو اس امر کے خواہاں ہیں کہ بین الاقوامیت کی طاقتیں احساس اور سوچ کے پرانے قومی طریقوں کی جگہ لے لیں۔

ایک اشتراکی مفکر ولیم بریڈ نے ۱۹۴۴ء میں لکھا ـــــــ

''نام نہاد (مغربی) قوم پرستی ہی تمام جنگوں کی جڑ بنیاد ہے۔ لہٰذا قوم پرستی کے نظریے اور تخیل کو (جیسا کہ اسلام میں ہے) پاک صاف کر کے سچی بین الاقوامی اخوت میں منتقل کرنا پڑے گا۔ عالمی سیاست کو قوم پرستی نے

ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔"

جرمن مصنف فریڈرک ہرٹز کہتا ہے ـــــــ

"کیسا المیہ ہے! انسانی اخوت کی راہ میں قوم پرستی کا جذبہ یا نام نہاد حبّ الوطنی ہی سب سے بڑی وہ رکاوٹ ہے جس نے لوگوں کو متعدد جیلوں کی طرح ہوا بند کمروں میں قید کر رکھا ہے۔"

جارج اے ڈیزی اور فریڈرک ہرٹز اپنی کتاب "انسانی تصادمات کی بنیادیں" ۱ میں لکھتے ہیں ـــــــ

"میں اپنے امریکی ورثے پر فخر کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے اپنے آدمی ہونے پر فخر ہے۔ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ آج قوم پرستی کا جذبہ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے اور تہذیب اور ترقی کی راہ میں یہی خطرناک ترین رکاوٹ ہے۔"

اسلام میں ـــــ پہلی لیگ آف نیشنز ایک مرتبہ پھر سر طامس آرنلڈ کا حوالہ دیا جاتا ہے ـــــ

"صرف اسلام میں صحیح اور قابلِ عمل طریقے سے لیگ آف نیشنز کے حقیقی تخیل تک رسائی ہوئی۔"

اسلام کے عظیم شاعر اقبال نے بیان کیا ہے کہ کس طور ایک بار پھر اسلام نے عملی اور روحانی حقیقتوں میں ہم آہنگی پیدا کی ہے اور وہ بھی اس انداز سے کہ اس سے لیگ آف نیشنز کا مثالی نظریہ عملی شکل اختیار کر لے۔

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے خدا ہم تک یہ صداقت پہنچا رہا ہو کہ اسلام میں قوم پرستی ہے نہ ملوکیت بلکہ 'لیگ آف نیشنز' کا وجود ہے جو مصنوعی سرحدوں اور نسلی امتیازات کو سہل تذکرے کی خاطر درخورِ اعتناء کرتا ہو نہ کہ اپنے ارکان کے معاشرتی افق کو تنگ کرنے کے لیے۔ اسلام کے

---

۱ FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICTS

نزدیک مثالی اور حقیقی ـــــ دو مخالف و متضاد قوتیں نہیں جن میں ہم آہنگی پیدا نہ کی جاسکے۔ مثالی مقصد کی زندگی اس امر سے قائم نہیں کہ حقیقت سے کامل لاتعلقی رکھی جائے جو زندگی کے حیاتیاتی وجودِ کاملہ کو توڑ پھوڑ کر تضادات میں منتقل کر دے بلکہ یہ تو مثالی زندگی کی دائمی کوشش ہے کہ انجام کار اسے جذب کر لینے، اسے اپنے میں بدل لینے اور اس کے پورے وجود کو منور کرنے کی غرض سے حقیقی زندگی کو موزوں بنائے۔ حقیقی اور مثالی زندگی کے رشتے کو پہچانتے ہوئے کہا گیا ہے: ''زندگی کا حقیقی ضابطہ دریافت کرنے کی غرض سے دنیائے اسباب کو زیر کرنا چاہیے۔''

اسلام کی روحانی بنیاد تمام دنیا کے لیے سرچشمۂ اُمید ہو سکتی ہے کیونکہ وہی جو بین الاقوامیت ہے وہ عالمگیر پیمانے پر وجہ خیر و برکت ہے اور اسلام میں '' آدمیوں کے درمیان امن قائم رکھنے'' سے بڑھ کر موجب خیر اور کیا شے ہے۔

ڈاکٹر آر۔ آر۔ میرٹ نے اس نظریے کی عظمت و اہمیت کو ان الفاظ میں سمو لیا ہے ـــــ

''صحیح ترقی وہ ہے جس سے خیر میں ترقی ہو۔ دوسری تمام ترقیاں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلام میں سخاوت کا مفہوم صرف مفلس اور حاجت مند کو بھیک دینا نہیں۔ اس کا مفہوم اپنے اندر سب کچھ سمو لینا اور جامع ہونا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے کہا ہے ـــــ ہر اچھا کام خیر ہے۔ اپنے بھائی کے روبرو تمہارا ہنسنا سخاوت ہے اور اپنے ساتھیوں کو نیک کام کی تاکید کرنا بھی سخاوت کے برابر ہے۔ کسی بھولے بھٹکے کو سیدھی راہ پر ڈالنا سخاوت ہے۔ اندھے کی مدد کرنا سخاوت ہے۔ سڑک پر سے تمہارا پتھر، کانٹے اور دوسری رکاوٹیں دور کرنا سخاوت ہے۔ پیاسے کو پانی دینا سخاوت ہے۔ آدمی کی آخری زندگی کی دولت وہ نیکی ہے جو وہ اپنے ساتھیوں سے اس دنیا میں کرتا ہے۔ جب وہ مر جائے گا تو لوگ کہیں گے ـــــ ''اس نے اپنے پیچھے کیا املاک چھوڑی ہیں؟'' لیکن فرشتے پوچھیں گے ـــــ ''اس نے اپنی آمد سے پہلے کون سے نیک اعمال بھیجے ہیں؟ اس میں ایک عالمگیر نظریہ موجود ہے۔

احیاء

حصّہ سوم



اسلام ــ ایک جاں بخش قوت قارئین نے پچھلے باب میں ملاحظہ کیا کہ اسلام نے دنیا کو حقوقِ انسانیت کا پہلا منشور دیا۔ اس نے وہ اعلیٰ اصول مرتب کیے جن پر آج اقوامِ متحدہ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ مغربی دنیا نے انھیں عملی شکل دینے کی اب کوشش کی ہے اور اسلام نے اس سے کوئی تیرہ سو سال قبل یہ کارنامہ کر دکھایا۔ عہدِ حاضرہ میں متعدد مسلم اقوام میں قوم پرستی کا زبردست جذبہ اُبھر رہا ہے اور نئی قوت اور تقدیر بدلنے کا عزم بھی ہے۔ اگر اس نئی قوت کو اسلام کی نئی روحانی آگہی سے بدلا اور جاندار کیا جاسکتا ہے تو پھر بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لیے ممکن حد تک اس کا اثر ہوگا۔

۱۷ جولائی ۱۹۵۵ء میں روزنامہ ''ڈان'' میں ''تہذیب کا مستقبل'' کے عنوان سے آر۔ سی مودت کا مضمون نقل کیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ عرب اقوام اپنی تہذیب کے ایک نئے اور فعال دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس کے ممکن نتائج کا تجزیہ بھی کیا گیا مسٹر مودت گرین وچ کے رائل نیوی کالج میں تاریخ کے معلمِ اعلیٰ ہیں۔ لکھتے ہیں ــــــ

''تہذیب نے بے شک بہ استقلال یکساں رفتار سے ترقی نہیں کی۔ چند علاقے آگے نکل گئے ہیں، باقی ساکن و جامد رہے ہیں۔ مؤخر الذکر علاقوں نے بڑھنا شروع کیا ہے، اوّل الذکر علاقے جمود کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال تابدار اسلامی تہذیب ہے جو اس وقت مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں پروان چڑھی جب مغربی یورپ بربریت کے عالم میں تھا لیکن مغرب کو ایک فعال قوت

بنانے کے بعد مشرقِ وسطیٰ کی اسلامی تہذیب جامد ہو کر رہ گئی۔ اب پھر آثار بتا رہے ہیں کہ ایشیا کی تہذیبیں نئے فعال مرحلے میں داخل ہو رہی ہیں، ادھر افریقہ بے طور بیدار ہونے کے بعد زمانے کے انقلاب میں شامل ہو رہا ہے۔"

آگے چل کر مسٹر مووت نے بتایا ہے کہ کسی تہذیب کے اِحیاء میں روحانی قوتیں جاندار عوامل کا کام کرتی ہیں ——

اس کے یہ معنی ہیں کہ نئے نظام کی سمت جانے کے لئے تبدیلی کے آثار کے معاصرانہ منظر کا معائنہ کرنے پر فنی ایجادات اور اپنے وقت کے سیاسی انقلاب پر توجہ مرکوز کرنا کافی نہیں۔ مؤرخ کے لیے روحانی قوتوں کی نمود لازماً خاص معنویت رکھتی ہے —— ایسی معنویت جو بعض نہایت واضح نظریات میں ظاہر ہوتی ہے مثلاً یہ پہلی تاریخی تہذیب کی اساس تھی اور اس نے بعد کی تہذیبیں پروان چڑھائیں۔ یہ نظریاتی قوتیں مستقبل کے عالمی نظام کی تشکیل میں لابدی طور پر اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ آج ہمیں تین ممکن صورتیں درپیش ہیں۔

(۱) نئے سرے سے خانہ جنگی کا آغاز۔

(۲) طویل دورِ زوال جس کی نمایاں خصوصیت نوکر شاہی یا مادیت پرستی کے انداز کی ایک یا ایک سے زائد مطلق العنان حکومتیں ہوں۔

(۳) ایک یکسر نئے انداز کا عالمی معاشرہ جو اخلاقی اور روحانی نظریے کی بنیاد پر قائم ہو۔

ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ اخلاقی اور روحانی قوتیں اس ترقی میں ہمہ گیر طور پر اہم کردار ادا کریں گی اور زمانے کا عظیم ترین انقلاب برپا کرنے میں یہ لوگوں کو ابھاریں گی اور فعال ثابت ہوں گی۔"

یہ عظیم روحانی اور اخلاقی قوت صرف اسلام سے حاصل ہو سکتی ہے —— یہی وہ مذہب ہے جو آدمی کی زندگی کو غیر ترقی پذیر شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ روزمرہ کے ہر عمل میں اخلاقی اور روحانی قدر داخل کرتا اور فوری طور پر اس قدر قابلِ عمل اور ہمہ گیر ہے کہ تہذیب کے تمام

مرحلوں پر بنی نوع انسان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔قرآن مجید میں آیا ہے ـــــــ

''اور تم بہترین اُمت ہو جسے نسلِ آدم کی بھلائی کے لیے بیدار کیا گیا۔تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔'' (سورۃ ۳، آیت کریمہ ۱۰۹)

اور قرآن مجید میں یہ بھی کہا گیا ہے ـــــــ

''ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہی دو اور رسول تم پر گواہی دیں۔'' (سورۃ ۲، آیت کریمہ ۱۴۳)

آج کی دنیا میں جبکہ ایک طرف تو ملحدانہ نظام اشتراکیت کی قوتیں ظاہر ہو رہی ہیں اور دوسری طرف مغرب کے غیر یقینی رشتے ہیں لاریب اس افضل اُمت کے اُبھرنے کا وقت آ گیا ہے جس کا حوالہ قرآن مجید میں آیا ہے۔لیکن پیشتر ازیں کہ افریقہ، ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان خدا کے سچے راستے ـــــــ ''راہِ اعتدال'' پر گامزن ہونے کے لیے متحد ہوں انہیں پھر سے اپنے لیے اسلام کی روحانی و اخلاقی قدریں دریافت کرنی چاہئیں۔

بدقسمتی سے کتنے ہی نوجوان اس حقیقت پر یقین رکھنے کے آرزومند نہیں کہ اسلام میں نئی قوت اور نئی زندگی بخشنے کی حیرت انگیز صلاحیت پائی جاتی ہے۔وہ دیکھتے ہیں کہ کس بری طرح بے شمار مسلمان کسانوں کی زندگی پسماندگی اور محرومی کا شکار ہے پھر زقند لگا کر اس غیر قدرتی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ اور اسلام کا اقتصادی نظام نئی دنیا میں کسی قسم کی مفید خدمت سرانجام نہیں دے سکتا۔بالآخر مغرب کی فنی مہارت اور اقتصادیات پر تان ٹوٹتی ہے۔وہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام کبھی ترقی کے خلاف رہا نہ اس نے فنی اختراعات و ایجادات سے گریز کیا بلکہ خلاف ازیں جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصے میں عیاں کیا گیا ہے۔اسلام دنیا کا وہ پہلا مذہب ہے جس نے علم و فن کے تمام شعبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے سائنس اور ٹیکنالوجی کی حوصلہ افزائی کی۔

نسلِ انسانی کو جدوجہد اور بحران کے دور میں صرف صنعت و حرفت کے فن کی پیشکش کافی نہیں۔نسلِ انسانی کو امید پیش کرنی چاہیے ـــــــ اور اکثر غیر معمولی ذہانت کے اسکالر جن میں مغرب کے صفِ اول کے مفکر شامل ہیں۔اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اسلام ہی پوری دنیا

کے مستقبل کی اُمید ہے۔

اِحیائے اسلام کے بارے میں مغرب کے چند دانشوروں کی آرا

ہنگری کا ممتاز معلم پروفیسر جرمینس لکھتا ہے ــــــ

"اسلام کی اخلاقی تعلیمات ہی اس کے اِحیاء کے لیے رہبری کرتی ہیں۔ یہ تعلیمات جو ہر مضبوط و مستحکم معاشرے کے ستون ہیں۔ عدم اعتماد، جھوٹ اور بددیانتی کو مسترد کرتی ہیں۔ وہ بے کسوں کی خود غرضانہ لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کی مُذمّت کرتی نیز چوری اور ڈاکے پر سخت سزا دیتی ہیں۔ ذہنی صلاحیتیں اور محنت کو فرد کی ذاتی ملک سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ دیانتدارانہ مساعی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ سنتِ نبوی سنجیدہ کام اور اپنی ذات کے نظم وضبط کو لازم قرار دیتی ہے نہ کہ نعروں اور نفرت کو۔ انھی کی بدولت مسلمانوں کے احیاء کا راستہ ہموار ہوگا۔"

سر ولیم ولفریڈ اپنی کتاب "اسلام کا مستقبل" میں کہتا ہے ــــــ

"اولادِ آدم کو دینے کے لیے اسلام کے پاس اتنا کچھ ہے کہ یہ ان کا دل موہ لینے میں ناکام نہ رہے گا۔ ترقی یافتہ یورپ اور عیسائیت کسی شکل میں اتنا نہیں دے سکتی۔"

ڈبلیو۔ ای۔ ہاکنگ لکھتا ہے ــــــ

"میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اسلام اپنی نشوو ارتقاء کے لیے بہ کثرت ضروری اصول وقوانین رکھتا ہے۔ فی الواقع یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیائے مغرب تہذیب وتمدن کی جس ترقی پر بھی فخر کرسکتی ہے تیرھویں صدی کے وسط میں اسلام اس کا وسیلہ تھا۔ میں یہ جتادوں کہ یہاں میں صرف اسلامی قانون شریعت کا ذکر کر رہا ہوں جو مسلمانوں کی مملکت کے اصل قانون کا ایک حصّہ ہے۔ مقامی رسم ورواج اور مقامی حکمرانوں کے احکام کی بنیاد پر اسلام عام زندگی میں بالخاصہ اپنا کام چلاتا رہتا ہے۔ اس کی شدت تو زیادہ تر ان ذاتی اور خانگی معاملات میں پائی جاتی ہے جو مذہب کے اخلاقی شعور سے واسطہ رکھتے ہیں۔"

مرمڈیوک پکتھال نے کہا ہے، ''اسلام کا نصب العین ترقی ہے'' وہ مندرجہ ذیل سطور میں رقمطراز ہے ــــــــ

''اسلام ایسا مذہب ہے جو بطورِ خاص انسانی ترقی کا نصب العین رکھتا ہے اور متعدد اوامر و نواہی کے ذریعے اس کے حصول کا صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ یہ اوامر و نواہی آدمی کی روزمرہ کی زندگی کے ہر مشغلے، اس کی معاشرتی زندگی اور سیاسات نیز اس کے ذہن اور اس کی روح کی ہر تحریک پر حاوی ہیں۔ یہ احکام الٰہی اوامر و نواہی ایک مکمل معاشرتی و سیاسی نظام میں بہ شکلِ قانون نافذ کیے گئے ہیں۔ یہ حقیقت تاریخ کے لیے سخت حیرانی کی موجب ہے کہ اس نظام پر کامیابی سے عمل بھی کیا گیا ہے۔ کئی مصنفوں نے اسلام کی حیرت خیز کامیابی کو خارجی اسباب سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس حقیقت کی کیونکر وضاحت کریں گے مسلمان جب بھی مقدس قانونِ شریعت کے کسی خاص حکم پر دل سے عمل پیرا رہے وہ اس سے متعلقہ شعبے میں کامیاب رہے اور جب انھوں نے اس کی پیروی میں کوتاہی کی ناکام ہوئے۔''

تھیوڈور موریسن کا ایک مقالہ بہ عنوان ''انگلستان اور اسلام'' NINETEENTHCENTURY AND AFTER کے جون ۱۹۱۹ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ اس میں وہ لکھتا ہے ــــــــ

''سچ تو یہ ہے کہ اسلام مذہب نہیں ہے، اس سے زیادہ ہے۔ یہ ایک مکمل معاشرتی نظام ہے۔ یہ ایک تہذیب ہے جس کے پاس اپنا فلسفہ ہے، اپنا کلچر ہے اور اپنا آرٹ ہے۔ اپنی حریف عیسائی تہذیب کے خلاف طویل جدوجہد کے دوران میں یہ ایک ایسی حیاتی وحدت بن گیا ہے جو اپنے آپ سے آگاہ ہے۔ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں کہ اسلامی تہذیب مردہ ہو چکی یا مزید ترقی کے ناقابل ہو کر رہ گئی ہے۔''

ایک عظیم امریکی عالم، لوتھورپ نے سٹوڈرڈ رنگ و نسل کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ریمارکس دیے ہیں ــــــــ

''موٹی بات یہ ہے کہ مشرقِ قریب بنیادی وحدت یعنی اسلام کی حامل ہے۔ یہاں کی عیسائی اور یہودی اقلیتیں ماضی کے طویل ادوار کی مقامی باقیات ہیں۔ اب اسلام مذہب سے بڑھ کر ایک شے ہے۔ یہ ایک ثقافت ہے، ایک مسلکِ حیات ہے۔ تاہم مغربیت کے ذریعے اس کی ترمیم ہو سکتی ہے لیکن اسلام کی بنیاد پر نئی ترقی کا دارومدار رہے گا۔ اسلام جامد ہے نہ زوال پذیر جیسا کہ اکثر اہلِ مغرب فرض کرتے ہیں۔ یہ خوب جاندار ہے اور مدت سے صحیح طور پر ارتقاء کے عمل سے دوچار ہے۔ دو صدی قبل اسلام انتہائی زوال یا ضعیفی کو پہنچا۔ اس کے بعد وہ تحریک شروع ہوئی جو احیائے اسلام کے نام سے معروف ہے ——— یہی وہ روحانی عمل ہے جو کبھی رکتا تھمتا نہیں جو مصروفِ کار رہتا ہے اور اہم نتیجہ پیدا کرنے کے لیے جاری و ساری رہتا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ تحریکِ احیائے مغرب کے اثرات کی مرہونِ منت نہ تھی۔ یہ اسلام کی اپنی توانائی سے نمودار ہوئی تھی۔''

نامور مصنف آنجہانی برنارڈ شا تمام مذاہب میں اسلام کو سب سے اہم مذہب سمجھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے ———

''میں نے ہمیشہ اسلام کو اپنی حیرت خیز توانائی کی بدولت وقیع ترین گردانا ہے۔ مجھے صرف یہی ایسا مذہب لگتا ہے جس میں زندگی کی بدلتی ہوئی صورتیں قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور اس کا یہی وصف ہر زمانے کے لیے اپنے اندر کشش رکھتا ہے میں نے اس محیر العقول انسان (حضرت محمدؐ) کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ میرے خیال میں وہ ذرا بھی خلافِ مسیح نہیں۔ اسے بالضرور نسلِ انسانی کا نجات دہندہ کہنا چاہیئے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر ایسا آدمی آج کی دنیا کی عنان آمریت سنبھال لے تو وہ اس کے مسائل بدیں طریق حل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا کہ اسے اپنا بہ شدتِ مطلوبہ امن اور مسرت مل جائے۔ میں نے دینِ محمد کی نسبت پیشگوئی کی ہے کہ جس طرح آج کے یورپ میں اس کی قبولیت

شروع ہے۔اسی طرح کل کے یورپ کے لیے یہ قابلِ قبول ہوگا۔"

سچ پوچھیں تو جارج برنارڈ شا نے یہاں تک کہہ دیا کہ یورپ کی اسلام پسندی کا دور شروع ہو چکا ہے۔وہ لکھتا ہے ———

"انیسویں صدی ہی میں کارلائل، گبن اور گوئٹے ایسے دیانت دار مفکروں نے محمدؐ کے دین کی حقیقی قدرومنزلت جان لی تھی۔اس وقت کئی آدمیوں نے یہ دین اختیار کرلیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کے قبولِ اسلام کا عہد شروع ہو چکا ہے۔"

مشہورِ زمانہ کثیر الاشاعت امریکی میگزین 'لائف' نے ۱۹۶۵ء کے ایک شمارے میں اسلام کی قدرومنزلت اور گفتگو پر کئی صفحے صرف کیے۔اس میں بھی اسلام کی توانائی اور لچک کی تعریف کی گئی ———

"اسلام آدمی کا سب سے کمسن عظیم عالمگیر مذہب ہے۔کئی لحاظ سے یہ سادہ ترین اور واضح ترین ہے۔یہ واحد قادرِ مطلق خدا کی تحسین وتکریم کرتا ہے۔اس کا بانی محمدؐ تھا نہ کہ مسیحا لیکن خدا نے اسی کا انتخاب کیا اور اسی کے ذریعے بات کی۔

اسلام سادہ، صاف وصریح اور مثبت مسلک ہے۔اسی کشش کے سبب سے اسلام میں مسلسل قوت اور پائیداری آئی ہے۔اسی کے طفیل تیرہ سو سال اسلام کی وحدت قائم رہی۔اسلام مذہب سے کہیں زیادہ ہے۔یہ ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جو اس حد تک خیال وعمل کی رہبری کرتا ہے کہ دنیائے مغرب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔یہ عقیدہ کہ خدا ہمہ گیر فرماں روا اور ہمہ داں مصنف ہے۔دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایسا وقار اور اعتماد بخشتا ہے جو عالمی سطح پر ان کے برتاؤ پر اثر ڈالنے سے نہیں چوکتا۔یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ جس طور اسلام کروٹ لے گا اس سے دنیا کے مستقبل پر بڑا اثر پڑے گا اور اس کے زیادہ روشن خیال رہنما اس حقیقت سے حسی طور پر آگاہ ہیں۔سمت کا دارومدار ہر اس آخری تجزیے پر ہے کہ اسلام کس قدر کامیابی سے وقت اور تاریخ کے بدلتے ہوئے

تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کتنے ہی مسلمان اپنے روحانی مسائل کو واقعی مشکل سمجھتے ہیں۔ یہ بات خود محمدؐ نے دیکھی۔ جب [redacted] جنگ سے لوٹے تو اپنے صحابہ سے کہا، "تم ایک چھوٹی جنگ سے بڑی جنگ کی طرف آئے ہو" انہوں نے پوچھا، "اے خدا کے رسول! وہ بڑی جدوجہد کیا ہے" آپؐ نے جواباً کہا، "داخلی کشمکش۔"

ایک ممتاز عمرانیات داں جارج کسِک اس اسلوب کی تعریف کرتا ہے جس سے اسلامی شریعت ہنوز ان اسلامی معاشروں کو بھی گرانقدر معاشرتی ڈھانچہ عطا کرتی ہے جن میں روحانی زوال نمایاں ترین ہوتا ہے ——

"تہذیب عالم میں اسلام کی اہمیت اتنی زیادہ اس کے غیر نمایاں عقیدوں کے باعث نہیں جتنی اُمتِ مسلمہ کی ہدایت کے لیے اس کے قانونی نظام اور معاشرتی ضابطے کی مربوط قوت کی بدولت پائی جاتی ہے جس کا آغاز خود پیغمبرؐ اسلام نے کیا، قرآن میں یہ نظام و ضابطہ منضبط ہوا اور خلفاء کے عہد میں اس نے روایات کی شکل اختیار کی۔

یہی وہ اصول اور ضابطے تھے جو سادہ عقیدوں کی بنیادوں پر مسلط و نافذ کیے گئے۔ انھی نے انفرادیت پسند عرب قبیلوں کو فتحمند قوت کے طور پر متحد کیا جس سے دنیائے اسلام کے عظیم ترین دور میں اس کے قومی اور ثقافتی تنوع میں معاشرتی اتحاد استوار رہا۔ نیز آج صدیوں کے زوال اور غفلت کے بعد بھی اسی نے وحدت کا شعور قائم ہے۔ موجودہ مشینی عہد نے مذہبی عقیدوں کے بارے میں مسلمانوں کا ایمان متزلزل کر دیا ہوگا اور اگرچہ وہ آزاد خیال بلکہ دہریہ تک ہو گئے ہوں گے۔ تاہم وہ اسلام کے معاشرتی قومی دائرے ہی میں رہتے ہیں۔"

موسیو وینس سورت اپنی "تاریخِ مذاہب" میں لکھتا ہے ——

"اسلام نئی دنیا میں زندہ رہنے کے معاملے میں بے سروسامان نہیں۔ یہ عیسائیت اور بدھ مت کی نسبت کم دینی سرمایہ رکھتا ہے لیکن ایک دوسرے

زاویے سے یہ مکمل مذہب ہے۔ یہ سیاسی زندگی میں اپنے پیروکاروں کے تقاضے پورے کرتا ہے درآنحالیکہ عیسائیت اور سیاست ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ عیسائیوں کی نسبت مسلمان اپنے مذہب سے زیادہ وابستہ ہیں۔ یہ ان سے کم کاوش طلب کرتا ہے اور ان کی فطرت پر کم بندشیں عائد کرتا ہے۔"

ان دو آخری حوالوں میں اسلام کی کم سے کم قدر و منزلت جانچی گئی ہے۔ بہر حال ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہنوز ایک ایسا گرانقدر معاشرتی ڈھانچہ موجود ہے جس میں نسبتاً آسانی اور سرعت سے روحانی اِحیاء ہو سکتا ہے۔ عربی کے نامور عالم پروفیسر ہورٹن نے ایک مختلف نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ اس اِحیاء کو "تدریجی داخلی عمل اور آہنگ" کی شکل میں دیکھتا اور اسلام کو دائمی انقلاب برپا کرنے کے قابل سمجھتا ہے کیونکہ مسلمان نے ہمیشہ اپنے مذہبی نظریے کو ان ثقافتی عناصر سے ہم آہنگ رکھا جو اس نے گرد و پیش کے لوگوں سے اپنی ذات میں جذب کیے۔

ایک دوسرا معروف مستشرق کہتا ہے ـــــ

"اسلام کی اسپرٹ اتنی کشادہ ہے کہ عملاً یہ غیر محدود ہے۔ اس نے گرد و پیش کی تمام قوموں کے قابلِ حصول خیالات اپنا لیے ہیں اور انہیں اپنی مخصوص طرز کی ہدایت بخشی ہے۔"

اسلام کے پاس پیش کرنے کے لیے جو مثبت اور روحانی کارنامے ہیں ان کے بارے میں امریکی مسیحی چرچ کے بڑے پادری کیتھ ایچ گرینڈیل بی۔ ڈی نے اپنے سلسلۂ مضامین بہ عنوان "وہ ہماری نسبت کیا سوچتے ہیں" میں ایک خاص مضمون لکھا ـــــ "اسلام کا اثر عیسائیت پر" یہی مضمون "اسلامک ریویو" کے اپریل ۱۹۵۶ء کے شمارے میں شائع کیا گیا۔ اس میں ذیل کا پیرا شامل تھا ـــــ

"درحقیقت مسلمان ایسی قوم کے افراد ہیں جن کے پاس عالمی برادری کو دینے کیلئے ایک واضح اور مثبت شے ہے۔ وہ مغرب سے مساوات کی بناء پر عالمی شہریت کے سلسلے میں معقول جواب طلب کرتے ہیں۔ اپنی مخفی صلاحیت کے طفیل اسلام خدا اور آدمی کی ماہیت کے بارے میں مذہبی نظریات پیش کرتا

ہے جو مسیحی شعور کا تکملہ ہیں اور عالمی سیاست کی تنظیم نو کیلئے حقیقی طور پر بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ اگر عیسائیت کو اپنے آئیڈیل پر سچا اُترنا ہے تو اسے ان اسلامی نظریات کو اپنا لینا چاہیئے۔''

فرانسیسی عربی دان موسیو جاکویز رستر اسلام کو آج کی دنیا میں ''آزادی کے قلعے کا آخری پشتہ'' سمجھتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اپنی کتاب ''تہذیب عرب'' میں لکھا ہے ——

''ایسے وقت میں جبکہ اسلحہ کی قوت یا اقتصادی غلبے کے نفرت انگیز دباؤ سے نسلِ انسانی اپنی پیاری آزادیاں گنواتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ایک غیر متعصب شاہد پر یہ امر بہت زیادہ واضح ہے کہ مستقبل کے باب میں اسلام متذبذب اور غیر یقینی ہوتے ہوئے بھی آزادی کے قلعے کا آخری پشتہ ہے۔''

مارچ ۱۹۵۶ء میں ڈھاکہ کے روٹری کلب کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بھی نامور امریکی ماہرِ تعلیم ابراہم موزز نے ان الفاظ میں اسلام کی مستقبل و پائیدار خوبیوں کا ذکر کیا ——

''اسلام ہر دور اور ہر زمانے کا مذہب ہے۔ یہ عقیدوں، نظریوں اور اصولوں کی اندھی تقلید کا پابند نہیں بلکہ ادھر ذہنی ریاضت کی حوصلہ افزائی کرتا اور ادھر وہ سہولتیں بڑھاتا ہے جو خدا نے نسلِ انسانی کو بخشی ہیں۔''

مسٹر موزز نے اس متحرک اثر کا بھی حوالہ دیا جو اسلام نے قرونِ اُولیٰ میں اپنے زمانے کی سوچ پر ڈالا اور کوئی وجہ نہیں کہ بعد کے زمانے میں اسے جو زوال ہوا اسے ایک عارضی دھچکے سے زیادہ سمجھا جائے۔ کوئی بھی مذہب جو اسلام کی طرح حصولِ علم کی حوصلہ افزائی کرتا ہو فی نفسہٖ دوبارہ توانائی پانے کا سامان رکھتا ہے۔

برنارڈ شا نے مورخ گبن کے حوالے سے اسلام کی نسبت یہ الفاظ کہے ——

''یہ پروپیگنڈے کی بات نہیں بلکہ اس کی دائمی حیثیت ہے جو ہماری حیرت کی طلب گار ہے۔ اسلام نے مکہ اور مدینہ پر جو کھرا اور کامل نقش ثبت کیا تھا بارہ صدیوں کے انقلاب کے بعد بھی قرآن کے ہندوستانی، افریقی اور ترک نومسلم پیروکاروں میں ہنوز محفوظ ہے۔''

ایک اور انگریز مُستشرق بوسورتھ اسمتھ نے (انیسویں صدی کے آخر میں) اسلام کی نسبت مختصر طور پر یہ کہا ——

"اسلام فی نفسہٖ فنا نہ ہونے والی قوت ہے۔"

اس کے ظاہری زوال کے چند اسباب کا حوالہ دیتے ہوئے بوسورتھ اسمتھ نے پیشگوئی کی اور کہا ——

"جب اسلام کو پیغمبر کے استنبول کے خلفاء کی شاندار بدعنوانیوں اور جھوٹے وقار سے نجات ملی تو یہ اور زیادہ ترقی پائے گا۔"

آیئے اس امر پر زیادہ تفصیل سے غوروخوض کریں کہ کیوں

(۱) اسلام پہلے پہل کامیاب ہوا۔

(۲) پھر تاریخ میں اپنا اعلیٰ مقام قائم رکھنے میں ناکام رہا۔

(۳) اور اب پھر عظمت کی ان بلندیوں تک پہنچے گا جہاں تک کوئی نہیں پہنچا۔

ابتدائی کامیابی کے اسباب اسلام نے مذہبی فرائض کی حدود میں جو کامیابی حاصل کی اس کے بنیادی اسباب کی جستجو کرنی لازم ہے۔ اس تالیف میں پیچیدہ دینی گفتگو کے لیے گنجائش نہیں۔ البتہ اسلام کے بنیادی اصول کے نہایت مختصر بیان سے بہتر انداز سے مقصد پورا ہوسکتا ہے۔

ایک نامور ایجابی POSITIVIST [1] ڈاکٹر جے۔ ایچ۔ برِیجز نے اسلام کی نسبت کہا ——

دینِ اسلام ایک لفظ میں سمویا ہوا ہے۔ اسلام یعنی عبودیت —— اپنی مرضی کو منشائے ایزدی کے تابع کر دینا۔ لفظ اسلام خود بخود ہم پر واضح ہوجاتا ہے جیسا کہ محمدؐ کے پیروکاروں پر واضح ہے۔ یہ زندگی کے الگ نہ ہونے والے دو رُخ ظاہر کرتا ہے —— کام اور عبادت۔ محمدؐ نے کہا، عبادت —— اور سخاوت کرو! پیغمبر اسلامؐ کے عطا کردہ مفہوم میں سخاوت

---

[1] POSITIVISM آگسٹس کومٹے کا ایسا نظام فلسفہ جس میں فقط معلوم اشیاء کے قدرتی عمل اور خواص نیز ان کی بقائے باہمی کے اصول سے بحث کی جاتی ہے۔ (مترجم)۔

کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ اسے قابلِ قدر دانش سے سوچا گیا اور اسکے زمانے کی سادہ ضرویات سے متعلق ہے اور اس میں آدمی کی ہر نیکی آجاتی ہے۔ عبادت اور کام کرو! ازمنہ وسطیٰ کے ایک بزرگ نے کہا۔ عبادت کرو جیسا کہ کام کے ذریعے کچھ ہو ہی نہیں سکتا اور کام کرو تو جیسے عبادت کے ذریعے کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

اسلام یا انگریزی زبان میں لفظ DEVOTION (عبودیت) ہے ——— یعنی ارفع ترین ذات سے ہماری زندگی کی لگن، منشائے ایزدی سے اپنی مرضی کو ہم آہنگ کرنا۔ یہ ہے لفظ اسلام جو ہر زمانے اور ہر ملک کے پاکباز لوگوں کی زندگی کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔"

ہم دنیا کے عظیم مفکروں کی تالیفات میں اسلام کی ہمہ گیری کی تعریف میں بار بار یہی پڑھتے ہیں۔ اسلام واحد مذہب ہے جو آدمی آدمی میں ایک امتیاز کی شناخت کرتا ہے اور یہ ہر ایک کا انفرادی رویہ ہے۔ عیسائیت کے برعکس یہ پیدائشی گناہ ایسے کسی عقیدے کا شکار نہیں بلکہ اسلامی عقیدہ تو یہ ہے کہ مرد ہو یا عورت تمام انسان معصوم پیدا ہوتے ہیں اور تمام نیک لوگ نجات پا سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں سر چارلس ایڈورڈ آرچی بالڈ ہملٹن کے ریمارکس یہ ہیں ———

"اسلام آدمی کی موروثی معصومیت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ آدمی اور عورت ایک ہی جوہر سے پیدا ہوئے ہیں، ان میں ایک ہی روح ہے اور دونوں دماغی، روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے یکساں صلاحیت رکھتے ہیں۔"

اب یہاں امید کا بنیادی پیغام ملتا ہے۔ تمام لوگوں کے لیے اس دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے یکساں مواقع پائے جاتے ہیں بشرطیکہ وہ نیکی کی زندگی اختیار کرنے کے لیے کوشاں ہوں۔ عملی ہدایت کے لیے اسلام انھیں شریعت دیتا ہے۔ اچھی زندگی بسر کرنے کے لیے مفصّل ہدایت اور درس دیتا ہے کیونکہ اسلام میں کسی کو زندگی ترک کرنے کو نہیں کہا گیا۔ کسی ایسے زاہدانہ عمل کی اجازت نہیں جس سے پاکبازی کے لیے خفیہ دروازہ کھلتا ہو ——— نجات پانے کی غرض سے کسی قسم کے ناقابلِ فہم عقیدوں پر ایمان لانے کے لیے ذہن پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔ تمام مذاہب میں سے اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو پل بھر کے لیے روحانی تزکیے کا شعور زائل کیے بغیر دنیوی

اطمینان کے پورے دائرے میں آدمی کے لیے لطف اندوز ہونے کا امکان پیدا کرتا ہے۔

درحقیقت اسلام کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس نے حیاتِ انسانی کے روحانی اور دنیوی پہلوؤں میں کامل ربط پیدا کر کے اسے ایک عظیم تر وحدت میں تبدیل کر دیا ہے۔ پروفیسر گبن کے الفاظ میں ــــــ

''اسلام ایک مکمل معاشرہ ہے جو مذہب کی بنیاد پر قائم ہے اور حیاتِ انسانی کو ہر پہلو سے سمجھتا ہے۔''

ڈاکٹر گستاف ویل اسلام کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ ''لافانی قوت سے قوی ہوا ہے۔'' ڈاکٹر ویل کہتا ہے ــــــ

''مانا کہ اسلام کی سیاسی قوت زوال پا چکی ہے لیکن اس کی روحانی قوت آج بھی اسی طرح شباب پر ہے اور جاندار بھی جس طرح اس وقت تھی جب یہ حیرت خیز عالمگیر اسلوبِ حیات کی پہلی مہم پر نکلا۔ اسلام کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ راز یہ ہے کہ یہ پروہتی نظام کے بندھنوں سے قابلِ قدر انداز میں آزاد رہا۔ اسلام الہامی مذاہب میں سب سے زیادہ سادہ ہے۔ اسی لیے یہ ایسا مذہب ہے جو اعلیٰ ترین اور ادنیٰ ترین تہذیب سے لگا کھا جاتا ہے۔''

ڈریپر اپنی تالیف ''یورپ کی ذہنی ترقی کی تاریخ'' میں رقمطراز ہے ــــــ

''یہ (اسلام) اس معنی میں استثنائی مسلک ہے کہ الہامی جواز کی مداخلت سے قطع نظر اس میں ٹھوس سیاسی مفہوم، ترقی پسند معاشرتی اصول اور ذاتی اسلوبِ زندگی کے بارے میں لائقِ تحسین ضابطے کی نسبت مذہبی عقائد اور ماوراء الطبیعیات افکار کم ہیں۔ وہ محمدؐ بے کار مابعد الطبیعیات میں نہیں پڑے بلکہ ایسے قوانین و ضوابط کے ذریعے لوگوں کی معاشرتی حالت سنوارنے میں لگے رہے جو ذاتی صفائی، سنجیدگی، روزے اور نماز سے متعلق تھے۔ انھوںؐ نے خیرات دینے اور سخاوت کرنے کو تمام امور پر بالاتر رکھا۔ ماضی کی دنیا اس آزادی سے ناآشنا تھی جس سے انھوںؐ نے ہر مذہب کے لوگوں پر نجات کے

دروازے کھول دیے بشرطیکہ وہ نیک ہوتے۔"

ایم۔این۔رائے نے اسلام کی کامیابی کے اسباب کا تجزیہ یوں کیا ہے ـــــ

"اسلام کی غیر معمولی کامیابی بنیادی طور پر انقلابی معنویت اور عوام کو اس مایوس کن حالت سے مخلصی دلانے کی صلاحیت کے باعث تھی جو نہ صرف یونان اور روما بلکہ ایران، چین اور ہندوستان کی پرانی تہذیب کے زوال سے پیدا ہوئی تھی۔ اسلام کی تلوار عیاں طور پر فی سبیل اللہ متحرک رہی۔ درحقیقت یہ ایک نئی معاشرتی قوت کی فتح میں شریک ہوئی۔ اس نے نئی حیاتِ دانش کے نکھرنے میں حصہ لیا جسے انجام کار تمام مذہبوں اور مسلکوں کی قبر ثابت ہونا تھا۔ اسلام کی توسیع و اشاعت معجزوں میں سب سے بڑا معجزہ ہے۔ آگسٹس کی سلطنتِ روما جسے بعد میں بہادر شاہ ٹروجن نے بڑھایا پھیلایا ان عظیم اور شاندار فتوحات کا نتیجہ تھی جو سات سو سال کی مدت میں حاصل کی گئیں۔ لیکن یہ طول و عرض میں عربوں کی مملکت کی برابری نہ کرسکی جو ایک صدی سے بھی کم مدت میں قائم ہوئی۔ سکندرِ اعظم کی سلطنت خلفائے اسلام کی وسیع مملکت کا چھوٹا سا حصہ ظاہر کرتی ہے۔ ایک ہزار سال تک ایران کی سلطنت روما کے لشکروں کا مقابلہ کرتی رہی ایک دہائی سے بھی کم مدت میں شمشیرِ الٰہی کے سامنے جھک گئی۔"

عظیم مورّخ ایڈورڈ گبن توسیع اسلام کی تاریخ زوردار انداز سے ذیل کے پیرائے میں ملخّص کرتا ہے ـــــ

"آدمی یہ سوچ کر بس دنگ ہی تو رہ جاتا ہے کہ دشتِ عرب کے بدوؤں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں نے نئے مذہب (اسلام) کے آتشیں جذبے سے شعلہ فشاں ہوکر کتنی غیر معمولی اور ناقابلِ یقین سرعت سے عہدِ قدیم کی دو سب سے زبردست سلطنتیں تہس نہس کرکے رکھ دیں۔ جب محمدؐ نے منفرد پیغمبر کی حیثیت سے پیامِ امن کی اشاعت کی تھی تو یہ مشکل

پچاس برس ہوئے تھے کہ اس کے پیروکاروں نے ایک طرف بحر اوقیانوس کے ساحلوں پر اور دوسری طرف ہندوستان کی سرحدوں پر اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ دمشق کا پہلا خلیفہ اتنی بڑی سلطنت پر حکمران تھا کہ اونٹوں کے قافلے پر سفر کر کے پانچ مہینے سے کم عرصے میں عبور نہ کی جاسکتی تھی۔ پہلی صدی ہجری کے آخر میں مسلمانوں کے سالار دنیا کے قوی ترین فرماں روا تھے۔" [1]

ایچ۔ اے۔ ایل فشر نے بھی اپنی شہرۂ آفاق تالیف "ہسٹری آف یورپ" میں اسلام کی فتح و نصرت کی انقلاب آفریں نوعیت کا حوالہ دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے ـــــــ

"کہیں بھی کسی عرب مملکت میں باقاعدہ لشکر یا مشترکہ سیاسی صورتِ حال کا نشان تک نہ تھا۔ عرب شاعر تھے، خوابوں میں بسنے والے، جنگجو اور تاجر تھے لیکن سیاست دان نہ تھے۔ انھوں نے مذہب میں کوئی مستحکم یا اتحاد پیدا کرنے والا منصوبہ بھی نہیں گھڑا۔ وہ ادنیٰ درجے کی صنمیات پر عامل تھے۔ اسلام قبول کرنے کے ایک سو سال بعد ان گمنام وحشیوں نے عظیم عالمگیر قوّت حاصل کر لی۔ انھوں نے مصر اور شام فتح کر لیے ـــــــ انھوں نے ایران کو دبوچ لیا اور حلقہ بگوشِ اسلام کر لیا، مغربی ترکستان اور پنجاب کا ایک حصہ زیر کر لیا۔ انھوں نے بازنطینیوں سے افریقہ لے لیا، بربروں نے غربی غوط (وزی گوتھ) [2] سے ہسپانیہ لے لیا۔ مغرب میں انہوں نے فرانس کو دھمکی دی اور مشرق میں قسطنطنیہ کو۔ ان کے سمندری بیڑے جو مصر یا شام کی بندرگاہوں میں بنتے بحیرہ روم کے پانیوں کو پامال کر گئے۔ انہوں نے یونانی جزیروں کو پامال کیا اور بازنطینی سلطنت کی بحری طاقت کو للکارا۔ انھیں اس

---

[1] اسلام نے ہندو سماج پر جو خاص اثر ڈالا اس کے لیے ضمیمہ ملاحظہ کیجیے۔

[2] غوط (گوتھ) وہ قوم ہے جس نے سنِ عیسوی کے شروع ہی میں روما کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے غربی (وزی گوتھ) اور شرقی (اوسٹرو گوتھ) دو گروہ تھے۔ (مترجم)

آسانی سے کامیابی حاصل ہوئی کہ کوہ اطلس کے بربر اور ایرانی ہی صرف سخت مزاحمت کے لائق رہ گئے اور آٹھویں صدی شمسی کے آغاز میں ایک کھلا سوال یہ تھا کہ کیا مسلمانوں کی فتح ونصرت کے راستے میں آخری بار کوئی رکاوٹ کھڑی ہوگی۔ بحیرہ روم اب روما کی جھیل نہ رہا تھا۔ یورپ کے ایک سرے سے دوسرے تک عیسائی مملکتوں کو نئے مشرقی دین ——— اسلام کی بنیاد پر قائم کی ہوئی نئی مشرقی تہذیب کا چیلنج ملا تھا۔''

پوکا ایک اور مورخ کہتا ہے ———

''اسلام کی بغاوت نے نسلِ انسانی کو بچالیا۔ اسلام تاریخ کی لابدی پیداوار تھا۔ انسانی ترقی کا حربہ تھا۔ یہ نئے معاشرتی رشتوں کی آئیڈیالوجی بن کر اُبھرا اور اس نے ذہنِ انسانی میں انقلاب برپا کر دیا۔''

فلپ ہٹی اگلی سطور میں اسلام کی اس توانائی کی واضح تصویر کھینچتا ہے جو اسے ابتدائی انقلابی دور میں حاصل رہی ———

''اگر کوئی شخص ساتویں عیسویں صدی کی پہلی تہائی میں اس پیشگوئی کی جرأت کرتا تو دیوانہ قرار پاتا کہ ایک دہائی کے اندر اندر عرب کے کم معلوم ننھے سے بربریت پسند خطۂ ارض سے چپ چاپ ایسی قوت ابھرے گی جس کی بابت پہلے سے گمان بھی نہ کیا گیا ہو اور جو اپنے وقت کی دو عالمگیر طاقتوں ——— ساسانیوں اور بازنطینیوں کو اپنی حسین ترین مملکتوں سے محروم کر دے گی۔ بہر حال بعینہٖ یہی کچھ ہو کر رہا۔ پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے عرب کی بنجر زمین جادو کے زور سے ایسے زعیموں کی کھیتی بن گئی کہ ایسے اوصاف والے زعیموں کا اتنی تعداد میں اور کہیں ملنا مشکل ہے۔ جنگ کی تاریخ میں خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن العاص کی عراق، ایران، شام اور مصر کی مہمات ایسی ہیں جو انتہائی شاندار طریقے سے سرانجام دی گئیں اور بڑی عمدگی سے نپولین، ہنی بال اور سکندر کے کارناموں سے مقابلہ کرتی ہیں۔''[1]

---

[1] فلپ کے ہٹی کی HISTORY OF THE ARABS صفحہ ۱۴۲

لیکن یہ صرف اسلام کے انقلابی نظریات تھے نہ کہ اس کے رہنماؤں کی فوجی ذہانت تھی جس نے ان نظر افروز کامیابیوں میں حصہ لیا۔ اہلِ دنیا نے بار بار اسلام کا پیامِ اُمید قبول کرنے کے لیے رضامندی اور آرزو ظاہر کی اور یہی کامیابی کی آخری وجہ ثابت ہوئی۔

پروفیسر فنلے نے اپنی تالیف "بازنطینی سلطنت کی تاریخ" میں لکھا ہے ـــــ

"تقریباً ہر موقعے پر جب سارا سینوں نے عیسائیوں پر فتح پائی تاریخ بدقسمتی سے اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ ان کی کامیابی بیشتر اس جذبۂ شوق کے باعث تھی جو مفتوحین کے نزدیک اس ترقی کا سبب تھا۔

بیشتر عیسائی حکومتوں کے لیے اس بات کا انکشاف شرم کا موجب ہے کہ عرب فاتحین کی نسبت ان کا نظم و نسق زیادہ جابرانہ تھا۔

شام کے باشندوں نے محمدؐ کے پیروکاروں کا خیر مقدم کیا مصر کے قبطیوں نے اپنے ملک کو عربوں کے زیرِ تسلط لانے کی سعی میں حصہ لیا اور مسیحی بربروں نے افریقہ کی فتح میں دستِ تعاون بڑھایا۔ ہر کہیں بازنطینیوں کی بدعنوانیوں، ایرانیوں کی مطلق العنانی اور عیسائیوں کی اوہام پرستی کے مارے ہوئے، مقہور و مجبور لوگوں نے نجات دہندوں کے طور پر سارا سین حملہ آوروں کا استقبال کیا۔ اپنے پیغمبر کی انقلابی تعلیمات سے جنون کی حد تک سرشاری اور اپنے خلفاء کی شاندار، دانشمندانہ اور نمایاں طور پر عملی ہدایات کی اطاعت کی بدولت سارا سین حملہ آوروں نے بآسانی مفتوحہ قوموں کی ہمدردی اور مدد حاصل کر لی۔ کوئی حملہ آور مفتوحہ قوموں کی موثر مدد یا خاموش رواداری کے بغیر پائیدار طریقے سے اپنا تسلط نہیں جما سکتا۔"

ایچ۔جی۔ویلز نے "تاریخ عالم" میں قبولِ اسلام کے سلسلے میں مفتوحہ قوموں کی رضامندی کی یوں وضاحت کی ہے ـــــ

"اگر کسی کے دل میں ایک نفیس تہذیب کے بارے میں غلط خیال ہو تو بہتر یہی ہے کہ وہ جلد از جلد اسے ترک کر دے۔ ایرانی، رومن، ہیلینی

(یونانی) یا مصری حکومتیں اسلام کے سیلاب کی نذر ہو گئیں۔

اسلام اس لیے غالب آیا کہ یہی وہ بہترین معاشرتی اور سیاسی نظام تھا جو وقت پیش کر سکتا تھا۔ یہ غالب آیا کہ ہر کہیں اسے سیاسی لحاظ سے بددل لوگ ملے جو لُٹ رہے تھے، ظلم وستم کا نشانہ تھے، ڈرائے دھمکائے جا رہے تھے، ان پڑھ اور غیر منظم تھے ــــــ اور اسے ایسی خود غرض اور غیر مستحکم حکومتیں ملیں جو لوگوں سے بالکل تعلق نہ رکھتیں اسلام وسیع ترین، تازہ ترین اور صاف ترین سیاسی خیال لایا جس نے ہنوز دنیا میں عملی شکل اختیار کی تھی اور اس نے نسلِ انسانی کے عوام کو سب سے بہتر شرطیں پیش کیں۔ اسلام کے اُبھرنے سے قبل ہی سرمایہ داری اور غلاموں والی رومن سلطنت کا نظام تباہ ہو گیا اور یورپ کا ادب، تہذیب وتمدن اور اس کی روایات یکسر ختم ہو گئیں۔

پھر جب نسلِ انسانی کا اپنے نمائندوں کے خلوص پر اعتماد نہ رہا تو اسلام بھی روبہ زوال ہوا۔"

ایک دوسری جگہ ایچ۔ جی۔ ویلز اپنی تالیف اسلام کی ناگزیر کشش کا تجزیہ کرتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ پیش کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے ــــــ

"روزمرہ کی زندگی میں رحم وکرم اور فکروتردد اسلام کے اہم اوصاف ہیں۔ لیکن بات یہیں تک نہیں رہتی۔ اسی قدر اہم توحید ہے جو قرآن میں برقرار رکھا گیا ہے اور جو تنہا یہودیت کی خصوصیت نہیں۔ شروع ہی سے اسلام ان دینی تشریحات کے خلاف خاصی عمدہ رکاوٹ بنا رہا ہے جس نے حیران و پریشان کیا، عیسائیت میں تفرقہ ڈالا اور مسیح کی اسپرٹ تباہ کر دی اس کی قوت کا تیسرا سرچشمہ عبادت اور پرستش کے وہ محتاط طریقے اور مکہ سے منسوب کی ہوئی اہمیت کی وہ محدود اور روایتی معنویت ہے جو واضح طور پر قرار پائی۔ تمام قربانی اہلِ ایمان کے لیے مخصوص کی گئی۔ پرانے دینی ضابطے سے تعلق رکھنے والے قربانی کے نگران پروہت کے لیے ایسا کوئی رخنہ نہیں رکھا گیا جو نئے دین

(اسلام) میں پھر سے ڈالا جا سکتا۔ یہ صرف نیا دین نہ تھا، خلاصۃً ایک پیغمبر کا لایا ہوا دین جیسا کہ دینِ مسیحی یہودیوں کے زمانے میں تھا یا گوتم بدھ کا دین اس کی زندگی میں تھا۔ یہ اس انداز سے بیان کیا گیا کہ اسی صورت میں جوں کا توں رہے۔ آج بھی اسلام میں متبحّر عالم، مُعلّم اور مُبلّغ موجود ہیں لیکن ایک بھی پروہت نہیں۔ یہ مہر و کرم، فیاضی اور اخوت کی اسپرٹ سے معمور تھا۔ یہ سادہ اور قابلِ فہم مذہب تھا اور اس نے براہِ راست معمولی آدمی کی ہیئت میں سب سے عام جبلتوں کو متاثر کیا۔

اس کے مقابلے پر کئی دین ڈٹے ہوئے تھے ——— یہودیت نے خدا کا ایک نسلی بورڈ بنا دیا، عیسائیت تثلیثی عقیدوں اور کفر و الحاد کے بارے میں دائماً گفتگو اور وعظ کرتی ہے لیکن عام آدمی کو اس کا سر پاؤں نہیں ملتا۔ پھر زرتشتی مُغ کا دین تھا جس نے مانی کو سولی چڑھانے کی تحریک کی لیکن محمدؐ نے جس اللہ کی تبلیغ کی وہ شعوری تجربے کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں موجود تھا ——— یہ خدا راستبازی کے لیے تھا۔ دیانت داری سے اس دین کی قبولیت اور طریق کار نے غیر یقینی دغا فریب اور نا قابلِ برداشت تفرقوں والی دنیا میں بھروسے والے لوگوں کے لیے زمین پر عظیم اور بڑھنے والی اخوت کے لیے دروازے کھولے۔ پھر جنت جانے کے لیے حمد و ثنا اور عبادت کی دائمی کسرت روا نہیں رکھی جس میں اولیاء، پروہت اور خدا کے جانشین بادشاہ بلند بالا مقام رکھتے بلکہ ایسی مساوات اور قابلِ فہم مسرتوں کا اہتمام کیا، لوگوں کی روح جن کی طلب گار تھی۔ مبہم علامتوں، تاریک قربان گاہوں اور پروہتوں کے بھجنوں کے بغیر محمدؐ نے ایسے دلفریب عقیدے پیش کیے جو لوگوں کے دل لگتے تھے۔"

جی۔ ڈی۔ ڈینی سن نے اپنی تالیف "جذبہ بطور بنائے تہذیب" [1] میں بھی اسلام کو اتحار قائم کرنے والی نئی قوت جانا ہے ———

---

[1] EMOTION AS THE BASIS OF CIVILIZATION

"ایسا لگتا ہے کہ وہ عظیم تہذیب جس کی تعمیر میں چار ہزار سال صرف ہوئے پارہ پارہ ہونے اور نسلِ انسانی بربریت کی ایسی حالت میں لوٹنے کو تھی جس میں ہر قبیلہ اور ہر فرقہ ایک دوسرے کے خلاف کھڑا ہو جاتا۔ عیسائیت نے جونئی پابندیاں ایجاد کی تھیں وہ اتحاد اور ہم آہنگی کی بجائے تفرقے ڈال رہی اور تباہی و بربادی لا رہی تھیں۔ پھر کیا کوئی ایسا جذباتی کلچر تھا جو ایک بار دوبارہ نسلِ انسانی کو متحد کر لیتا اور تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ یہ تھے وہ حالات جن میں وہ شخص پیدا ہوا جس کا نام نبی اکرم محمد تھا اور جسے دنیا کو متحد کرنا تھا۔"

جس زمانے میں اسلام کے عروج کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اس زمانے کی اسلامی تاریخ یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ کبھی کبھی کامرانی کے دور کے بعد جمود کا دور آتا لیکن ماضی میں کسی وقت بھی اسلام ان احیائی قوتوں کی نمود میں ناکام نہیں رہا جن پر بیسویں صدی کی دنیا کو ایک بار پھر اعتماد کر لینا چاہیے جیسا کہ ایک نامور ترین مؤرخ گبن لکھتا ہے ——

"اسلام کی مادی قوت کے عروج و زوال کے مطالعے سے ایک درخشاں حقیقت نمودار ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جہاں کہیں اسلامی سلطنت کو زوال آیا وہیں اسلام کی ماند پڑتی ہوئی شان و شوکت کے احیاء کی خاطر کوئی نئی نسل لشکرِ اسلام میں ہجوم کر آئی۔ تاریخ اسلام میں ایک بار نہیں بلکہ کئی بار ایسا ہوا۔ جب عباسی خلفاء کی قوت قریب قریب معدوم ہو گئی تو ۱۰۶۰ شمسی میں سلجوق طغرل کے عہد میں (۱۰۳۷ سے ۱۰۶۰ شمسی تک) اس کے بھتیجے الپ ارسلان اور بعد ازاں (۱۰۷۲ سے ۱۰۹۲ شمسی تک) سلطان ملک شاہ کو اسلامی حکومت کا تابناک ترین دور دیکھنا نصیب ہوا۔ اب وسطِ ایشیا کی ایک نئی نسل دنیا پر غلبہ پانے کے لیے اسلام کی جدوجہد میں اپنا لہو پکار رہی تھی۔ اسلام کی متنوع تاریخ میں یہ کوئی لاثانی مثال نہیں کہ وہی بربریت پسند کافر جو پیغمبر کے پیروکاروں کی گردنوں پر پاؤں رکھتے تھے اسی آن اسلام قبول کر کے اس کے جوشیلے حامی بن جاتے ہیں۔ انھی کے عمزادوں —— تیرھویں صدی کے مغلوں اور ان کے دوسرے عزیزوں عثمانی ترکوں نے اسی لائحہ عمل کو دہرایا اور اسلام کی مٹی ہوئی شان و شوکت

[illegible]

زوالِ اسلام کے اسباب پچھلے چند سال میں بعض مؤرخوں میں یہ فیشن ایبل نظریہ چل رہا ہے کہ کوئی قوم یا تہذیب جب تاریخ کے ایک زمانے میں غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو یہ ناگزیر طور پر اپنے لیے زوال اور پامالی لاتی ہے۔ پہلی نظر میں یہ زاویہ خیال اسلامی سلطنت کے زوال اور سقوط پر ٹھیک بیٹھتا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے اور تاریخ نے بار بار اسے عیاں کیا ہے کہ اسلام نے ہمیشہ اپنے دامن میں دوبارہ جنم لینے کے بیج رکھے ہیں۔

اسلام دوسری تہذیبوں کی طرح اساسی قوانینِ زوال کے تابع کیوں ہو؟ یہ بات بھول نہ جایئے کہ اسلام آدمی کی اِختراع نہیں۔ اسے اللہ نے ہر زمانے کے لیے نازل کیا ہے۔ تاریخ کے جن زمانوں میں لوگوں نے اللہ کے قوانین کی نافرمانی کی اور انہیں نظر انداز کیا، اسلام زوال پذیر ہوتا دکھائی دیا لیکن جونہی لوگوں نے اپنے سچے دین سے رجوع کیا اسلام نے ہمیشہ کی طرح اپنے تئیں قوی ثابت کیا۔

اسی بناء پر فرانسیسی مؤرخ پیری لوتی زوال کے ان زمانوں کو "خواب کے زمانے" سمجھتا ہے۔ اسلامی تہذیب نے اقوام میں جس طور ارتقاء پایا اور عروج کو پہنچی اور قدیم خلفاء کے عہد میں اس نے لوگوں کو جو محرک دیا اس کی تعریف کرتے ہوئے موسیو لوتی نے لکھا ہے ——

> "دنیائے اسلام کے موجودہ زوال کو اسلام سے منسوب کرنا نہایت طفلانہ خیال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ قوموں کا اپنا زمانہ ہوتا ہے اور عظیم القدر شان و شوکت کے عہد کے بعد غفلت اور خواب کا وقت آتا ہے۔"

جرمن مؤرخ وان کریمر اسبابِ زوال کو مسلمان حکمرانوں کی داخلی لڑائیوں پر محمول کرتا ہے۔

> "اسلامی مملکتیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی تھیں ان کے فرماں روا آپس میں لڑتے اور مسلسل خانہ جنگی میں مصروف رہتے —— گیارھویں صدی کے آخر میں جب صلیبی لشکر ایشیائے کوچک میں سے گزرے تو دنیائے اسلام کے معاملات کی یہی کیفیت تھی۔
>
> مسلمان شہزادوں کے نفاق نے یروشلم کی شکست آسان بنا دی۔" [1]

---

[1] آج بھی ویسے ہی بدتر اور افسوسناک حالات ہیں۔ عربوں اور دوسرے اسلامی ممالک میں نفاق زیادہ اور اتفاق کم ہے چنانچہ فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ یروشلم ان کی گرفت میں ہے کشمیر میں بھارت دندنا رہا ہے اور اری ٹیریا حبشہ کے عیسائی حکمران کے چنگل میں ہے۔ منتشر دنیائے اسلام بے بس ہے اور اپنے مظلوم بھائیوں کو سامراجی طاقتوں سے نجات دلانے سے قاصر۔ (مترجم)

جیسا کہ وان کریمر بتاتا ہے ——

"ٹھیک ایک سو سال کے بعد جب چنگیز خاں کے لشکر سے اسلام کو خطرہ لاحق ہوا اور سب کچھ ہمیشہ کے لیے ضائع جاتا دکھائی دیا۔ مسلمانوں نے گمشدہ قوت حاصل کی، خوابِ غفلت اور نیند سے بیدار ہوئے، انھوں نے اپنی فوجیں اکٹھی کیں اور آنکھوں کو چندھیانے والی فتوحات کا نیا سلسلہ شروع کیا۔"

وان کریمر آگے چل کر کہتا ہے ——

"ہتھیاروں کے ذریعے نہیں بلکہ مذہبی مثالی نظریے کے ذریعے اسلام نے شمالی فاتح کو نیست و نابود کیا۔ واقعی اس لاثانی مذہب میں کچھ ایسی زبردست قوّت پنہاں ہے جو اسے نہ صرف دنیا کو پارہ پارہ کرنے والے طوفان کے مقابلے کی تاب دلاتا ہے بلکہ مستحکم تر، قوی تر اور جاندار تر حالت میں اُبھرنے کی صلاحیت بخشتا ہے۔"

ان سطور میں وان کریمر بیک وقت اسلام کی کامیابی اور ناکامی کے صحیح سبب کی نشاندہی کرتا ہے۔ ابتدائی ایام میں اسلام کی کامیابی بدیں وجہ تھی کہ مسلمانوں میں جنون کی حد تک مذہبی ولولہ پایا جاتا تھا اور وہ معاملاتِ زندگی میں اسلامی تعلیمات سے وابستہ رہتے تھے۔ اس مذہبی جوش وخروش اور نظم وضبط میں قومی افتخار، نسلی وقار اور انفرادی اعتماد ایسے جذبات کا اضافہ ہوا لیکن ان تمام سرگرمیوں کا سرچشمہ تو مذہب ہے۔

بہرحال وقت کے ساتھ ساتھ اسلام کی سچی اسپرٹ کے برعکس غیر معتدل عصبیت اور بعض جزئیات پر غیر ضروری حد تک زور دینے سے دین میں انتشار پیدا ہوا اور متعدد فرقے بن گئے۔ پیروں پروہتوں کے راج نیز یونانیوں اور ایرانیوں سے مانگی ہوئی اجنبی روایتوں سے اسلامی معاشرہ بگڑا اور ذلیل ہوا۔ اس کے نتیجے میں اسلام کے صحیح اصول کے عین خلاف مطلق العنانی کی نشوونما، بڑی حد تک اجتماعی توہم پرستی کی ترویج اور کئی غیر اسلامی رسوم کے لیے راہ پیدا ہوئی جس سے مذہب کا سچا روپ چھپ گیا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے انتہائی درجے کی میکی درسی تعلیمات نے مزید پیچیدگیاں پیدا کیں اور اسلام کی اصل پاکیزگی پر پردے ڈال دیے۔ اس سے بالآخر نئے علم کی ہر نوع کے حصول

کے خلاف انحطاط کی کیفیت رونما ہوئی اور دل و دماغ اور روح میں جمود آ گیا۔ بعض انتہائی رجعت پسندوں نے جنون و تعصب کے جس نظریے کی تبلیغ کی اس سے بھی موجودہ بے عملی اور سکوت کی کیفیت نے جنم لیا۔ بعض مسلمان جس قدر مذہبی دیوانے اور رجعت پسند ہوئے دوسرے لوگ اسی قدر لادین ہوئے اور ان کے دل شک و شبہ سے معمور۔ انجام کار مشترکہ مذہب کے مشترکہ رشتے کمزور پڑ گئے پھر سیاسی اور مذہبی تخریب کے عمل کا آغاز ہوا۔ خلافت پارہ پارہ ہو گئی اور جہاں پہلے رابطہ قائم تھا وہاں مذہب اور سیاست دونوں میں ابتری و پراگندگی کے سوا اور کچھ نہ رہا۔

چھوٹے چھوٹے نئے مطلق العنان حکمران غیر اسلامی اسلوب اختیار کرنے اور عیش و عشرت سے زندگی گزارنے کے خواہاں تھے جبکہ اسلام کے ابتدائی ایام میں ـــــ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ [1] کے عہد میں ـــــ مخلصانہ خدمت اور معصومانہ دیانتداری تھی وہاں اب بدی، بدعنوانی اور مطلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز بتاتا ہے کہ جب نسل انسانی کو اپنے نمائندوں کے خلوص پر اعتماد نہ رہا تو اسلام بھی زوال پذیر ہونے لگا۔

قرآن حکیم کے احکام نظر انداز کر کے یہ چھوٹے چھوٹے فرماں روا اپنی رعایا پر محصولات کا کمر توڑ بوجھ ڈالنے لگے۔ بوجھ اتنا ناقابلِ برداشت ہو گیا کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے کوئی تین سو سال کے بعد بارہ ہزار سے زائد افراد پر مشتمل بنوحبیب نام کے ایک عربی قبیلے نے عیسائیت کا انتخاب کیا اور اٹھ کر رومن سلطنت میں چلے گئے۔

اس میں ذرا بھی تعجب نہیں کہ ان حالات میں اسلام اپنی قوت کھو بیٹھا اور تباہی کے گڑھے میں گر گیا۔ اگر مسلمانوں نے صرف قرآنِ پاک کے احکام پر عمل کیا ہوتا تو عروج و کمال کا ردِ عمل کبھی نہ ہوتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد کیا، "علم ـــــ عبادت سے افضل ہے" اور اگر احکام قرآنی نظر انداز نہ کیے جاتے تو آج مسلمان دنیا کی پسماندہ ترین اور جاہل ترین اقوام میں سے نہ ہوتے۔

عظیم مسلمان مفکر و مصلح سید جمال الدین افغانی نے بڑی دانشمندی اور سوجھ بوجھ سے ملت اسلامیہ کے ناکامی کے اسباب کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک بہت بڑے اجتماع میں کسی نے پوچھا ـــــ

---

[1] حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دیانتداری کی مثال کے لیے ضمیمہ دیکھیے۔

"مسلمانوں کے انحطاط و زوال کی بڑی وجہ کیا ہے؟"

اس کے جواب میں سید جمال الدین افغانی نے کہا ——

"ترکِ مذہب"

پھر سائل نے دوسرے سوال کے جواب پر اصرار کیا

"عیسائیت کے عروج و کمال کی بڑی وجہ کیا ہے؟"

پھر سید جمال الدین افغانی نے کہا

"ترکِ مذہب"

بھرا جلسہ یہ جواب سن کر دنگ رہ گیا۔ لوگ پوچھنے لگے کہ ترکِ مذہب سے دو مختلف اور ایک دوسرے کے برعکس نتائج کیونکر برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس پر مصلح اعظم نے یہ تشریح کی ——

"اسلام ترقی کا مذہب ہے۔ پس جب مسلمان اپنا مذہب ترک کر دیتے ہیں تو ترقی کرنے سے معذور رہ جاتے ہیں۔ رہی عیسائیت کی بات، سو یہ صرف ایک دینی اور روحانی نظام ہے جو زندگی کا دنیاوی و مادی پہلو نظر انداز کر دیتا ہے۔ انجیل چھوڑ کر عیسائی طاقت حاصل کرنے اور مادی ترقی کرنے کے قابل ہو گئے لیکن مسلمانوں نے قرآن پاک کو چھوڑ کر زوال اور انحطاط کا سامان پیدا کیا۔"

مسلمان مبلغوں کا جذبۂ اسلامی اسلام کے آغاز سے آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ روئے زمین پر اس کی روشنی بالکل بجھ گئی ہو۔ اکثر یوں ہوا کہ دنیا کے ایک حصے میں یہ ہمیشہ کے لیے معدوم نظر آیا تو دوسرے حصے میں نہایت آب و تاب سے جگمگا اٹھا۔ لاریب قرونِ اولیٰ میں اسلام کو پوری طرح پاکیزہ رکھنے میں ایشیا اور افریقہ میں جان نثار مبلغوں نے جو کوشش کی وہ کسی دوسرے مسلمان نے نہیں کی۔ اسی قسم کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج انڈونیشیا اسلام کا گڑھ ہے جو مختلف نسلوں کے معاشرے میں ایسی رواداری اور بردباری کا مظاہرہ کرتا ہے جس کے لیے قرآن پاک نے پابند کیا ہے۔ جب نامور سیاح مارکو پولو ۱۲۹۲ء میں انڈونیشیا آیا تو ابھی ہندوستان

سے جو نیا مذہب آیا تھا اس کی نسبت اس نے کہا، "تیزی سے جزیروں پر چھا رہا ہے۔" آج انڈونیشیا کا نام پاکستان [1] کے بعد لیتے ہیں جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے۔

فلپائن بھی اسلام کی احیائی قوت کی واضح ترین شہادت پیش کرتا ہے فلپائن میں اسلام کسی فاتح لشکر کی بدولت نہیں پھیلا بلکہ یہ مٹھی بھر امن پسند مسلمان مبلغوں کا کرشمہ ہے۔ یہ سولہویں صدی کی بات ہے جب ہسپانیہ کے حکمران لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ تاریخ کے ایسے نازک وقت میں جبکہ مسلمانوں کو ہسپانیہ میں سے نکالا جا رہا تھا اور بحیرۂ روم کے تمام ممالک میں اسلام کی طاقت کو زوال آ چکا تھا، دنیا کے دوسرے حصوں میں مسلمان مبلغ بڑی بے باکی سے اللہ کے پیغام کی اشاعت کر رہے اور ہولناک مخالفت کے باوجود زبردست کامیابی حاصل کر رہے تھے۔ آج یہاں کے تیرہ لاکھ سے زائد باشندے مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں۔ یہ اسلام کی حقیقتاً شاندار فتح ہے۔

افریقہ میں بھی اسلام مستقل طور پر اسی جذبے اور ولولے سے پھیل رہا ہے۔ جو قرونِ اولیٰ میں عرب اور شام میں اشاعتِ اسلام کی خصوصیت تھا۔ افریقہ کے لوگ وہی مذہب قبول کر رہے ہیں جو انھیں آدمی اور خدا کی نظر میں سچی مساوات عطا کرتا ہے۔

لاگوس، مغربی افریقہ کے ایک مسیحی اخبار کی ۸ فروری ۱۹۵۶ء کی اشاعت کے بموجب نائیجیریا میں عیسائیت کی نسبت اسلام دس گنا پھیل رہا ہے۔

وسطی افریقہ کی بابت سر ولفرید بلنٹ نے "اسلام کے مستقبل" [2] میں لکھا ہے۔

"وہ دن دور نہیں جب وسطی افریقہ کا شمار اسلام کے ورثے میں کیا جائے گا۔"

مشرقی افریقہ میں اسلام نے جو کامیابی حاصل کی ہے بوس ورتھ اسمتھ نے موثر ترین انداز سے اس کا حال لکھا ہے اور طویل حوالے کے لائق ہے۔

مشرقی افریقہ میں اشاعتِ اسلام — یوں ورتھ اسمتھ لکھتا ہے ——

---

[1] دسمبر ۱۹۷۱ سے پہلے پاکستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست تھی۔ موجودہ بنگلہ دیش (سابقہ مشرقی پاکستان) پاکستان کا حصہ تھا۔ (ادارہ)

[2] THE FUTURE OF ISLAM

"چودھویں صدی کی صبح طلوع ہونے تک اسلامی تہذیب وتمدن کے قلعے مشرقی افریقہ کے سرسبز وشاداب ساحل کے ہرے گدے پر تابدار موتیوں کی تسبیح کے مانند پڑے تھے۔ ان کے ہاٹ سوداگروں اور بحری مسافروں سے معمور رہتے۔ کارواں ہاتھی دانت، گرم مصالے، گوند اور صوفیلان کی کانوں کے سونے کی تجارت کرتے۔ یار بروسہ نے اسلامی تہذیب کے عہدِ کمال میں مشرقی افریقہ کی پھلتی پھولتی ہوئی بندرگاہوں کا جو حال بیان کیا ہے وہ اس زبردست تجارتی و صنعتی خوشحالی، اعلیٰ معیارِ حیات اور خانگی تعلیم کا کافی ثبوت ہے جو اسلامی تہذیب وتمدن کی جلو میں مشرقی افریقہ میں بروئے کار آئی۔ یہ شاندار شہر سوداگروں کے ہاٹ سے زیادہ اہمیت ومعنویت رکھتے۔ یہ فنون کے گہوارے بن گئے تھے۔ ان کے ایوانوں کے دیوان (اسمبلی ہال) میں علم وادب کو قابلِ فخر مقام حاصل تھا۔ مال گودام کی دولت سے آدمی کی حیثیت کا اندازہ تو لگایا جاسکتا لیکن یہاں تو بطور شاعر، فقیہ اور عالمِ دین اس کے ذہنی مال خانے کی دولت کے باعث اسے وہ شہرت، احترام اور عزت ملتی جسے حشمت کہتے۔ ایرانی عرب آبادکار پورے تاریک افریقہ میں شعور پیدا کرنے کے لیے علم سیکھنے کا ہنر لائے۔

مشرقی افریقہ میں اور واقعتہً ہر کہیں اسلامی تہذیب کا ہمیشہ ایک سب سے بڑا وصف رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ بلا امتیاز تمام لوگوں کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ ذوقِ اظہار پیدا کریں، اپنا مافی الضمیر ظاہر کریں، اپنے گلہائے فکر اور روح میں لپٹے ہوئے خزانے عیاں کریں۔ پھر آزادیٔ تقریر صرف شعری رجحان تک بھی محدود نہ تھی جس نے اس ساحل پر بڑی زوردار اور دلفریب رومانی اور رزمیہ نظم تخلیق کی ـــــ مذہبی اور تبلیغی شاہکاروں کو وجود بخشا۔ اس سلسلے میں پاکبازی اور روح وقلب کے محسوس کیے ہوئے ایمان نے تحریک دی۔ سفر کے دوران سلاطین اور غلاموں کی یکساں طور پر حوصلہ افزائی کی جاتی کہ سب کے سامنے اپنے نظریات پیش کریں۔ ان حقوق کا ذکر سنیں جن کی بابت

فرماں روا محسوس کرتا کہ اس کی ملت کا حق ہے اور ایسی غلطیاں علانیہ ترک کریں جن کا وہ شکار سمجھے جاتے۔ اس عہد کی رواداری بڑی شدت سے لوگوں کی حریت اور جمہوریت کی اسپرٹ، نئے وطن کی محبت، ظلم و تشدد کے خلاف ان کی نفرت اور ہر مزاحمت کے باوجود آزادی برقرار رکھنے کے عزم کی عکاسی کرتی ہے۔

ذہنی آزادی اور آزادی تقریر کا یہ شدید جذبہ پورے مشرقی افریقہ میں اسلامی تہذیب کا گراں مایہ حقِ خصوصی رہا ہے۔ لیکن افسوس اسلام نے تہذیب اور جمہوریت کا جو شاندار ایوان تعمیر کیا تھا مغربی تہذیب کے پیروکاروں ـــــ حملہ آور پرتگیزوں نے اسے مشرقی افریقہ میں کھنڈر کر دیا۔ ممباسہ میں سب سے زیادہ دولت کی ریل پیل تھی۔ اپنی تہذیب سمیت پانچ بار یہاں کے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا پھر غلام بنا لیا گیا۔

لیکن اسلامی تہذیب کی اسپرٹ اور حیات افروز قوت اسی قدر دوامی اور برقرار رہنے والی تھی کہ ققنس [1] کی مانند بار بار اپنی جلتی ہوئی راکھ سے اُبھرتی رہی اور پامال ہوتی رہی۔ شیوخ کو تہ تیغ کیا گیا۔ آگ، تلوار، ظلم و ستم اور قتل و غارت سے فن اور تجارت کی وہ عالیشان عمارت جو مسلمانوں نے صدیوں میں اس جرأت و بے باکی، یقین اور فخر سے بنائی تھی حقیقتاً پامال کر دی گئی۔ اسلام کو آزمائش میں ڈال دیا گیا۔

پرتگیزوں کا دو سو سالہ عہدِ ظلم و ہیبت خواب پریشان کی طرح گزر گیا اور ۱۶۸۹ شمسی میں اسلام پھر ابھرا۔ تباہ شدہ شہروں کی خاکستر سے نئے شہر نمودار ہوئے۔ سوداگروں، بحر نوردوں اور ساحلی تاجروں نے پھر عمان، ایران، ہند اور عرب سے پرانی آمد و رفت کا احیاء کیا اور یورپ کی تجارت پر نظریں جمائیں

---

[1] ایک خیالی پرندہ جس کے بارے میں یہ کہا جاتا کہ دیپک راگ الاپتا ہے جس سے اسے آگ لگ جاتی ہے اس آگ سے جل کر خاک ہو جاتا ہے اور پھر جب اس خاک پر مینہ پڑتا ہے تو اس میں دوبارہ جان پڑ جاتی ہے۔ یوں ققنس اپنی ہی خاک سے دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ (مترجم)

جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ نئی آزادی کی اسپرٹ نے آدمی کی روح میں متحرک کیں اور عظیم ادبی احیاء میں اپنی صدا سنی۔ جوش و ولولہ اور شوق کی لہر نے اسلام میں جان ڈالی اور اسے متحرک کیا۔ اس کے نتیجے میں حمزیہ جیسے شاندار کارنامے بروئے کار آئے۔"

آج ماتگانیکا کے ہر شہر اور قصبے میں مسلمان پھر بیدار [illegible] گئے ہیں۔

ہم افریقہ میں اسلام کی کامرانی میں افکار کے ذریعے فتح کا وہی انداز اور قتل و غارت کے باوجود اس کی وہی بقاء دیکھتے ہیں جو تاریخِ اسلام کے دوسرے پہلوؤں کی خصوصیت ہے۔

محولہ بالا بیان پڑھنے کے بعد کون اس بات پر سنجیدگی سے شبہ کر سکتا ہے کہ ققنس کی مانند اس میں دوبارہ جی اٹھنے کی قوت اور ناقابلِ شکست سکت موجود نہیں؟

اسلام کے مستقبل کا دارومدار ہر مسلمان پر ہے

پھر مستقبل کا کیا بنے گا؟ دینِ متین کے کامیاب اِحیاء، اس کی عظیم روحانی بیداری اور نئی عالمی قیادت کی نسبت کیا کیا امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں؟

مستقبل کی کامیابیوں کی ذمہ داری انفرادی طور پر ہر مسلمان کے شانوں پر ہے۔ اسلام کی رو سے ہر آدمی اپنے فعل میں آزاد ہے۔ برے بھلے تمام اعمال کی ذمہ داری بالآخر آدمی پر عائد ہوتی ہے۔

قرآنِ پاک میں آیا ہے ——

"اللہ تعالیٰ تب تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود (اپنے اعمال اور کردار کے ذریعے) اپنی حالت نہ بدلے۔ اللہ کسی قوم سے اپنا دستِ کرم نہیں کھینچتا اور اس کی حالت نہیں بدلتا (جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے)۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ صرف نیک کاموں میں کسی قوم کی مدد کرتا ہے ایک دوسری جگہ قرآنِ پاک میں کہا گیا ہے ——

"آدمی کو ایسی کوئی شے نہیں ملے گی جس کے لیے وہ کوشش نہیں کرے گا۔"

اور پھر ——

”پھر ہم زمین پر تمھیں دوسروں کا جانشین بنائیں گے تاکہ ہم تمھارا عمل دیکھ سکیں۔“

پس آج مسلمان سے کیسے عمل کی توقع رکھی جاسکتی ہے؟ اس کا جواب صاف اور سیدھا ہے۔ وہ قرآن پاک کے احکام کے مطابق عمل کرے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام کے شاعرِ اعظم اقبال نے ملی اجتماع کے لیے ”قرآن سے رجوع کرو“ کا نعرہ لگایا۔

”قرآن سے رجوع کرو!

جدید طرزِ زندگی کے لیے ترقی پسند ضابطہ اقبال سے بڑھ کر کسی کو علم نہیں کہ کس افسردہ دلی سے اسلام کے سچے مثالی نظریات نظر انداز کیے گئے ہیں اور مستقبل کے لیے مسلمانوں کی تمام امیدیں دینِ متین پر سچا ایمان لانے میں مضمر ہیں۔

علامہ موصوف یوں رقمطراز ہیں ——

”صرف اسلام ہی نئی دنیا تخلیق کرسکتا ہے۔ ایشیا کبھی اطاعت نہیں کرسکتا کسی ایسے نظام کی جو کاملاً سیاسی ہو اور جس نے آدمی کو لوٹ کھوسٹ کی شے سمجھا ہو“ جیسا کہ سوویٹ روس میں ہو رہا ہے“ نہ ہی یہ کبھی ”جدید مغربی سرمایہ داری نظام کو اس کی غیر منظم انفرادیت پسندی سمیت سمجھ سکتا ہے۔“

اقبال نے اسلام میں ایسا نظام دیکھا جو مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا اور جس نے بہ عجلت فرد کی قدر و منزلت کا بھی اعتراف کیا اور اللہ کی خدمت کے لیے خود میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی بھی تاکید کی۔

”یہ دینِ متین ایک ایسی نئی دنیا کی تخلیق کرسکتا ہے جس میں آدمی کے معاشرتی مرتبے کا تعین اس کی قومیت اس کے رنگ یا روپے کی اس مقدار سے نہیں کیا جاتا جو وہ کما لیتا ہے۔ اس کا تعین تو اس کی طرزِ زندگی سے ہوتا ہے —— جہاں مفلس دولت مندوں پر محصول لگاتے ہیں، جہاں انسانی معاشرہ شکمی عدل کی اساس پر نہیں بلکہ روحانی مساوات پر قائم کیا جاتا ہے،

جہاں ایک اچھوت دختر شاہ سے بیاہ کر سکتا ہے، جہاں نجی ملکیت ایک امانت ہے اور سرمائے کو اس حد تک اکٹھا ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ دولت کے اصل پیدا کاروں پر مسلط ہو جائے۔''

اس سیاق وسباق میں ''قرآن سے رجوع کرو!'' کا نعرہ شاید ہی رجعت پسندانہ سمجھا جاسکے۔ خلاف ازیں وہ واحد راستہ جس پر مسلمان آگے بڑھ سکتے اور ترقی کر سکتے ہیں خدا کا راستہ ہے۔ اس راستے پر وہ صرف اسی صورت میں چل سکتے ہیں کہ وہ اپنے تئیں ان قوانین وضوابط سے رجوع کریں جو قرآنِ پاک میں موجود ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے اکثر نوجوان ترقی کے لیے اس قدر بے تاب ہیں کہ صرف لفظ ''لوٹنے'' (رجوع کرنے) کے تذکرے سے لرز اٹھتے ہیں۔ وہ تو اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ چلتے رہیں خواہ انھیں منزل کا علم ہو نہ راستے اور سمت کا۔ تاہم اگر وہ صرف اتنی دیر کے لیے رک تھم جائیں کہ سوچ سکیں، اتنی مدت میں اپنی یادداشتیں تازہ کر سکیں اور اسلام کے احکام پھر سے دریافت اور ازسرِ نو ان کی قدر و منزلت معلوم کر لیں تب یقیناً وہ اندازہ لگا سکیں گے کہ ''قرآن سے رجوع کرو!'' ہی نئی طرز زندگی کا سب سے زیادہ ترقی پسند فارمولا ہے۔

دنیا میں ایسے کوئی آثار نہیں پائے جاتے جن سے پتا چلے کہ مغربی تہذیب نے اسلام سے بہتر ضابطہ اخلاق وضع کیا ہو۔ یہ انسانی اخوت یا نسلِ انسانی کی عالمگیر اخوت کے تخیل کو عملی طور پر پیش کرنے کے قابل نہیں ہوا جیسا کہ اسلام نے اپنا نظریۂ ''امت'' پیش کیا۔ مغربی دنیا غیر طبقاتی انسانی معاشرے والا ایسا معاشرتی نظام معرضِ وجود میں لانے سے قاصر رہی ہے جس میں تمام جھگڑوں، مفادات کے تصادمات، تنازعوں اور لڑائیوں کو موثر طور پر کم یا ختم کیا جاسکتا تاہم آج سے کوئی تیرہ سو سال پہلے اسلام نے ایسا معاشرتی نظام پیش کیا تھا۔ مغرب کا کلچر اس قابل نہیں ہوا کہ جس طرح اسلام نے کیا۔ اسی طرح یہ بھی تمام بنی نوعِ آدم کے لیے مساوات کا حق حاصل کرتا۔ ان تمام پہلوؤں سے مغرب کی نئی تہذیب تمام مخلوق خدا کو عالمی مشترکہ ملت کے پیرائے میں مربوط کرنے میں ناکام رہی ہے۔ درحقیقت اس نے خلاف ازیں ایک طرف تو شدید حسد، حریفانہ کشمکش، علیحدگی پسندی کے رجحانات، قومیت

پرستی کے تند جذبات، طبقاتی اور نسلی برتری کے احساس کو ہوا دی اور دوسری طرف احساسِ کمتری پیدا کیا۔ بہ الفاظِ دیگر مغرب کی نام نہاد تہذیب کے کارنامے اسلام کے لائحہ عمل سے کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ پھر اس نظریے اور اس قول کا جواز کہاں پایا جاتا ہے کہ اسلام فرسودہ ہو چکا ہے۔ مغرب کی اقوام نے علوم وفنون میں زبردست ترقی کی ہے لیکن اس ترقی نے انھیں امن وسکون نہیں بخشا۔ مستقبل کی جانب بہ اشتیاق دیکھنے کی بجائے تباہ کن جنگ کا ہولناک بھوت مستقلاً اہلِ مغرب کے سر پر سوار رہتا ہے۔ صرف اسلام بنی نوع آدم کو امن دے سکتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہوا ہے ـــــــ

"انسان کی تباہی و بربادی خود آدمی کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے نہ کہ بدبختی کا۔"

انسان کو جو فائدے حاصل ہوتے ہیں وہ بھی یکساں طور پر افراد اور اقوام کے اس عزم و استقلال کا نتیجہ ہوتے ہیں جو اچھی زندگی بسر کرنے کے لیے پایا جاتا ہے۔ اگر آئندہ جنگوں سے بچنا ہو تو آدمی کو اپنے نفس کی اصلاح کرنی پڑے گی۔ اسلام ایسے محرکات اور ضابطۂ کار فراہم کرتا ہے جس سے ایسی اصلاح ممکن ہو جاتی ہے۔

اسلام بنی نوع انسان کو ربانی اقتدارِ اعلیٰ اور ربوبیّت کا تصور پیش کرتا ہے جس کے سامنے وہ جوابدہ ہو۔ جس سے جائز صلے کی توقع کی جا سکے۔

اسلام ہر شخص کے وقار اور اس کے لئے برابری کا دعویدار ہے۔ اسے قومیت پرستی کے تخیل سے نفرت ہے کہ آج یہی عالمی کھچاؤ کا بڑا سرچشمہ ہے۔ یہ نسلی تفرقوں پر اظہارِ افسوس کرتا اور ان کی بجائے ایک عالمگیر برادری کا پرچار کرتا ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ـــــــ

"نسلِ آدم کامل طور پر اللہ کا کنبہ ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ اللہ کے سچے بندے بنو اور آپس میں بھائی بھائی بن کے رہو۔"

"اللہ کے بندے بنو!" یہ وہ پیغام ہے جو اسلام کی بنیاد ہے لیکن اس کا مطلب بندگی اور اطاعت ہے۔ ضبطِ نفس اور مسلسل جدوجہد کی زندگی ہے۔ اسلام جادو کی چھڑی نہیں جسے ہلایا جائے تو دنیا آنکھ جھپکتے میں کامل ہو جائے گی۔ یہ تو ایک باضابطہ، باقاعدہ، ترقی پسند نظام ہے۔ جو خواہش رکھتے ہوں وہ آسانی سے اس پر چل سکتے ہیں بشرطیکہ قرآن پاک اور حدیث نبوی کی

نصیحت و ہدایت قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔

مدت ہوئی، ایک مسلمان سفیر کو شہنشاہِ ایران کے دربار میں بھیجا گیا تا کہ اُسے اطاعت کے لیے کہے۔ اس پر شہنشاہِ ایران نے چلاّ کر کہا، ''تم کون ہوتے ہو میری سلطنت پر حملہ کرنے والے۔ تم تو تمام اقوام میں سب سے زیادہ مفلس، سب سے زیادہ غیر متحد اور سب سے بڑھ کر جاہل ہو۔'' سفیر نے جواب دیا ——

''تم نے جو کچھ کہا کبھی وہ سچ تھا۔ عرب چوپایوں کے بالوں سے تیار کیا ہوا لباس پہنتے، چھپکلیاں ان کی خوراک تھی۔ اپنی معصوم بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے۔ مُردوں کو کھا لیتے اور گرم گرم خون پیتے۔ عزیزوں کو قتل کر ڈالتے اور چوری کے مال پر فخر کرتے —— ہم نیک و بد کی تمیز نہ کر سکتے۔ نہ یہ بتا سکتے کہ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے۔ ہم لڑتے جھگڑتے رہتے۔ خون خرابہ، چوری چکاری، لوٹ مار، شراب خوری، عورتوں سے دغا بازی، جھوٹ یہ سب کچھ ہماری زندگی کی عظیم ترین متاع تھا۔ لیکن تعلیماتِ اسلامی اور نبی اکرمؐ کی ہدایات کی بدولت ہم یہ تمام بدعادات ترک کر چکے ہیں۔ اللہ نے اپنی کمال مہربانی سے ہماری طرف رسول پاکؐ کو بھیجا جس نے ہمیں مقدس کتاب دی، زندگی گزارنے کا صرف ایک راستہ بتایا اور ہماری زندگیوں کی کایا پلٹ دی۔''

جرمن مؤرخ ڈیوش اس مقدس کتاب کے بارے میں لکھتا ہے ——

''قرآن وہ کتاب ہے جس کی مدد سے عرب یورپ میں بادشاہ بن کر آئے تا کہ نسلِ آدم کو روشنی دکھائیں جبکہ گردو پیش اندھیرا چھایا ہوا تھا۔''

قرآنِ پاک بدلا نہیں۔ یہی وہ کتاب ہے جس کی بدولت آج کے مسلمان ایک بار پھر بنی نوع انسان کو روشنی دکھا سکتے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں سے تنہا اسلام تمام انسانوں کو امید دلاتا ہے۔ مسلمان نوجوان اپنے اعلیٰ ورثے پر بجا طور سے فخر اور یہ جان کر خود کو طاقتور محسوس کر سکتے ہیں۔ کہ اسلامی جاہ و جلال کے سچے کارنامے پائیدار اور دائمی ہیں۔ انہیں مستقبل کا مقابلہ بہ اطمینان نہیں بلکہ ولولہ انگیز عزم و استقلال سے کرنا چاہیئے۔

●

قرونِ اُولیٰ میں دیانتداری کی دو مثالیں

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ بے حد دیانتدار تھے اور اس بات کی سخت کوشش کرتے کہ اپنی کمترین ضرورتوں کے علاوہ مرکزی بیت المال سے کچھ نہ لیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایک موقع پر ان کی اہلیہ محترمہ نے انھیں مٹھائی خریدنے کو کہا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ان کے پاس روپیہ نہیں۔ اس پر وہ بولیں: "آپ اجازت دیں تو میں یومیہ وظیفے میں سے کچھ رقم بچاؤں اور الگ رکھ لوں۔" انھوں نے اجازت دے دی۔ چند دن کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ نے تھوڑی سی رقم بچالی اور مٹھائی لانے کے لیے شوہر کے حوالے کی۔ خلیفہ اعظم کی یہ بات سن کر وہ حیران و پریشان ہو کر رہ گئیں کہ روپیہ بچانے کے قابل ہونے سے ایک یہ حقیقت عیاں ہے ——— کہ وہ اپنی کم از کم ضرورتوں کے لیے زائد وظیفہ حاصل کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے جھٹ روپیہ بیت المال کو لوٹا دیا۔ اس کے بعد وظیفے کی اتنی رقم وصول کی جو بچائے ہوئے روپے کو منہا کرنے سے بنتی تھی۔

مؤرخ گبن حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بڑا مداح ہے۔ ان کے بارے میں لکھتا ہے ———

"تاریخ میں خلیفۂ اوّل امیر المومنین حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ کر حیرت خیز، جان نثار، مخلص اور سادگی پسند شخص بہت کم ملیں گے۔ انہوں نے خدائی لشکر کے نام جو فرمان جاری کیا وہ یوں رقم ہوا ———

''عادل رہو کیونکہ غلط کار کبھی نہیں پنپتا۔ جری رہو، مرجاؤ لیکن شکست مت کھاؤ۔ ترس کھاؤ۔ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل مت کرو! پھل والے درخت اور اناج برباد نہ کرو! جانوروں کو ہلاک نہ کرو! دشمن سے بھی وعدہ کرو تو اس کا پاس کرو! جو لوگ ترکِ دنیا کر چکے ہوں انہیں ضرر نہ پہنچاؤ۔''

خدائی لشکر جو بے روک ٹوک رواں دواں رہا اس فرمان کا نمایاں ثبوت ہے جو لائق احترام سربراہ نے بہ خلوص جاری فرمایا اور پاکباز پیروکاروں نے جس پر سختی سے عمل کیا۔

یہ بھی مرقوم ہے کہ ایک روز حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی صاحبزادی اور رسولِ اکرم ﷺ کی بیوی حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ انھوں نے بیت المال سے کتنا روپیہ لیا ہے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ انھوں (حضرت ابوبکر صدیقؓ) نے اپنے عہدِ خلافت میں صرف چھ ہزار درہم (تقریباً چودہ سو روپیہ) وصول کیے ہیں۔ اس پر خلیفۂ اوّل نے حکم دیا کہ ان کے پاس زمین کا جو صرف ایک ہی ٹکڑا رہ گیا ہے اسے فوراً بیچ کر بیت المال میں روپیہ جمع کروا دیا جائے۔ ''اور کیا ہے میری ملکیت میں؟'' انہوں نے بیٹی سے پوچھا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جواب دیا: ''ایک حبشی غلام ہے جو گھر کے کاموں کے علاوہ مجاہدین اسلام کی تلواریں صیقل کرتا ہے۔ ایک اونٹ پانی لانے کو ہے۔ کپڑے کا صرف ایک ٹکڑا ہے جو خلیفہ نے اپنے مشاہرے میں سے بچائی ہوئی رقم سے خریدا ہے۔''

اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی صاحبزادی سے فرمایا کہ ان کی وفات کے بعد یہ چند چیزیں خلیفۂ ثانی کی تحویل میں دے دی جائیں۔ جب یہ چیزیں ان کے جانشین حضرت عمرؓ کے سامنے لائی گئیں تو وہ انہیں دیکھ کر رو پڑے اور چلا کر بولے: ''اے ابوبکرؓ! تم نے واقعی اپنے جانشین کا کام دشوار بنا دیا ہے۔''

حضرت عمرؓ نے خود کو یکساں طور پر پرہیز گار اور قابلِ قدر حاکم ثابت کر دکھایا۔ ان سے متعلق ایک روایت ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اولین خلفاء نے اس اسپرٹ میں بھاری ذمہ داریاں قبول کیں۔ ایک دن چند عرب مشائخ نے حضرت عمرؓ کو شدید اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے دیکھا۔ جب پوچھا گیا، کیا معاملہ ہے تو وہ بولے: ''بیت المال کا ایک اونٹ

بھاگ گیا ہے۔" عرب بولے، "لاریب اس اونٹ کو تلاش کرنے کے لیے آپ کے پاس کئی غلام ہیں۔" اس پر حضرت عمرؓ نے غضب ناک ہو کر کہا، "مجھ سے بڑھ کر لوگوں کا غلام کون ہے؟"

حضرت عمرؓ انسانیت کا عظیم جذبہ رکھنے والے آدمی تھے۔ ایک دن وہ تیزی سے منبر پر چڑھے اور فرمانے لگے ——

"ایک وقت تھا جب میں مفلس ومحتاج تھا اور عام بہشتی کی طرح پانی بھر بھر کر گزارے کے لائق دام اکٹھے کر لیتا تھا۔"

پھر وہ ایک دم منبر سے نیچے اُتر آئے تا کہ سامعین کے اس سوال کا جواب دیں کہ انھوں نے یوں تیز تیز خطاب کیوں کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا جواب یہ تھا ——

"مجھ میں کچھ غرور آ گیا تھا۔ پس میں نے سمجھا کہ اپنے ماضی کی حالت زار بیان کروں تا کہ میرا غرور دور ہو جائے۔"

ایک اور خلیفۂ اسلام جو کئی سال بعد گزرے ہیں لیکن جنھوں نے قرون اولیٰ کے خلفاء کے مثالی کرداروں پر عمل کیا وہ عُمر بن عبدالعزیز تھے۔ اگر چہ ان کی سلطنت بحر اوقیانوس کے ساحلوں سے پامیر کی سطح مرتفع تک پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ عجز وانکسار اور دیانتداری کی اس مثال کو کبھی نہ بھولے جو اولین خلفائے اسلام نے قائم کی۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب وہ اپنے نجی حجرے میں سرکاری دستاویزوں کا مطالعہ کر رہے تھے تو انھی کی طرح ان کی پرہیزگار اہلیہ محترمہ جنابہ فاطمہ جو خلیفہ عبدالملک کی صاحبزادی تھیں ان سے نجی باتیں کرنے آئیں۔ خلیفہ وقت نے ان سے کہا کہ فوراً سرکاری چراغ کی جگہ گھر کا چراغ رکھا جائے تا کہ سرکاری روشنی نجی گفتگو میں صرف نہ ہو۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر کی طرح خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے بھی سادہ زندگی بسر کی اور بڑے محتاط رہے۔ انھوں نے اپنی ساری دولت بیت المال میں جمع کروادی اور ضرورت کے لائق روپیہ لیا۔ ایک دن کنبے کے ایک رکن نے انھیں خمیدہ سر اور افسردہ دیکھا۔ اس حالت کا سبب پوچھنے پر جواب ملا: "تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا یہ میرے لیے شدید پریشانی کی بات نہیں کہ مجھے اتنی بڑی سلطنت کی خوشحالی اور بھلائی کا کام سونپا گیا ہے؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اگر میں ہر حاجت مند کی حاجت روانہ کروں تو اپنے فرض کی ادائی میں ناکام رہوں گا؟"

ایک اور موقعے پر ان کی بیوی فاطمہؒ نے انہیں نماز کے بعد روتے پایا۔ پوچھنے پر انہوں نے جواب دیا: ''اے فاطمہؒ! مجھے مسلموں اور غیر مسلموں کی بھاری تعداد پر حکمران کیا گیا ہے۔ میں اپنی سلطنت میں مفلسوں، بھوکوں، ننگوں، بیماروں، مصیبت زدوں، تباہ حالوں، مظلوموں، مجروحوں، اسیر اجنبیوں، قابلِ احترام بزرگوں، تھوڑی آمدنی اور بڑا کنبہ رکھنے والوں اور ایسے ہی لوگوں کا خیال کرتا رہا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنے لوگوں کی بھلائی کے لیے جو کام کیے ہیں روزِ محشر اللہ مجھ سے ان کا حساب مانگے گا۔ ڈرتا ہوں کہ اللہ کو ٹھیک ٹھیک حساب دینے میں ناکام رہوں گا۔''

سچی اسلامی ریاست میں بدعنوانی اور ظلم وستم کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ لاریب رہبرانِ ملت اپنے عاجز لوگوں کی خدمت یہ جانتے ہوئے پرہیزگاری اور سخاوت سے کریں گے کہ اللہ کی نظر میں سب لوگ برابر پیدا کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاندار نظیر قائم کی تھی۔

پیغمبرِ اسلام اہلِ مغرب کی نظر میں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈاکٹر گستاف ویل سے بڑھ کر زریں الفاظ میں کسی نے خراجِ تحسین پیش نہیں کیا۔ موصوف کے الفاظ درج ذیل ہیں ـــــــ

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لوگوں کے سامنے تابناک مثال پیش کی۔ ان کا کردار پاکیزہ اور بے داغ تھا۔ ان کا مکان، لباس اور کھانا پینا سادگی کا کمیاب نمونہ تھا۔ وہ اس قدر بے ریا تھے کہ وہ اپنے اصحاب سے خاص احترام چاہتے نہ اپنے غلام سے ایسا کام لیتے جو وہ خود کر سکتے۔ لوگ اکثر انھیں ہاٹ سے کھانے پینے کی چیزیں خریدتے دیکھتے۔ اکثر انھیں اپنے حجرے میں بیٹھے کپڑوں کی مرمت کرتے یا صحن میں بکری کا دودھ دوہتے دیکھتے۔ ہر وقت ہر ایک کو ان تک رسائی حاصل ہوتی۔ وہ بیماروں کی تیمارداری کرنے جاتے اور ان کا دل ہر ایک کے لئے ہمدردی کے جذبے سے لبریز ہوتا جس طرح ان کی سخاوت اور فیض بے پایاں تھا اسی طرح اپنی قوم کی بہبود کے لیے ان کی بے قراری بے پایاں تھی۔ باوجودیکہ ان کے لیے ہر طرف سے بے شمار تحائف چلے آتے ان میں سے ایک بھی نہ بچتا اور یہ سب کے سب بیت المال کا اثاثہ سمجھے جاتے .... اور محمدؐ بطور آدمی انسانیت

کا مینار بن کر ایستادہ ہیں اور لافانی قوت سے مستحکم ہیں۔"

امریکی مصنف واشنگٹن ارونگ کے ریمارکس یہ ہیں ــــــ

"ان کی تمام درخشندہ کامیابیاں جن میں وہ تاباں ترین فتوحات شامل ہیں جو انھوں نے اپنی زندگی میں پائیں اس میں کسی قسم کی نخوت یا کھوکھلی شان وشوکت نہ پیدا کر سکی جیسی کہ خودغرضانہ مقاصد کی موجودگی میں پیدا ہوئیں۔"

فرانسیسی شاعر لامارتین نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا ــــــ

"ان تمام پیمانوں کے پیشِ نظر جن کے ذریعے انسانی عظمت پائی جا سکتی ہے ہم پوچھ سکتے ہیں ــــــ کیا اس سے بڑا کوئی آدمی ہے؟ بلاشبہ محمدؐ وہ بڑا آدمی ہے جس کے بغیر دنیا نامکمل لگے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی اور آنے والے ہر زمانے میں بھی محمدؐ انسانیت کی سب سے اونچی چوٹی کے مثیل ہوگا۔"

یہ تابناک خراج پیش کرتے ہوئے لامارتین کے ذہن میں قرآن پاک کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔

"اور آپ (محمد ﷺ) کردار کی عظیم رفعت پر پہنچے ہیں۔" (سورۃ ۶۸، آیت کریمہ ۴)

اور قرآنِ پاک میں یہ بھی آیا ــــــ

"بے شک تم میں اللہ کے پیغمبر اس کے لیے نیک نمونہ ہے جو اللہ اور روزِ آخر کی توقع رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرے۔" (سورۃ ۳۳، آیت کریمہ ۲۱)

بوسورتھ اسمتھ دوسرے عظیم انگریز عالموں کی طرح نبی اکرم ﷺ کا پرجوش مداح تھا جس کی نسبت اس نے یہ لکھا ہے ــــــ

"چرواہے کے طور پر شامی تاجر کے روپ میں، غارِ حرا کی تنہائیوں میں بطور مصلح تنہا ایک کی اقلیت میں، مدینہ کی ہجرت میں، ایک مسلمہ فاتح

کے طور پر، خسرو ایران اور یونانی ہرقل کی برابری میں الغرض ہر حال اور ہر رنگ میں زبردست اکائی پاتے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ کوئی دوسرا آدمی جس کے خارجی حالات اتنے بدل گئے ہوں، ان حالات کا مقابلہ کرنے کی غرض سے اتنا کم بدلا ہو۔ واقعات وحادثات بدل جاتے ہیں لیکن ان سب میں روح وہی رہتی ہے اس حیرت خیز ذہنی کیفیت کی بڑی وجہ کیا تھی؟ یہ طبِ دماغی کے باقاعدہ علم کی بجائے اللہ کی ذات پر اعتقاد رکھنے کے باعث تھا۔ تاریخ میں مرقوم ہے کہ کس طرح اسلام کے اس ان پڑھ بانی نے امن اور ترقی کی سمت کتنے ہی انسانوں اور کتنی ہی قوموں کی رہنمائی کی اور ان کی قسمت بدلی۔ اس کی تعلیمات اور اس کا نمونۂ حیات تاحشر قائم رہے گا نیز ترقی، مسرت اور امن کی راہ پر چلنے کے لیے ابھارتا رہے گا ــــــ بنی نوعِ انسان کے لیے یہ ہدایت بھی رہے گی اور رحمت بھی۔''

فرانسیسی عمرانیات دان موسیو لیبان نے نبیٔ اکرم ﷺ کی نسبت کہا ــــــ

''ہمارے علم کی رو سے محمدؐ ہی عظیم ترین انقلابی قائد ہے۔ اس نے پوری انسانی تاریخ پر ایسا نشان چھوڑا ہے جسے کوئی شخص اس کے بعد مٹا نہ سکا۔ بلاشبہ وہ انسانی تاریخ کے دوراہے پر نمودار ہوا اور پھر اس نے انسانی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔''

ہندو راہنما گاندھی کو بھی پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ذات کے بارے میں یہ کہنا پڑا ــــــ

''وہ ایک عظیم پیغمبرؐ تھا۔ بے باک تھا اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرتا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے کہا کچھ ہو اور کیا کچھ ہو۔ اس نے وہی کیا جو محسوس کیا۔ یہ ان کی زبردست سادگی، انؐ کا اپنی ہستی کو (خدا کی راہ میں) مٹانا، اپنے معاہدوں کی سختی سے پابندی، اپنے دوستوں اور پیروکاروں سے غضب کی لگن تھی اور ان کی بے باکی تھی نیز خدا کی ذات اور اپنے کام پر یقین کامل تھا نہ کہ تلوار تھی جو ہر کامیابی ان کے سامنے لائی اور انھوں نے ہر رکاوٹ دور کی۔''

اسلام کا اثر ہندو سماج پر ہیول اپنی تالیف ''آریائی راج ہندوستان'' میں کہتا ہے کہ مسلمانوں کے عمرانی وسیاسی مسلک کا ہندوؤں کی زندگی پر دوہرا اثر پڑا۔ اس نے ذات پات کی تمیز کی شدت دور کی اور اس کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر ابھارا۔ اس نے شودر کو مردِ آزاد کیا اور مخفی طور پر اسے برہمن کا آقا بنا دیا۔ یورپ کی تحریک احیائے علوم وفنون کی مانند اس نے ذہانت کے دریاؤں میں حرکت پیدا کی، کتنے ہی طاقت ور لوگ پیدا کیے اور ان میں سے بعض تو نمایاں تخلیقی صلاحیت رکھتے اور اس نوع کی نسلِ انسانی پیدا کی جس کا دل مسرت سے لبریز تھا۔

مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے

(تاریخِ عالم کے درخشاں ترین باب سے چند حوالے)

Plz call me.

[redacted]

why are you
night footer

تالیف : مولوی نور احمد

ترجمہ و تحشیہ : رحمان مذنب

رحمان مذنب ادبی ٹرسٹ، لاہور